''چہارسُو''

...... تِلکَ الایّام ......

ادب زندگی کی ہرعبارت جب عبادت بن جاتی ہے توباہن (BOBBIN) کے دریچوں سے داخل ہونے والے حرُوف، باطنی دُنیامیں طواف کرنے لگتے ہیں۔نُورالحسنین کے ناول ''تِلکَ الایّام'' میں ایک ایسا تداوُل دکھائی دیتا ہے جوخوابیدہ نگاہوں کے نام فَتیلہ لکھ جاتا ہے۔اردوناول کی ارتقائی صُورت کے نقش گرنُورالحسنین کی عبقریت اوربصری قُوت کسی بھی موضوع کوکائناتی ویژن دینے میں کامیاب رہی ہے۔ان کے ناول میں تہذیب، تاریخ اورسیاست کی تریوینی کومحسوس کیاجاسکتا ہے۔نورالحسنین کے ناول کوپڑھ کرمیری بصیرت آسمان کی وسعتوں میں کچھ تلاش کرنے لگتی ہے۔حسنین کا داستان رنگ ناول ''تِلکَ الایّام''،ادراک کی سرحدوں کوتوڑکرایک نئے جہان تخّیل کوآبادکرتا ہے۔روحانی اوررومانی تموج کے جھلمل جھلمل اِشباع میں خارجی انتشاراوراضطراب سے کہیں زیادہ تہذیبی لہریں،فصل گُل کے لئے زمینیں ہموارکرتی نظرآتی ہیں۔تہذیب کے الگ الگ دھاروں کویکجا کرنے کا متمنی یہ ناول نگارقدیم وجدید کامرکب ہے۔نور+الحسنین کامزاج کلاسیکی روایت،روحانیت اوررومانیت کے امتزاج سے تشکیل پایاہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انتزاع زمین کاعکس باربارابھرتا ہے۔قحط الرجال کے اس عہد میں حسنین راگ،ناول پسند قارئین کے دلوں پردستک دینے میں کامیاب ہے۔زندگی کے قوس قزح رنگ کامحاصرہ اورمحاسبہ کرنے والا یہ ناول برسوں یادرکھاجائے گا۔ ......خُورشیدحیات

...... اجازت ......

ممکن ہے کہ بعض پاکستانیوں کوگلزارکاپورانام سردارسمپورن سنگھ کالرانہ آتاہومگرفلمی دنیااورشاعری میں جھنڈے گاڑنے سے پہلے زیادہ ترپاکستانی مداحوں کوگلزاراس لئے پسند تھا کہ وہ اپنے ''بابا'' احمدندیم قاسمی کے پاس بہت انکسارسے آتاتھااورخاص طورپران کی علالت کے دوران میں،دوسرے جہلم کے پاس دینہ ایک مردم خیزپراسرارخطہ ہے جوگلزارکی جنم بھومی ہے اس سے پہلے ہم اسے ضمیرجعفری اوراپنے بزرگ دوست ڈاکٹر انورنسیم کے حوالے سے جانتے تھےاوروہ بھارت اورپاکستان کے مابین دوستی اورامن کے سفیرتھے پھروہ سینکٹروں لاکھوں نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے اورساتھ ہی ساتھ کئی ڈرامہ نگاروں اورگیت نگاروں کی امیدوں کامرکزبن گئے۔اس کے بعد پتہ چلا کہ اب فلموں کے ہدایتکاراورفلم سازبھی بن گئے پھر ہماری جامعات میں تھیسس لکھنے کے آرزومندوں کے جم غفیرنے اوران کے نگرانوں کی بے محنت مزدیابی کی آرزونےگلزارکی غائبانہ یانیم حاضرانہ بیعت کرلی۔ان کی فلم ''اجازت'' کامنظرنامہ اس کتاب میں ہے جوبہت سے لیکھکوں کی تربیت کرسکتا ہے کہ رس،کسک اورغنائیت کاسرچشمہ کہاں ہے پھرآج کل روایتی ایم اے اردووغیرہ کامستقبل ہمارے ایچ ای سی یاپنجاب ایچ ای ایس کے کورذوق سربراہوں کے سبب مخدوش ہے اس لئے سمجھ دار سربراہان شعبہ اردوخودڈاکومینٹریاں بنارہے ہیں یایوٹیوب چینل چلارہے ہیں اوربیوی بچوں کے لئےبھی دیدہ زیب اداکاربننے کی مشق کررہے ہیں اورادبی سیمیناروں میں آرٹ کریٹک یافن کے پارکھ کےطورپرسامنے آرہے ہیں اسلئے اجازت فلم کے منظرنامے سےدوگنی ضخامت کاایک دانش ورانہ مکالمہ شامل کتاب ہے۔یہ کتاب سنگ میل لاہورنےاپنی مطبوعات کی شہرت کےعین مطابق بہت خوب صورتی کےساتھ چھاپی ہے۔ ......انوارشریف

...... اردولسانیات کےعصری مباحث ......

پروفیسرغازی علم الدین کی تحقیقی بصیرت،اہل دانش وبینش کے لیے قابل صد تحسین ہے۔انہوں نے زبان وادب کےمتعددمستوروکم بیں گوشوں کی نشان دہی بطریق احسن کی ہے۔ان کا شمارہمارے عہد کےمحنتی اور جانفشاں دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔پروفیسرغازی علم الدین کی علمی وتحقیقی اپروچ کی بدولت کئی تشنگانِ علم وادب کی رہنمائی ہوئی ہے۔وہ جس بھی موضوع پرقلم اٹھاتے ہیں اس کی گہرائی وگیرائی ان کی گرفت میں رہتی ہے۔ ہماری ملی اورقومی ثقافت سے ان کی گہری دلچسپی ہے۔انہوں نے بطورپاکستانی،اپنی ثقافتی شناخت کی بازیافت کے لیے چنداہم مقالے سپردقلم کیے ہیں۔پاکستان کی مذہبی اورمابعدالطبیعیاتی بنیادوں کی تفہیم وتوضیح ان کامرغوب موضوع رہاہے۔اردوزبان پاکستانی قوم کی شناخت کاایک اہم مرکز ہے۔ اس کےتناظرمیں ان کےعلمی وتحقیقی کارناموں کی ستائش ہوتی رہتی ہے۔ ...... ڈاکٹرسعادت سعید

اشاعت:۲۰۲۲ء، قیمت:۱۰۰۰روپے، دستیابی:مثال پبلشرز،امین پوربازار،فیصل آباد

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۲، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۲۳ء

بانی مدیر اعلیٰ
سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل
گلزار جاوید

مدیرانِ معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق
عروب شاہد
آمنہ علی

مجلسِ مشاورت

قارئینِ چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔
فون: (+92)-51-8730633-8730433
موبائل: (+92)-336-0558618
ای۔میل: chaharsu@gmail.com

http://chaharsu.wordpress.com

۔ متاعِ چہارسو ۔

سرِ ورق، پسِ ورق ۔۔۔۔۔۔۔ شعیب حیدر زیدی
تزئین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز ۵

بیداری کے بعد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد انعام الحق ۶
براہِ راست ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گلزار جاوید ۷
خوشبو کے معنی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عطیہ سکندر علی ۱۶
دید مسلسل کا نیا بیانیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شافع قدوائی ۲۱
تخلیقی شاعری کے روشن دستخط ۔۔۔۔۔۔ رونق شہری ۲۴
طلسمِ کائنات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رفیع رضا ۲۷
ہمارے عہد کے ایک اہم شاعر ۔۔۔ ہریہ درشی ٹھاکر ۳۲
سلسلۂ یادِ رفتگاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نسیمِ سحر ۳۳
سالہا رفت بداں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اجمل سعید ۳۵
بابِ سخن کھلا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نوید سروش ۳۸
شاعری میں ہجر و وصال ۔۔۔۔۔۔ ارشاد خان سکندر ۴۲
حسیں رخ پہ نقاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پرویز ساحر ۴۳
صحرا میں نقشِ پا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فاری شا ۴۵

رنگ باتیں کریں

عکسی منظر نامہ ۵۰

بادشاہِ عجم

ڈاکٹر رؤف خیر، انجم جاوید ۵۲

افسانے

ہیلن جارج گرین ۔۔۔۔۔۔۔ شہناز خانم عابدی ۵۳
بن بلایا مہمان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عارف نقوی ۵۵
جینا اسی کا نام ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رعنا کوثر ۵۷
ہم کہ ٹھہرے اجنبی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فرخندہ شمیم ۵۹
آوازیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ارم رحمٰن ۶۰

فروغِ بزمِ امکاں

مولانا عبدالمجید سالک، ولی عالم شاہین، رؤف خیر، صابر ظفر، ساگر تریاٹھی، قیصر نجفی، خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر مسعود جعفری، نوید سروش۔ ۶۳

افسانے

نیکی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تابش خانزادہ ۶۸
گونگا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ افتخار بلوچ ۶۹
ڈمی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جبیں نازاں ۷۳
الف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عطاالرحمٰن خاکی ۷۵
صیّاد کا معاہدہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رمّانہ تبسم ۷۷

بدن کی آبیاری ۷۹

احمد سوز، گلزیب زیبا، رئیس صدیقی، تبسم انوار، مرید باقر انصاری، فرحانہ عنبر، سہیلہ انعام صدیق، سبھاش گپتا، شہاب الدین شہاب، نوید ظفر کیانی، شاہ حسین نہری، شہزاد بیگ، فرخندہ شمیم، احمد نثار، مادھو کوشک۔

ناول

خاکِ شفا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پیرزادہ آلِ انوار ۸۴

خاکہ

خاک پوش ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پروفیسر ابن کنول ۹۴

اُفق کے اُس پار

موت برحق مگر پہلے عشق ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ظفر قریشی ۹۸

میزانِ عدل

احمد فراز، عبداللہ جاوید، ستیہ پال آنند، ولی عالم شاہین، فیصل عظیم، بشارت حسین وقار، خان حسنین عاقب، فیض منصور فیض، رینو بہل۔

آئینۂ فن

مشرف ذوقی کا کلامیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نادیہ عنبر ۱۱۰

نشانِ راہ

ادھورا پن مکمل ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پروین شیر ۱۱۱

ایک صدی کا قصہ

سلیل چودھری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وجیہہ الوقار ۱۱۸

قرطاسِ اعزاز

راجیش ریڈی

کے نام

آئینہ نظر

تب بھی ہوتا تھا اب بھی ہوتا ہے
کتنا کچھ بے سبب بھی ہوتا ہے

دے تو سکتا ہوں زندگی کو جواب
لیکن اک لفظ ادب بھی ہوتا ہے

اس نے وعدہ کیا اور آ بھی گیا
کبھی ایسا غضب بھی ہوتا ہے؟

اس کی موجودگی کا یوں ہے کہ وہ
جب نہیں ہوتا تب بھی ہوتا ہے

پھیر لیتا ہے آئینہ نظریں
سامنا مجھ سے جب بھی ہوتا ہے

شعر پڑھتا ہوں جب بھی محفل میں
سننے والوں میں رب بھی ہوتا ہے

راجیش ریڈی

''بیداری کے بعد''

محمد انعام الحق ○●○ اسلام آباد

نام: راجیش ریڈی
پیدائش: 22 جولائی 1952، ناگپور (مہاراشٹر) انڈیا
تعلیم: ایم اے (ہندی ادب)
راجستھان یونیورسٹی، جے پور

مجموعاتِ غزل

۱۔ اڑان
۲۔ آسمان سے آگے
۳۔ وجود
۴۔ سمندر بند ملتا ہے

اردو کے تمام معروف اور ممتاز ادبی رسائل میں غزلیں باقاعدگی سے شائع ہورہی ہیں۔

ملک اور بیرون ملک مختلف مقامات پر، پروقار مشاعروں میں شرکت۔

ہندوستان کی نمائندگی کرنے والے بین الاقوامی مشاعروں اور سمپوزیم میں شرکت کے لیے برطانیہ کے مختلف شہروں کا سفر کیا۔ I.C.C.R کی طرف سے سپانسر۔

بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت کے لیے دیگر ممالک کا دورہ کیا:

ریاستہائے متحدہ امریکہ (9 شہر)
کینیڈا (2 شہر)
دبئی
ابوظہبی
بحرین
ماریشس
عمان
کویت

غزل کے البمز:

غزلیں تمام معروف غزل گلوکاروں کے کئی مقبول غزل البمز میں شامل ہیں جیسے:

جگجیت سنگھ
پنکج ادھاس
بھوپندر سنگھ
طلعت عزیز
راج کمار رضوی
چھایا گنگولی

میوزک کمپوزر:

عظیم مرزا غالب کی منتخب غزلوں کے لیے موسیقی مرتب کی۔
وینس ریکارڈز کمپنی کے ذریعہ ''غالب'' کے عنوان سے البم جاری کیا گیا۔

سنت شاعر کبیر کی شاعری کے لیے موسیقی مرتب کی۔
مہاکوی جے دیو کی 'گیت گووند' کے لیے موسیقی مرتب کی۔
سٹیشن ڈائریکٹر کے طور پر ریٹائر ہوئے،
ویودھ بھارتی سروس،
آل انڈیا ریڈیو، ممبئی

مولانے

لاہور میں ایک موقع پر مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے درمیان کسی بات پر شکر رنجی پیدا ہو گئی۔ اگلے دن مولانا فیض الحسن، محمد حسین آزاد کے گھر کے پاس سے گزرے تو زور سے کھنکارا اور دروازے پر تھوک دیا۔ دوسرے دن بھی یہی واقعہ ہوا اور تیسرے دن بھی۔ جب آزاد سمجھ گئے کہ یہ حرکت دانستہ کی جارہی ہے تو ایک دن عین وقت پر دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے اور مولانا فیض الحسن ابھی کھنکارنے والے ہی تھے کہ آزاد بول اٹھے:

''ارے میں تو تھوکتا بھی نہیں''

○

براہِ راست

اردو زبان کا جب جب، جہاں جہاں ذکر آتا ہے، ایک طبقہ لفظ سیکولر پر خصوصیت کے ساتھ توجہ مبذول کراتا ہے، ہمارے خیال میں سیکولر کے بجائے وسیع المشرب زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔

قصہ پرانا تو ہے نہیں، بات فقط تین صدیوں پر محیط ہے مگران تین صدیوں میں اردو کی قلغی میں جس قدر پھندنے، سلمیٰ ستارے اور چاند ٹانکے گئے ہیں، اس کا سہرا عرب اور عجم کے ساتھ برصغیر کے کشمیر سے لے کر راس کماری تک پھیلے ہوئے مردم خیز اور مردم شناس خطہ کے وسیع المشرب، وسیع النظر اور وسیع البیاں لوگوں کی محبت، مروّت اور یکتائی کا ثمر ہے۔

یہ محل نام گنوانے اور شمار کرنے کا قطعی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کے ایک بے لوث عاشق اور خدمت گار جناب راجیش ریڈی کے فن اور شخصیت بلکہ کمالات کے اعتراف کا ہے۔

آیئے! قید و بند کی ہر آلائش سے سَوا ہو کر ایک سچے عاشق اردو جناب راجیش ریڈی کا کھلی بانہوں سے استقبال کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کے لیے ٹھنڈی، میٹھی اور فرحت آمیز ہوا کا ایک اور در بچہ وَا کر دیجئے!!!

.....گلزار جاوید

☆ گفتگو کا آغاز جے پور سے کیجیے اور اس طور کیجیے کہ ایامِ طفلی وعنفوانِ شباب ہمکتے، کدکتے دکھائی دیں؟

☆☆ میرے شعری سفر کی شروعات جے پور سے ہوئی! ویسے ہمارا خاندان حیدر آباد (دکن) سے تعلق رکھتا ہے لیکن میں وہاں کبھی نہیں رہا! میری پیدائش ناگپور (مہاراشٹر) میں ہوئی جو کہ میرا ننیہال تھا! اس وقت ہمارے والد صاحب ناگ پور میں سرکاری ملازم تھے۔ وہ گیت غزل گاتے تھے اور ریڈیو سنگر بھی تھے جو اس زمانے میں بڑی بات ہوا کرتی تھی۔

پھر ہوا یوں کہ والد صاحب کے ڈپارٹمنٹ کے ایک پورے سیکشن کا تبادلہ جے پور کر دیا گیا! سو اس طرح بہت ہی کچی عمر میں میں جے پور آ گیا۔ جے پور میں ہماری رہائش شہر کی مشہور ترین سڑک مرزا اسماعیل روڈ پر پی این ٹی کالونی میں رہی۔ یہ کالونی کیا تھی ایک طرح سے Mini India ہی تھی۔ اس میں طرح طرح کی زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے بہت پیار سے مل جل کر ایک Family کی طرح رہتے تھے! وہاں شرما جی تھے تو صدیقی صاحب بھی تھے، امر سنگھ صاحب تھے تو ڈیوڈ انکل بھی تھے، غرض یہ کہ ہندی، اردو، پنجابی سندھی، گجراتی، مراٹھی، بنگلہ بولنے والے اپنی اپنی Cultural richness کے ساتھ موجود تھے۔

خاصے دلچسپ رنگا رنگ ماحول میں بچپن گزرا یہی بچپن کی شرارتوں کے ساتھ الگ الگ Activities میں شرکت بھی ہوتی رہی۔ کھیل کود کے علاوہ اپنی بال منڈلی کے ساتھ گانا بجانا، ناٹک کھیلنا ان سبھی میں Active حصہ داری رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے تخلیقی سفر کا آغاز یہاں ہو چکا تھا۔

میری پہچان کی بنیاد ضرور اِس کالونی میں پڑی لیکن اس کو ایک شکل دینے کا پورا کریڈٹ میرے والد صاحب شیش نارائن ریڈی مرحوم کو جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا وہ ناگپور میں گیت، غزل گاتے تھے اور ریڈیو سنگر تھے۔ جے پور آنے کے بعد انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک تنظیم قائم کی۔ ''Rajasthan Tarun Kalaakaar Parshad'' جو آگے چل کر Shruti Mandal بنی۔

یہ تنظیم سال میں تین چار بڑے کلاسیکل میوزک کنسرٹ منعقد کرتی تھی جن میں اُس زمانے کے سبھی بڑے استاد، گرو شرکت کرتے تھے۔ استاد بسم اللہ خان، پنڈت روی شنکر، استاد ولایت خاں، کمار گندھرو، پنڈت بھیم سین جوشی، استاد امجد علی خاں، ڈاگر برادرس، پنڈت جسراج، ہری پرشاد چورسیا، شیو کمار شرما، استاد اللہ رکھا خاں، گرجا دیوی، ایسے کتنے ہی عظیم فن کاروں کو ہم نے نہ صرف دیکھا، سنا بلکہ اُن شخصیتوں کے ساتھ اٹھے بیٹھے بھی۔

تو موسیقی یوں میری رگوں میں اترتی چلی گئی۔ اس لئے میں تھوڑا بہت گنگنا لیتا ہوں، گا لیتا ہوں، دُھنیں بھی بنا لیتا ہوں لیکن موسیقی کی وراثت کے باوجود میں اپنے خاندان میں واحد شخص ہوں جو شاعری کی طرف ملطفت ہوا۔

☆ اردو زبان و ادب سے آپ کی آشنائی کب اور کس طور ہوئی اور اُس کی زلفیں سنوارنے کا ہنر آپ کی دسترس میں کیونکر آیا؟

☆☆ جب جوانی میں قدم رکھا تو سنگیت کی محفلوں کے ساتھ مشاعرں، کوی سمیلنوں میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ویسے گریجویشن کے زمانے سے ہی میں گیت لکھنے اور اسٹیج پر پڑھنے لگا تھا۔ مشاعروں میں ان دنوں اُس زمانے کے دِگج شعرا شرکت کرتے تھے۔ فراق گورکھپوری، غلام ربانی تاباں، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، کیف بھوپالی، شہر یار، ندا فاضلی، بشیر بدر، محمد علوی اِن لوگوں کو اسٹیج پر سن کر اور بعد میں رسالوں اور کتابوں میں پڑھ کر غزل کا جادو سر پر سوار ہوتا چلا گیا۔

ہم عمر نو جوان شعرا، ادیبوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا اور غزل کی باریکیوں پر بات چیت کرنے کا دور شروع ہوا اور ایک دن غزل کا یہ جادو شوق سے جنون میں تبدیل ہو گیا۔ مولوی اقبال احمد صاحب سے باقاعدہ اردو رسم الخط سیکھا،

سمجھا، اردو رسالوں میں چھپنا شروع ہوا۔
پہلے میں نے غزل کو اپنایا اور اب لگتا ہے کہ غزل نے مجھے اپنا لیا ہے۔

☆

ایسا لگا کہ جیسے دنیا ہی باندھ لی
کچھ اس ادا سے اُس نے زلفوں کے بال باندھے

اوّل محترمہ مذکور سے تعارف کا اشتیاق دوئم زلف اور بال کے فرق سے آگاہی لازم ہے؟

☆☆ آپ نے زلف اور بال کے فرق کی بات پوچھی ہے۔ تو اسکا جواب مرزا رفیع سودا کا یہ شعر ہے:

جب یار نے اٹھا کر زلفوں کے بال بندھے
تب میں نے اپنے دل میں لاکھوں خیال بندھے

☆ اردو شاعری کی بنیاد قافیہ اور ردیف پر قائم ہے، آپ کا رجحان اس سے مختلف بتلایا جاتا ہے؟

☆☆ اس کے جواب میں مجھے یہی کہنا ہے کہ اردو شاعری کا تو نہیں لیکن غزل کا جو نظام ہے وہ قافیہ ردیف اور بحر پر ہی قائم ہے تو اس لئے اس سے الگ رجحان ہونے کا کوئی مطلب بنتا ہی نہیں۔ آپ کو اسی ردیف قافیہ اور بحر میں کام کرنا ہے اور یہ جو اس کا نظام ہے اس کو ہر ایک کو فالو کرنا ہی پڑتا ہے، اگر آپ غزل کہہ رہے ہیں تو!

تو اس لئے الگ رجحان ہونے کا کوئی کارن نہیں ہے کوئی بات بنتی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غزل صرف ردیف قافیہ اور بحر بن کر نہ رہ جائے اس میں شعریت ہو، اس میں کوئی بات ہو، اور ردیف، قافیہ اور بحر کچھ بات کہنے کے اور شعر کہنے کا ایک بہانہ ہو، ایک ذریعہ ہو۔

اکثر یہ بھی دیکھا جاتا ہے زیادہ تر غزلوں میں یہ سب چیزیں ہوتی ہیں، ردیف ہے قافیہ ہے اور بحر ہے لیکن شعر غائب ہے۔ غزل میں جانے کتنے شعر ہو جاتے ہیں لیکن غزل پوری ہو گئی اور شعر ایک بھی نہیں۔ اگر آپ اس طرح سے بات کر رہے ہیں تو بالکل صحیح ہے لیکن جتنے بھی قابل ذکر شعراء ہوئے ہیں، اساتذہ ہوئے ہیں آج بھی لکھنے والے ہیں اور آنے والے زمانے میں بھی شعر انھیں کے شعر کہلائیں گے جو ان پابندیوں کو مانتے ہوئے ان پابندیوں میں رہتے ہوئے اپنی بات کہیں اور یہ پابندیاں الگ سے نظر نہ آئیں۔ تو یہ آرٹ کا فن کا کمال ہوتا ہے کہ سُر گم سنگر کے یا گلوکار میں الگ سے نظر نہ آئے وہ اس گانے میں اس طرح سے گھلی ملی ہو کہ اس کا رس ااس کا مزہ، اس کا آنند ان کے گانے میں نظر آئے وہ صرف سُر گم نہ ہو یعنی کہ ٹیکنالیٹیز ہی کافی نہیں ہے غزل میں، اس کے ساتھ اس کا اسٹرکچر ہی کافی نہیں ہے اس کے ساتھ اسٹرکچر ایک بہانہ ہے اور آپ کو کچھ کہنا ہے تو اسٹرکچر میں موجود رہ کر، اس کی سیماؤں میں رہ کر آپ اپنا کام کریں۔ تو اس لئے وہ رجحان الگ ہونے کا سوال نہیں اٹھتا۔ ہاں یہ ہے کہ اسی رجحان کے لئے شاعری نہیں ہو رہی ہے یہ ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعہ سے کچھ کہنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور شاید کہیں کہیں کچھ بات بن بھی جاتی ہے!

☆ ''وہ اتنی آسانی سے، آسان زبان میں شعر کہنے پر قادر ہیں کہ شعر کی تفسیر و محاسن کی ضرورت نہیں پڑتی'' رائے مذکور کو آپ کی خوبی سے تعبیر کیا جائے یا سادگی سے؟

☆☆ جہاں تک میری شاعری کی زبان کی آسانی کا سوال ہے تو اس کا سیدھا سادھا جواب تو یہی ہے کہ مجھے مشکل زبان آتی ہی نہیں لیکن سنجیدگی سے ادبی لحاظ سے بات کریں تو میری شاعری کا جو انداز ہے یا کہنے کا جو اسٹائل ہے اس کی بنیاد شاید میرے گیتوں میں ہی پڑ چکی تھی آپ سے میں نے پہلے عرض کیا کہ میری شروعات ہندی گیتوں سے ہوئی تھی اس کے بعد میں غزل کی طرف آیا اور میرے شروعاتی گیتوں میں ایک مکھڑا تھا:

زندگی کی بستی میں مشکلوں کا میلہ ہے
آدمی اکیلا تھا آدمی اکیلا ہے

یہ بات سن 76,75 کی ہے جو کہنے کا انداز تھا بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ میری غزل کی شاعری کی بنیاد بھی اسی مکھڑے یا اسی انداز میں پڑ چکی تھی اور جس کی طرف میں نے بعد میں رخ کیا اور یوں سمجھ لیجئے کہ یہ سفر جو ہے deliberately یا جان بوجھ کر آسان زبان میں کہنے کی کوشش نہیں ہے۔ وہ ادبی سفر کا جو آغاز تھا وہ کچھ اسی طرح سے ہوا تھا اور وہ اسی طرح سے جاری بھی ہے۔

اردو میں ہم جسے سہل ممتنع کہتے ہیں میری زیادہ تر غزلیں بلکہ بہت غزلیں اسی میں ہیں اور لوگ پسند بھی کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ ساری غزلیں سہل ممتنع ہی میں ہیں، بڑی بحروں میں لمبی بحروں میں بھی غزلیں ہیں۔ آج آپ جب شاعری کرتے ہیں غزل کہتے ہیں تو ہمیشہ ایک ہی بحر یا چھوٹی بحر میں شعر نہیں کہتے۔ تو یہ سفر کا سلسلہ ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ بہت غزلیں یا سہل ممتنع کی غزلیں میرے یہاں ہیں ,بہت ہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں اپنا استاد غالب کو مانتا ہوں اس ایک شاعر سے جتنا inspire میں ہوا ہوں جتنا میں سیکھتا ہوں اور سیکھتا رہوں گا وہ کسی اور سے میں نے نہیں سیکھا۔ اپنے آپ کو ان کا (eklavya) ایکلیو مانتا ہوں اور ان سے سیکھنا جاری ہے اور جاری رہے گا غالب صاحب کو مشکل زبان کا شاعر مانا جاتا ہے اور ان کو آسانی سے سمجھا نہیں جا سکتا یہ کہتے ہیں لوگ۔ لیکن وہی مشکل زبان کا شاعر, وہی سمجھ میں مشکل سے آنے والا شاعر اسی نے میرے خیال سے اردو شاعری کا سہل ممتنع کا سب سے بڑا شعر کہا۔ اور وہ شعر ہے:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اب اتنی بڑی بات کو اس سے زیادہ آسانی سے ممکن ہی نہیں ہے کہنا۔ یہ غالب ہی کہہ سکتے تھے۔ تو یہ سہل ممتنع کا جادو ہے۔ ان کی تو خیر بات ہی کیا لیکن جہاں تک میرا سوال ہے ہندی سے میری شروعات ہوئی اور اردو کی طرف بعد میں آیا۔ میں نے بعد میں اردو سیکھی پڑھی سمجھی اور ایک سفر پڑھ کر سن کر

جاری ہے تو جیسا کہ میں نے کہا کی وہ میری ادبی شخصیت اگر آپ کہیں تو اس کی جو زبان ہے جو کہنے کا انداز ہے وہ built -in ہے اس کے لئے میں نے کوئی کوشش نہیں کی۔اس کے لیے کوئی ایسا ارادہ نہیں کیا کہ مجھے اسی طرح سے شعر کہنا ہے یا اسی زبان میں شعر کہنا ہے جیسا میں نے عرض کیا کہ چھوٹی بحر کے علاوہ سہل ممتنع کے علاوہ بڑی بحروں میں بھی غزلیں ہیں اور کافی ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوئی خیال کے حساب سے بیان کرنے کے انداز کے حساب سے ضرورت کے حساب سے اردو کے فارسی کے گاڑھے الفاظ آئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اضافتیں میرے یہاں کم ہیں۔کم ہی نہیں بلکہ بہت کم ہیں۔تو اس کی وجہ یہ ہے کہ Musicality کہنے میں سادگی اپنے آپ میں رہی ہے اور شروع سے رہی ہے۔اس کے لئے کوشش نہیں کی ہے تو یہی ایک وجہ ہے کہ اس زبان کو جو میری شاعری کی زبان ہے اس کو آپ خوبی بھی کہہ سکتے ہیں اور سادگی بھی۔

☆ اکثر دیکھا، سنا اور برتا گیا ہے کہ وارداتِ قلبی کے زیر اثر سخن کی آنکھ وا ہوا کرتی ہے۔آپ کے ہاں معاملہ اس کے برعکس دکھائی دیتا ہے؟

☆☆ جی آپ نے بالکل صحیح نشاندہی کی ہے۔میری شاعری دل کا معاملہ نہیں ہے۔ میں دل لگنے یا دل ٹوٹنے کی وجہ سے شاعر نہیں بنا ہوں۔میں شاعر ہوں کیونکہ مجھے شاید شاعر ہی ہونا تھا۔یہاں لفظ ہونا کی بڑی اہمیت ہے یہ ہونا۔۔۔ہے جو طے کرتی ہے کہ آپ سے کیا کام لیا جائے۔آپ کی شناخت اگر ہو تو کیا ہو۔میرا ماننا بھی ہے اور تجربہ بھی کی کسی بھی فیلڈ میں آپ کی پہچان آپ کے ہونے اور کرنے کے توازن سے طے ہوتی ہے۔آپ کے ہونے میں پورا پورا دخل اس طاقت کا ہوتا ہے جسے دیکھا تو نہیں جا سکتا لیکن محسوس کیا جاتا ہے۔اور محسوس کرنا پوری طرح آپ کے اختیار میں ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔۔۔

غیب سے خیالوں کو آنا ہی ہوتا ہے۔ اور آپ جب اس خیال کو شعر کی شکل دیتے ہیں یہی شاعری ہے۔ اور یہی شاعری کی اور شاعر کی پہچان ہے۔ میں اپنے ساتھ غیب کی موجودگی کو برابر محسوس کرتا ہوں۔میں اپنے ہر شعر میں بلکہ شعر کے ہر مصرعے میں ایک ان دیکھے ہاتھ کا ساتھ محسوس کرتا ہوں۔یہاں تک کہ غزل کہنے کا وقت ہو یا کسی اچھے کلام کو پڑھ کر یا سن کر inspire ہونے کے بعد کہا گیا کوئی شعر یہ اندر سے اسپارک کے احساس کے بغیر کاغذ پر نہیں اترتا۔

☆ سماج کے وہ کون سے دُکھ ہیں جن میں آپ یا آپ کی شاعری کے ڈوبا ہونے کی نشان دہی کی جاتی ہے؟

☆☆ جہاں تک دکھوں کے احساس کا سوال ہے تو دکھ کہاں نہیں ہیں۔ ہر طرف دکھ ہی دکھ ہیں۔ان دکھوں میں کچھ کائناتی ہیں باقی سارے دکھ ذاتی ہیں۔ کائناتی دکھ تو گنے چنے ہیں بیماری بڑھاپا موت۔ باقی سب دکھ ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں۔اپنے آپ کو دیکھیں، آس پاس کو دیکھیں، سماج، دیش، دنیا۔۔۔سب جگہ دکھ پسرا ہوا ہے۔گوتم بدھ نے دکھ کو جیون کا سار کہا تھا۔تو ذاتی اور کائناتی دکھ اپنے آپ میری شاعری کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔میں انہیں ڈھونڈنے نہیں جاتا۔میری شاعری انہیں ذاتی اور کائناتی دکھ کا احساس ہے اور بیان ہے فن اور علم کے پیرائے میں۔

☆ راتوں کو جاگ کر گلیوں میں صدا لگانے اور لوگوں کے احساسات کو بیدار کرنے والی بات کو کس پس منظر میں جانچا اور پرکھا جائے؟

☆☆ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میری شاعری کا مرکز صرف اور صرف زندگی ہے، وہ زندگی جو ہم جی رہے ہیں، اپنے آس پاس، سماج میں، ملک میں اور دنیا میں ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں. اور جو کچھ بھی ہم جی رہے ہیں یا ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں وہ خوشگوار تو قطعی نہیں ہے، ایک عجیب سی افراتفری، گھبراہٹ اور دہشت چاروں طرف طاری ہے، ظاہر ہے یہ سب حالات اور منظر آپ کو اندر تک جھنجھوڑتے بھی ہیں، شعر میں بھی ڈھالتے ہیں:

مرے دل کے کسی کونے میں اک معصوم سا بچہ
بڑوں کی دیکھ کر دنیا بڑا ہونے سے ڈرتا ہے

یہ سارے شہر میں دہشت سی کیوں ہے
یقیناً کل کوئی تیوہار ہو گا

عمر بھر جن کو عقیدوں نے لڑائے رکھا
بعد مرنے کے وہ ایک ہی رب کے نکلے

گیتا ہوں ، قرآن ہوں میں
مجھ کو پڑھ انسان ہوں میں
جتنی بٹنی تھی بٹ چکی یہ زمیں
اب تو بس آسمان باقی ہے

سر قلم ہوں گے کل یہاں اُن کے
جن کے منھ میں زبان باقی ہے

دنیا کو ریشہ ریشہ اُدھیڑیں، رفو کریں
آ بیٹھ تھوڑی دیر ذرا گفتگو کریں

تو دنیا کو ریشہ ریشہ اُدھیڑنے اور رفو کرنے کے لئے کی گئی گفتگو ہی میری شاعری ہے، اس گفتگو کو آپ صدا لگانے والی یا احساسات کو بیدار کرنے والی گفتگو یا شاعری کہہ سکتے ہیں۔

☆ اُن خوابوں کی پردہ کشائی بھی ضروری ہے جن کے چکنا چور ہونے کا راز بھائی نوید سروش فاش کر رہے ہیں؟

☆☆ جہاں تک خوابوں کے چکنا چور ہونے کی بات ہے تو ہمارے خواب روز ہی چکنا چور ہو رہے ہیں۔اخبار پڑھیے یا ٹی وی دیکھئے تو دنیا روز بروز پہلے سے

زیادہ بدرنگ بدشکل ہوتی نظر آتی ہے

اب وہ دنیا عجیب لگتی ہے
جس میں امن و امان باقی ہے

تو ایک غیر محفوظ دنیا میں غیر محفوظ زندگی جینے کے لئے مجبور ہیں ہم لوگ۔اس کے علاوہ سماجی غیر برابری، مذہبی نفرتیں اور انسانیت کے لگاتار گرتے گراف نے وہ دنیا بننے سے پہلے اجاڑ کر رکھ دی ہے جس دنیا کے خواب ایک عام حساس انسان دیکھا کرتا ہے۔

☆ اُس فیصلے کی بابت بھی کچھ روشنی ڈالیے جس تک پہنچنے کی تگ و دو میں آپ خالد علیگ صاحب کی پیروی میں مصروف بتلائے جاتے ہیں؟

☆☆ آپ کے سوال کے جواب میں میرے پاس کچھ خاص کہنے کے لیے ہے نہیں بجز اپنے اس شعر کے:

یہ اور بات بچ کے گزرتے ہیں ہم سے لوگ
ورنہ دعا ، سلام ہماری تو سب سے ہے

☆ آج کی محفل میں اُن پامال موضوعات کی نشان دہی فرما دیجیے جن کو آپ نے حسّی سیّاق و سباق عطا کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کے نتائج کیا برآمد ہوئے؟

☆☆ موضوعات اور خیالات کا تو یوں ہے کی کسی طے شدہ اسکیم کے ذریعے نہ ہوا ہے اور نہ ہو رہا ہے۔ مجھے زندگی ہمیشہ سے ہی ایک عجیب و غریب پہیلی لگتی رہی ہے۔اس کی الجھنیں، پیچیدگیاں، باریکیاں مجھے لگاتار پریشان کرتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے اور یہ سب کیوں ہے۔ سوال سوال اور سوال۔ان سوالوں نے ہزاروں سالوں سے ہر چھوٹے بڑے سوچنے والے کو الجھائے رکھا ہے۔ غالب بھی اس طرح کے سوالات سے اکثر الجھتے نظر آتے ہیں۔کائناتی الجھنیں اپنی جگہ اور ذاتی پیچیدگیاں اپنی جگہ اور انسانی زندگی کے روزمرہ کے دکھ درد تو ہیں ہی۔

☆ اُن انوکھے طریقوں اور خیالات کی بابت آگاہی دیجیے جن کو بروئے کار لا کر، آپ اردو شاعری کا چمکتا ستارا بن گئے؟

☆☆ کوئی بھی موضوع یا خیال جب تک میرے احساس کا حصہ نہیں بنتا میں شعر نہیں کہتا ہوں۔

شام کو جس وقت خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں میں
مسکرا دیتے ہیں بچے اور مر جاتا ہوں میں
کسی دن زندگانی میں کرشمہ کیوں نہیں ہوتا
میں ہر دن جاگ تو جاتا ہوں زندہ کیوں نہیں ہوتا
سمجھ پاتے نہیں ہم بھی اشارے
خدا بھی کھل کے کچھ کہتا نہیں ہے

☆ نئے خیالات کو بندش والے الفاظ سے نکالنا بھی آپ کا وصف بتلایا گیا ہے۔اس کی وضاحت آپ ہی فرما سکتے ہیں؟

☆☆ جسے آپ نئے خیالات کو بندش والے الفاظ سے نکالنا کہتے ہیں اس کی وجہ میری اپنی سیما ہے۔ جسے آپ blessing in disguise۔۔۔کہہ سکتے ہیں مجھے بہت زیادہ گاڑھی زبان آتی نہیں۔روزمرہ کے خیالوں کو روزمرہ کی زبان میں ہی بیان کر دیتا ہوں یہی آتا ہے مجھے۔

☆ بلاشبہ آپ کی شاعری منفرد اسلوب کی حامل گردانی جاتی ہے مگر آپ کے مطلعوں کا ایک خاص مقام اور ذکر و فکر میں رہنا بحث کا طالب تو ہونا ہی چاہیے؟

☆☆ آپ نے میری غزلوں میں مطلعوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ ان کو اہمیت دی ہے، مجھے اس کے بارے میں یہی کہنا ہے کہ میری غزلوں کی اکثر شروعات غزل کا مطلع ہونے سے ہی ہوتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ پہلے شعر ہو گئے اور ان کے لئے مجھے مطلع کہنا پڑا ہو۔اکثر و بیشتر مطلع ہی پہلے ہوا ہے اور اس کے لئے میں یہی کہوں گا کہ اگر مطلع آپ کے من کے مطابق ہو جائے، ٹھیک ٹھاک ہو جائے، اچھا ہو جائے تو پوری غزل کا ایک ماحول، موڈ اور معیار بن جاتا ہے۔ میں شکر گزار ہوں اس غیب کا جہاں سے مضامین خیال میں آتے ہیں۔

۱۵۔ کوئی شخص یا تخلیق کار خاص مزاج اور خاص ذوق کا حامل تو ہو سکتا ہے مگر معاشرے کے تمام طبقوں کو محبوب گردانا سمجھ سے بالاتر ہے؟

☆☆ اب اس سوال کے جواب میں میں کیا کہوں، اپنی خوش قسمتی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔جیسا کہ آپ نے فرمایا ایک خاص ذوق اور مزاج کی شاعری اگر معاشرے کے تمام طبقوں کو اپنی سی لگتی ہے، پسند آتی ہے تو اس کے لئے خدا اور اپنے پڑھنے، سننے والوں کا شکر گزار ہی ہوا جا سکتا ہے۔

☆ وہ کون سی روایات تھیں جو رد کی گئیں۔ رد کرنے والے کون لوگ تھے۔اور آپ کا اُن روایات سے پرہیز کا سبب کیا ہے؟

☆☆ جہاں تک روایت سے پرہیز یا روایت کو رد کرنے کی بات ہے تو یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔کبھی کنٹینٹ کی شکل میں تو کبھی expression کے ذریعہ۔کبھی مضامین نئے تو کبھی بیان کرنے کا انداز نیا، تو یہ ہر دور میں رہا ہے۔ غالب ہی کا ایک شعر دیکھیں میں نے یہ شعر شاید پہلے بھی کوٹ کیا ہے:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اس کا پہلا مصرع بہت عام سا ہے جس کو ہر دور میں کوئی بھی شاعر کہہ سکتا تھا اور اُس دور میں بھی ان کے ہم عصروں نے جانے کتنے بار کہا ہوگا:

موت کا ایک دن معین ہے

لیکن جو دوسرا مصرع ہے وہ بالکل وہ ہے جو شاید آج کا شاعر کہہ سکتا ہے۔ آج کی زبان میں کہہ سکتا ہے

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔یہ expression غالب کے دور میں ان کے ہم عصروں میں دور دور تک نہیں ملتا۔تو غالب نے بھی expression کے ذریعہ ایک نیا پن اور روایت سے ایک دم آگے کی چیز بلکہ یوں کہیں کہ آج کا

شعر کہہ دیا ہے۔اور پوری بات بھی سمٹ کے آ گئی ہے اور دن و رات کا جو جادو انھوں نے پیدا کیا ہے، موت کا ڈر جو انھوں نے پیدا کیا ہے کمال ہے۔

اسی طرح بعد میں اگر دیکھیں تو فیض صاحب مجروح سلطان پوری، ان کی غزلوں میں بھی بالکل کلاسیکی زبان ہوتی ہوئے بھی انھوں نے روایتی انداز میں روایتی لفظیات میں بالکل نئے معانی پیدا کئے۔اور یہی بات احمد فراز صاحب کی شاعری کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے. اور اس کے علاوہ اگر ہم دیکھیں تو چاہے وہ ناصر کاظمی ہوں، شکیب جلالی ہوں، منیر نیازی ہوں، جون ایلیا ہوں، یہ سب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں شاعری کی۔ بندھے بندھائے انداز میں، روایتی انداز میں انھوں نے شعر نہیں کہے۔اور اسی لئے ان کی ایک خاص جگہ بنی، ایک خاص پہچان بنی، اور یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔اور جہاں تک آج کے دور کا سوال ہے تو آج کا دور تو وہ دور ہے کہ جس میں روایتی محبوبہ سے کام نہیں چلتا، روایتی محبوبہ ہے ہی نہیں آج کی شاعری میں، اگر ہے بھی تو اس نئے انداز میں۔آپ کو، روایتی مضامین نئے انداز میں پیش کرنے ہیں لوگ ،اور کامیاب بھی ہوتے ہیں، آج کی شاعری کی محبوبہ زندگی ہے، اور اب لگ بھگ سبھی جو غزل کے شاعر ہیں ان کے یہاں زندگی ہی محبوبہ کے طور پر دیکھ سکتے ہیں، اس کی اتھل پتھل، اس کے دکھ درد، اس کی الجھنیں یہ ساری چیزیں آپ کو آج کی شاعری میں ملیں گی۔آج کے دور کی شاعری زندگی کی شاعری ہے، تو روایت سے ہٹ کر بالکل الگ طرح کی شاعری ہے۔اس میں expression بھی نیا ہے کنٹینٹ بھی نئے۔اس لئے میں اپنے آپ کو کچھ الگ نہیں مانتا کہ میں نے کوئی روایت سے پرہیز کیا ہے یا روایت کو رد کیا ہے۔یہ آج کے دور کی جدوجہد ہے اس کا دباؤ ہے کہ ہمیں اسی طرح کے کنٹینٹ hont کرتے ہیں۔ہمیں پریشان کرتے ہیں۔انھیں کے آس پاس انھیں کو اپنے شعر میں ڈھالنا ہوتا ہے اور expression میں جو شاعر جتنا نیا پن لا سکے جتنی تازگی لا سکے جتنی freshness پیدا کر سکے تو وہ اس کا اپنا رنگ ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے میں نے بھی کوشش یہی کی ہے کہ کلاسیکی زبان بھلے نہ ہو روزمرہ کی زبان ہو لیکن کلاسیکی رچاؤ ضرور ہو شعر میں، میں کتنا کامیاب ہوں یہ آپ بہتر جانتے ہیں اور جہاں تک روایت سے پرہیز کرنے کا سوال ہے تو اس شاعری کو آپ روایت سے پرہیز کرنا کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔

☆ آپ کے ہاں فن کو التباس سے تشبیہ دی گئی ہے جبکہ قدوائی صاحب آپ ہی کے حوالے سے التباس کو حقیقت کی بدترین شکل گردان رہے ہیں؟

☆☆ ابھی میں تخلیق کی اُس معراج کو نہیں پہنچا کہ قدوائی صاحب کی رائے سے کسی قسم کے اختلاف کی جرأت کروں۔

☆ آپ کے لہجے کو جمالیات سے بھرپور گردانے والے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر آپ کو شاعرِ رومان تو نہیں گردان رہے؟

☆☆ میں کسی خاص ازم یا خاص اسکول آف thought کے تحت شعر نہیں کہتا۔میں نے کبھی یہ سوچ کر شعر نہیں کہا کہ آج مجھے رومانٹک شعر کہنا ہے یا ترقی پسند شاعری کرنی ہے۔میں عرض کر چکا ہوں کہ میری شاعری کا مرکزی مفہوم زندگی ہے۔میری محبوبہ شاعری میں زندگی ہے۔تو زندگی کے جو رنگ و روپ مجھے حیران کرتے ہیں پریشان کرتے ہیں وہی خیال بن کر شعر میں ڈھل جاتے ہیں۔جو انسانی ذات سماج، دیش اور دنیا کے حالات پریشان کرتے ہیں تو اس طرح کے شعر ہوتے ہیں جنھیں آپ ترقی پسند شاعری کے تحت رکھ سکتے ہیں۔جب زندگی دل کی نازک رگیں چھیڑتی ہے تو وہ شعر ہوتے ہیں جنھیں آپ رومانٹک شعر کہہ سکتے ہیں۔

☆ آپ کی شاعری کو بیدار، حقوق، اُڑان اور آنکھیں ملانے والی شاعری بتلا کر براہِ راست ترقی پسندی سے نتھی کیا جارہا ہے؟

☆☆ میری شاعری کا مرکزی مفہوم یا کردار زندگی ہے، زندگی ہی میری شاعری کی پہلی اور آخری شرط ہے۔وہی شعر میرے لئے شعر ہے جن میں زندگی کی دھڑکن سنائی دے، زندگی بول رہی ہو، زندگی گنگنا رہی ہو، تو میری شاعری کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنا، یا دیکھنا یا پڑھنا یا سمجھنا میرے خیال سے مناسب نہیں ہوگا۔میرے یہاں رومانٹک شاعری بھی ہے ترقی پسند شاعری بھی ہے۔

☆ آپ کے ہاں غالب کے جملوں سے چھیڑ چھاڑ کو کس زمرے میں شمار ہونا چاہیے؟

☆☆ غالب سے میرا رشتہ بہت ہی عجیب و غریب قسم کا ہے۔کسی ایک شاعر کو اگر میں اپنی شاعری میں اوڑھتا بچھاتا ہوں تو وہ غالب ہی ہیں۔غالب میرے استاد ہی نہیں میرے محبوب بھی ہیں اور محبوب کے ساتھ جتنی لبرٹی لی جاسکتی ہے میں لیتا ہوں۔آپ چاہیں تو اسے چھیڑ چھاڑ کہہ سکتے ہیں۔میں نے غالب کی زمین میں غزلیں بھی کہی ہیں اور ان کے مصرعے کو اپنے ڈھنگ سے استعمال بھی کیا ہے۔ان کے خیال کو اپنے ڈھنگ سے برتا بھی ہے، میں دو شعر آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پہلا شعر غالب کا بہت مشہور ہے جسے میں بار بار کوٹ کرتا ہوں:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں نے اس پر مصرع لگایا ہے:

موت کا ایک دن معین ہے
''زندگی کا بھی کوئی دن ہے کیا''

دوسرا شعر جس میں میں نے غالب کے خیال کو اپنے ڈھنگ سے برتا ہے بہت مشہور شعر ہے ان کا:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

میں نے اس خیال کو اس ڈھنگ سے برتا ہے:

دل پھر بضد ہے پھر اسی کوچے میں جائیں ہم
پھر ایک بار وہ ہمیں بے آبرو کریں

☆ ایک ہی سانس میں قدوائی صاحب آپ کے ہاں ہجر و وصال کے

ناپختہ برتاؤ کی بات کرتے ہیں اور اس مضمون کو آپ کا مرغوب موضوع بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ میری شاعری کے حوالے سے مضمون نگاروں کی آراء (Opinions) ہیں۔ان کی رائے پر میرا کچھ بھی کہنا مجھے مناسب نہیں لگتا، اگر کچھ کہنا ہے تو میری شاعری ہی کو کہنے دیجئے۔

☆ آگے چل کر شافع قدوائی صاحب آپ اور آپ کے اشعار کو مشہور امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ سے تشبیہہ دیتے نظر آرہے ہیں؟

☆☆ میرا خیال ہے مذکورہ بالا جواب سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی۔

☆ رفیع رضا صاحب عباس تابش صاحب کی شاعری کو بنائے گئے مناظر اور آپ کی شاعری کو تجربات ومشاہدات کی شاعری بتلا کر تابش صاحب پر آپ کو فوقیت دے رہے ہیں؟

☆☆ گلزار بھائی لگتا ہے آپ مجھے کانٹوں میں کھینچنے کی ٹھان کر آئے ہیں۔ بندہ پرور! رفیع رضا صاحب اور تابش صاحب جیسے بلند قامت اہلِ قلم کی میرے دل میں بے پناہ عزت واحترام ہے لہٰذا جو انہوں نے کہا سرِ تسلیم خم ہے۔

☆ نئے تخیل، نئی تشبیہات اور نئی لفظیات کے بلند آہنگ شاعر جناب جون ایلیا پر آپ کو اہمیت واوّلیت دینا بھی رفیع رضا صاحب نے خدا معلوم کیوں ضروری جانا؟

☆☆ بہتر ہوتا کہ آپ اس حوالے سے براہِ راست رفیع رضا صاحب سے رجوع کرتے تو آپ کے ساتھ میرا بھلا بھی ہو جاتا۔

☆ اجمل سعید صاحب شاعری کو فطری بتانے والی کیٹس کی رائے پر سر دھنّے کے ساتھ آپ کے برتاؤ کو کیٹس کے برتاؤ سے بہتر بتلا کر دوست نوازی کی تمام حدیں پار کرنے پر بضد کیوں ہیں؟

☆☆ اس سوال کو سن کر مجھے قبلہ صوفی تبسم صاحب شدت سے یاد آگئے ہیں:

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

۲۶۔ رفیع رضا صاحب نے آپ کے باب میں خدا کا ذکر کرتے ہوئے لفظ ''نام نہاد'' لگانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

☆☆ خدا کے حوالے سے رفیع رضا صاحب نے جو کہا اس کا جواب تو وہی بہتر دے سکتے ہیں لیکن یہاں میں اپنے ایک شعر کے ذریعہ اپنی بات کہنا چاہوں گا:

یہ اور بات ہے کہ جدا ہے مری نماز
اللہ جانتا ہے کہ کافر نہیں ہوں میں

یہاں میں جدا نماز کہہ کر ہندو پوجا پاٹھ کی بات نہیں کر رہا ہوں. کیوں کہ میں اس کو بھی فالو نہیں کرتا، میرے نزدیک خدا کی ذات کا تصور یا خیال یہ ہے کہ میں اسے ہر وقت ہر جگہ محسوس کرتا ہوں۔ اس کی موجودگی کا احساس ہی میرے لئے عبادت ہے۔ میرے حساب سے ہر اچھا سچا اور نیک کام خدا کی عبادت ہے، میرے جوابات میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا اور میرے اشعار میں بھی جگہ جگہ 'غیب' کا ذکر آیا ہے، یہ 'غیب' خدا ہی تو ہے۔ میں جو کچھ بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہا ہوں اس کی اکلوتی وجہ 'غیب' یا خدا ہی ہے۔ تو میں خدا کو تو مانتا ہوں لیکن اس کی عبادت کو Religious Rituals (دھارمک کرم کانڈ) تک محدود نہیں رکھتا۔

☆ شافع قدوائی صاحب نے Language Un Saying کی وضاحت کر دی ہوتی تو آپ کو زحمت نہ دینا پڑتی؟

☆☆ Langauage of Un Saying to Poetry کی سب سے بڑی پہچان ہے، طاقت ہے، خوبصورتی ہے،
فیض صاحب کا مشہور شعر ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت نا گوار گزری ہے

یعنی کہ وہ بات فسانے میں اس طرح سے چھوائی گئی کہ وہاں پہنچ گئی
میری اپنی ایک غزل کے اشعار ہیں:

میں نے جب قطرہ لکھا اس نے سمندر پڑھ لیا
میرے باہر ہی سے اس نے میرے اندر پڑھ لیا

میں نے اس کو مہرباں لکھا، کرم فرما لکھا
لیکن اس ظالم ستم گر نے ستم گر پڑھ لیا

مضطرب ہوں جانے کیا آئے گا اب خط کا جواب
میں نے جو لکھا نہیں اس نے مگر پڑھ لیا

غزل کو تو ویسے بھی اشاروں کنایوں کا آرٹ کہا جاتا ہے، غزل میں جو کہا جاتا ہے اس سے زیادہ 'اَن کہا' ہوتا ہے۔

☆ جان کیٹس نے جان ٹیلر کو لکھے گئے خط میں شاعری کو اپنی آپ بیتی گردانتے کی جو بات کی ہے اُس کے حوالے سے آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ جہاں تک شاعری کے آپ بیتی ہونے کا سوال ہے تو میرا خیال ہے کہ کسی بھی فن کار کے فن کو آپ بیتی کہنا اس کو محدود کرنا ہے۔ کسی بھی فنکار پر فرد کے طور پر جو بیتی ہے اس کی ایک سیما ہوتی ہے اور کوئی بھی بڑا ادب یا فن بس صرف ذاتی تجربوں کی بنیاد پر ہی تخلیق نہیں ہوتا۔ میں صرف تین بڑے نام لوں گا: میکسم گورکی، پریم چند اور منٹو۔ گورکی نے مرد ہوتے ہوئے 'ماں' جیسا عظیم کردار رچا۔ پریم چند نے کسان نہ ہوتے ہوئے کسانوں کی زندگی کے دکھ درد کی مہا گاتھا لکھی اور منٹو نے اپنی کہانیوں میں جسم فروشی کرنے والی عورتوں کے آنسوؤں کا سیلاب بہا دیا۔ ان تینوں کا کام 'آپ بیتی' کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ تو ادب میں آپ بیتی کے علاوہ یا اس سے کہیں زیادہ جگ بیتی کا آبزرویشن اور اس آبزرویشن کی بنیاد پر اس سچویشن یا احساس کاری کریشن ہی فن ہے۔

☆ شبلی نعمانی نے انسانی معاشرے کی کُل، سائنس اور فلسفہ نہیں بلکہ ایک ذوقی اور وجدانی چیز قرار دیا ہے اس حوالے سے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

☆☆ شبلی نعمانی کے حوالے سے آپ نے جو بات کی ہے میں اس سے پوری طرح سے متفق ہوں، دنیا کی بہتری کے لئے جہاں سائنس نے اپنا کردار نبھایا ہے وہیں فلسفیوں کا اپنا رول ہے. فلسفیوں نے جہاں دنیا کے اسرار سے الجھنے اور انھیں سلجھانے کے راستے سجھائے ہیں وہیں سائنس نے ہماری زندگی کو آسان بہت آسان کر دیا ہے۔ سائنس نے ایک طرح سے ٹائم اور اسپیس پر قابو پا لیا ہے. اب عین ممکن ہے کہ آپ صبح کی چائے اور ناشتہ دلی میں کریں، لنچ لاہور میں کریں اور ڈنر دبئی میں۔ یہ سب سائنس نے ہی ممکن کیا ہے، سائنس نے ہی دنیا کو گلوبل ویلج بنایا ہے اور گلوبل ویلج کے بعد اب یہ گلوبل محلّہ ہوگئی ہے. جی ہاں! آپ کچھ ہی گھنٹوں میں ایک کانٹینٹ سے دوسرے کانٹینٹ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ آپ اسی وقت دنیا کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور دنیا آپ کے ڈرائینگ روم میں جھانک سکتی ہے۔ ٹی وی انٹرنیٹ، سوشل میڈیا ان سب نے الگ سے دنیا پیدا کر دی ہے۔ جس میں دوریاں نام کی چیز ختم ہوگئی ہے۔ آپ اور ہم بھی جو جڑے ہوئے ہیں تو انھیں میڈیا اور انھیں سائنس کے کرشموں کی وجہ سے۔ تو سائنس نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن یہ ایک باہری معاملہ ہے اور بہت بڑا معاملہ ہے یہ، لیکن جو معاشرہ ہے وہ صرف ایک دوسرے سے بہت جلدی جڑنے بہت جلدی کہیں پہنچنے کا ہی کام نہیں ہے، انسانی معاشرے کی جو اندرونی خوبصورتی ہے وہ اس معاشرے کو زندہ رکھتی ہے آگے بڑھاتی ہے، خوش حال رکھتی ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ جو باہری چیز ہے جو خوبصورتی ہے، جو ہم قدرتی کرشمے بھی دیکھتے ہیں ندی، تالاب، جھرنے، پہاڑ، جنگل، یہ سب قدرت کے کرشمے ہیں ان کو تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں اس کے علاوہ انسان کے اندر بھی کئی کرشمے ہوتے ہیں جو اس کو خوبصورت بنائے رکھتے ہیں اور انھیں کرشموں میں جو رول ادا کرتے ہیں وہ اچھا ناول، اچھی کتاب، اچھی شاعری اچھا سنگیت، اچھا رقص، اچھی پینٹنگ، یہ سب ہماری خوبصورتی کو اندر کی خوبصورتی کو جگانے اس کو نکھارنے کا کام کرتے ہیں۔ تو یہ ذوق وجدان کا جو رول ہے یہ انسانی معاشرے کے لئے بہت اہم رول ہے اور صرف سائنس، فلسفے سے ہی کام نہیں چلتا. یہ جتنے بھی بڑے بڑے کلاکار ہوئے ہیں، آرٹسٹ ہوئے ہیں، شاعر ہوئے ہیں یہاں تک بڑے کھلاڑی ہوئے ہیں ان سبھی نے انسانی زندگی کی خوبصورتی کو بڑھانے میں اپنا رول ادا کیا ہے۔

☆ ریڈیو ترسیلِ افکار و اذکار کا قدیم ذریعہ اظہار ہے۔ اس میڈیم سے آپ کی وابستگی اور خدمات جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہونا چاہیے؟

☆☆ میں نومبر 1980 میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوا بطور پروگرام ایگزیکیٹیو۔ میری پہلی پوسٹنگ جالندھر ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی وہاں میں ایک سال رہا پھر تقریباً ساڑھے چار سال اپنے ہوم ٹاؤن یعنی جے پور میں رہا کچھ عرصہ المورا اور اس کے بعد انیس سو چھیاسی میں ممبئی آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ 2012 میں آل انڈیا ریڈیو کے سب سے زیادہ پاپولر چینل ووید بھارتی سے بطور اسٹیشن ڈائریکٹر ریٹائر ہوا۔ میری خوش نصیبی رہی کہ جس ووید بھارتی کو سن سن کر میں بڑا ہوا اسی کا ایک دن چینل ہیڈ بھی بنا یعنی اسٹیشن ڈائریکٹر بھی بنا۔

ریڈیو کے اکتیس بتیس سالہ سفر میں سبھی اسٹیشنز پر کچھ نہ کچھ کرنے اور سیکھنے کا موقع ملا لیکن سب سے زیادہ کریٹیو سرٹیفکیشن مجھے جیپور ریڈیو اور ووید بھارتی میں کام کرتے وقت حاصل ہوا۔ جے پور میں ریڈیو ڈراما بھی کیے۔ Adoptation بھی کئے۔ میوزک بھی دپلوگرام Production تو خیر کیا ہی۔

جے پور میں میری creativity کو کھل کر سامنے آنے کا موقع ملا۔ لیکن ووید بھارتی کا تجربہ سب سے الگ سب سے انوکھا رہا۔ یہاں میں نے طرح طرح کے Spokenword کے پروگرام کیے چتر شالا، ہوا محل وغیرہ ڈرامہ لکھے، پروڈیوس کیے۔ غالب کی چنندہ غزلوں کا میوزیکل کمپوزیشن کیا۔ ان کو سریلائز کیا۔

سنسکرت کے مہا کوی جے دیو کے گیت گوند کا ڈرامائی Radio adoptation کیا۔ ان کے سنسکرت گیتوں کا میوزک کمپوزیشن کیا، سریلائز کیا۔ کبیر کے دوہوں کو میوزیکل کمپوزیشن کر کے سریلائز کیا. اس کے علاوہ ممبئی کی نامی گرامی فلمی ہستیوں کے لمبے لمبے انٹرویو ریکارڈ کیے۔ بطور چینل ہیڈ ووید بھارتی کی نئی پروگرامنگ کی۔ نئے نئے پروگرام انٹرڈیوز کئے۔ ووید بھارتی میں کام کرتے ہوئے الگ الگ فیلڈز کے مہارتھیوں اور ابھرتے ہوئے ستاروں سے انٹرکشن کرنے کا لگاتار موقع ملتا رہا، کریٹیو انرجی میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔ کُل ملا کر میں اپنے آپ کو خوش قسمت مانتا ہوں کی مجھے آل انڈیا ریڈیو جیسے آرگنائزیشن کا حصہ بننے کا موقع ملا۔

☆ موسیقی کو فنون لطیفہ کی بنیاد گردانا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ کے باب میں موسیقی کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے والد صاحب سے انسپریشن کے علاوہ تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی؟

☆☆ جہاں تک میوسیقی سے میرے لگاؤ یا جڑاو کی بات ہے تو میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے والد صاحب گلوکار ہیں، ریڈیو سنگر تھے اور میرے بڑے بھائی صاحب بھی گاتے ہیں۔ میرے والد اچھے گائیک تو تھے ہی انھوں نے جے پور میں کلاسیکل میوزک کنسرٹ کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ایک آرگنائزیشن بنائی 'MandalShruti' نام سے جس میں بڑے بڑے استاد اور گرو کوئی بھی نام لیجئے جن کو ہم نے بچپن میں سنا، ان کے ساتھ آمنے سامنے بیٹھے، ان سے باتیں کیں تو یہ سب ماحول گھر میں تھا۔ تو اس ماحول کا اثر مجھ میں بھی آیا، مجھ میں ایک اضافی چیز یہ آئی کہ میں میوزک کمپوز بھی کر لیتا ہوں. تو یہ اسی کی دین ہے اور جہاں تک شاعری اور موسیقی کا سوال ہے ان کے آپسی رشتے کا سوال ہے تو میرا یہ ماننا ہے کہ خاص طور سے غزل کی شاعری اور اس میں جتنی نغمگی ہوگی، جتنی musicality ہوگی اس میں جان اتنی زیادہ ہوگی۔ اگر ہم بات کریں میر، غالب، داغ، مومن ان سب کی اور بعد میں اگر دیکھیں تو فیض صاحب، احمد فراز ان سب کے یہاں ایک کلاسیکل رچاؤ اتنا شاندار ہے کہ بڑے سے بڑے خیال کو انھوں نے اتنی نغمگی کے ساتھ باندھا ہے کہ ان کی غزلیں خوب گائی جاتی ہیں

،سنی جاتی ہیں اور سراہی جاتی ہیں۔لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ نغمگی، یہ کلاسیکی رچاؤ آج کے شعراء میں غزل کے شعرا میں کم کم نظر آتا ہے،خیالات یا موضوعات آئیڈیاز بہت اچھے ہیں، نئے ہیں لیکن ان کو نغمگی کے ساتھ بھی باندھا جاسکتا ہے۔میرا ایسا خیال ہے اور اسی لئے آپ دیکھیں کہ آج کے بڑے سے بڑے یا پاپولر سے پاپولر شاعر کو گانا ذرا مشکل ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ گانے سے غزل بڑی ہوتی ہے لیکن ایک اچھی اور بڑی غزل کی پہچان میرے حساب سے یہ ہے کہ اس میں کلاسیکی رچاؤ ہو، نغمگی ہو۔ اگر وہ ہو تو بہت بہتر ہے ورنہ غزلیں تو آج بھی بہت اچھی کہی جارہی ہیں۔

☆ شہریار صاحب اردو شاعری کا نہایت معتبر حوالہ ہیں۔ بقول شہریار صاحب بھارت میں کم وبیش ایک درجن مشاعرے روزانہ کی بنیاد پر منعقد ہوتے ہیں جن میں کم از کم دوسو شاعر اپنا کلام سناتے ہیں۔آپ کے خیال میں مشاعروں کی یہ بہتات اردو زبان وشاعری کو کس سمت لے جارہی ہے؟

☆☆ شہریار صاحب کے حوالے سے آپ نے جو بات کہی ہے بالکل درست ہے کہ ہندوستان میں درجنوں کی تعداد میں روز مشاعرے ہوتے ہیں اور سینکڑوں شاعر اپنا کلام کہیں نہ کہیں پڑھتے ہیں۔ یہ تعداد اب لگاتار بڑھتی جارہی ہے۔لیکن مشاعرہ اور ادب اب دو مختلف چیزیں ہوگئی ہیں۔ ہندوستان میں۔ایک زمانہ تھا جب اسٹیج پر علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں، جگناتھ آزاد، شہریار، ندا فاضلی محمد علوی، بشیر بدر۔۔۔ ہوا کرتے تھے. اور پاکستان سے احمد فراز صاحب، افتخار عارف، کشور ناہید جیسے نام شامل ہوتے تھے اور audience میں ہوا کرتے تھے دلیپ کمار اور ایم ایف حسین یعنی مقبول فدا حسین جیسے عظیم فنکار۔تو یہ معیار بھی ہم نے دیکھا ہے۔ بلکہ ان میں سے کچھ مشاعروں میں شرکت بھی کی ہے۔تو یہ ایک زمانہ تھا لیکن یہ زمانہ بہت تیزی سے بدلا اور پھر یہ ہوا کہ مشاعرہ ایک پروفارمنگ آرٹ بن کر رہ گیا۔خاص طور سے ہمارے یہاں ہندوستان میں، ہندوستان میں بہت بڑے بڑے مشاعرے بھی ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں۔گاؤں میں، شہروں میں قصبوں میں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ وہاں آتے ہیں اور رات رات بھر چلتے ہیں۔ان میں وہی لوگ ٹک پاتے تھے یا سنے جاتے تھے جو بہت اچھے پروفارمر ہوں چاہے وہ تحت اللفظ میں ہوں یا ترنم میں ہوں۔ میں چار نام لوں گا جو ہندوستان کے پاپولر موسٹ پوئٹس کہے جاسکتے ہیں۔جن میں وسیم بریلوی، راحت اندوری، منور رانا اور منظر بھوپالی، یہ چاروں نام خوب سنے جاتے رہے ہزاروں کی تعداد میں۔لیکن اگر ادبی حیثیت کی بات کریں تو ان کی وہ ادبی حیثیت نہیں یا ادب میں وہ مقام ان کا نہیں ہے۔تو مشاعرہ ایک پروفارمنگ آرٹ بن کر رہ گیا، یہ تو ہزاروں کے تعداد کے مشاعروں کی بات ہوئی۔ بند آڈیوٹوریم میں بھی مشاعرے ہوتے ہیں اور پانچ چھ سو کی تعداد والی آرڈینس اور کمپیکٹ والی آرڈینس بھی ڈیڑھ سو دو سو کے لوگوں کی ہوتی ہے تو یہ سب بھی ہوتا ہے اور خوب ہو رہا ہے۔ مشاعرے لگاتار بڑھتے جارہے ہیں، یہاں ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں کہ اردو زبان کی پاپولریٹی تو بڑھتی جارہی ہے، اس کا عالم تو یہ ہے کہ ہندی کے بڑے بڑے پبلشر بھی جب اردو شاعری کو ہندی دیوناگری اسکرپٹ میں چھاپتے ہیں تو کتابیں ہندی کی کویتا سے زیادہ بکتی ہیں، خوب بکتی ہیں، ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔چاہے وہ ہندوستان کی شاعری ہو یا پاکستان کی شاعری لیکن ہندی کا کوی اتنا نہیں بکتا۔تو یہ اردو زبان، اردو غزل اور اردو شاعری کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے، پہلے فلمی گانوں نے بھی کیا یہ کام مشاعرے تو خیر کر ہی رہے ہیں لیکن ہندوستان میں اردو زبان کا یہ المیہ ہے کہ اردو زبان جتنی پاپولر ہو رہی ہے اردو اسکرپٹ اتنی ہی سکڑتی جارہی ہے، تو مشاعروں کی پاپولریٹی سے مشاعروں کی تعداد کے بڑھنے سے اردو اسکرپٹ نہیں بڑھ رہی ہے اردو زبان کی مقبولیت، اس کی پاپولریٹی لگاتار بڑھتی جارہی ہے اور بہت اچھے مشاعرے بھی ہو رہے ہیں اور نئی پیڑھی، نئی نسل نوجوان شاعر بھی بہت جوش و خروش سے آگے آرہے ہیں. اور ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اردو اسکرپٹ سے واقف نہیں ہیں جنھوں نے ہندی میں اردو شاعری پڑھی ہے سنی ہے اور غزل کا جادو یا شاعری کا جادو ان کے سر پر سوار ہوا اور وہ شعر بھی کہنے لگے، اور اب ہندوستان کے زیادہ تر شہروں میں نوجوان شاعروں نے اپنے گروپ بنا رکھے ہیں اور وہ ہر ہفتہ ملتے ہیں اور مہینے میں ایک آدھ اچھی نشست کر لیتے ہیں دو تین مہینے میں ایک مشاعرہ بھی کر لیتے ہیں تو مشاعرے بڑھ رہے ہیں۔اردو زبان کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔لیکن وہی جیسا کہ عرض کیا میں نے اردو اسکرپٹ جو ہے اسکو چاہنے والے، پڑھنے والے، سیکھنے والے کم سے کم ہوتے جارہے ہیں۔لیکن یہ بھی ہے کہ اردو ادب کو مشاعرے کیا دے رہے ہیں یہاں ہندوستان میں بالکل ایک الگ بات ہے۔ ہندوستان میں ابھی بھی اسے ایک پروفارمنگ آرٹ کے طور پر لیا جاتا ہے، اچھے شاعر بھی اس میں شامل ہوتے ہیں، انھیں سنا بھی جاتا ہے لیکن عام طور پر یہ ابھی بھی پاپولر پوئٹس کا ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے۔دعا کرتے ہیں کہ جو نئی نسل آرہی ہے جن میں سنجیدگی بھی ہے اور اچھے شاعروں کو پڑھ کے شعر کہنا انھوں نے شروع کیا ہے تو یہ سنجیدگی مشاعروں کے لیول میں بھی بڑھے گی اور ایک زمانہ آئے گا کہ جب یہاں بھی مشاعروں کا معیار بلند ہوگا۔

☆ آپ کے ہاں جس شدت اور زور بیاں کے ساتھ ہجرت کا ذکر نظر آتا ہے اُس کی روشنی میں ہجرت کی نشان دہی ضروری ہو جاتی ہے؟

☆☆ آپ نے میری شاعری میں ہجرت کے بارے سوال پوچھا ہے. تو اس کا جواب شاید میں آپ بیتی والے سوال کے جواب میں دے چکا ہوں. ایک بار اور کہنا چاہوں گا کہ میں ہجرت سے نہیں گزرا لیکن میں نے اپنے آپ پر ہجرت کو گزارا ضرور ہے۔مطلب یہ ہے کہ آپ کے کلام میں سب کچھ ذاتی ہی ہو یہ ضروری نہیں، آپ کسی اور کا، دنیا کا، سماج کا لوگوں کا ایک بڑا دکھ اگر محسوس کر لیتے ہیں اور اس کو اپنی شاعری میں اتار لیتے ہیں تو وہ بھی ممکن ہے۔اور ایسا ہوتا ہے اکثر ہوتا ہے۔ میں نے بھی خاص طور سے ۱۹۴۷ء کے جو یہاں سے گئے لوگ ہیں جو وہاں سے آئے ہیں۔ان کے دکھ جس شدت کے ساتھ وہ لوگ اپنی مٹی، اپنی زمین سے کٹ کر ہجرت پر مجبور ہوئے اور مہاجر کہلائے، وہ محسوس کیا جاسکتا

ہے۔ یہ تو ہوا سن ۴۷ء کا دکھ یا اس کی ہجرت، لیکن میں نے مشاعرے کے دوران کئی ملکوں کا دورہ کیا ہے، مشاعرے پڑھے ہیں تو گلف میں میں نے، گلف کے ملکوں میں معمولی مزدور چاہے وہ کنسٹرکشن میں لگے ہوئے لوگ ہوں، بڑھئی ہوں، ڈرائیور ہوں، تو وہ سب بھی میں نے دیکھے ہیں جو زیادہ تر ہندوستانی پاکستانی ہوتے ہیں اور اسی طرح سے یورپ، انگلینڈ، کناڈا اور امریکہ میں بھی میں نے وہاں کے اسٹورس میں چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے لوگ دیکھے ہیں جو زیادہ تر ہندوستان، پاکستان، شری لنکا، بنگلہ دیش سے ہوتے ہیں تو ان کی بھی ایک ہجرت ہے وہ لوٹ پائیں گے یا نہیں، وہ اپنے گھر کی خوش حالی کے لئے وہاں گئے ہیں اور وہ سارے دکھ، پریشانیاں بھی جھیل رہے ہیں، گھر سے دور، مٹی سے دور تو دونوں طرح کی ہجرت میں نے دیکھی اور وہ جو دکھ ہے وہ درد ہے اس کو محسوس کرنے کے بعد ہی ہجرت والے شعر وہ تخلیق ہوئے ہیں۔

☆ دل پھر بضد ہے، پھر اسی کوچے میں جائیں ہم
پھر ایک بار وہ ہمیں بے آبرو کریں

یہ کون سا کوچہ اور شخصیت ہے جن سے غالب کی پیروی میں آپ کے ہاں بے آبرو ہونے کی خواہش مچل رہی ہے؟

☆☆

دل پھر بضد ہے پھر اسی کوچے میں جائیں ہم
پھر ایک بار وہ ہمیں بے آبرو کریں

اپنے اس شعر کے بہانے سے بہت سی ذاتی تفصیل جاننی چاہی ہیں، وہ کوچہ کون سا ہے، اور وہ شخصیت کون ہے، تو جناب! کوچہ بھی وہی ہے جہاں سے غالب بے آبرو ہو کر نکلے تھے اور شخصیت بھی وہی جس کے غالب دیوانے تھے

غالب سے اپنے تعلق کے بارے میں میں بتا ہی چکا ہوں، ان سے میرا یارانہ، دوستانہ، محبتانہ، سب کچھ ہے، ان کی ہر ادا اور عادت کا میں دیوانہ ہوں (شراب نوشی کو چھوڑ کر) تو غالب جس شخصیت کے دیوانے ہیں اسی کا دیوانہ میں بھی ہوں، غالب کے شعر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کے کوچے، شکستہ دل ہو کر نکلے تھے۔ لیکن وہ غالب کا دل تھا یہ میرا دل ہے۔ شکستہ ہو کر بھی جس کی دیوانگی میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ بار بار بے آبرو ہونے کے لئے بار بار اسی کوچے میں جانا چاہتا ہے، میرا خیال ہے غالب آج ہوتے تو میرے دل کی دیوانگی دیکھ کر خوش ہوتے اور شعر پڑھ کر شاید داد وداد بھی دیتے۔

☆ نسیم سحر صاحب نے ہندوستانی شاعری پر جو رائے تحریر فرمائی ہے اُس کی بابت آپ کا نکتہ نظر جاننا از حد ضروری ہو گیا ہے؟

☆☆ یہ بھی خوب رہی۔ دوستی آپ کی، قربت آپ کی اور ہمسائیگی بھی آپ کی۔ خدا معلوم آپ جی میں ٹھان کے کیا آئے ہیں۔

☆ بھائی نوید سروش ایک دنیا کے ختم اور دوسری دنیا کے جنم کی بات کر کے جس تنہائی کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں بنی نوع انسان اُس سے کس طور نبرد آزما ہوگا؟

☆☆ بھائی نوید سروش بھلے آدمی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ سوال مذکور کسی بڑے سائنس دان یا ماہر عمرانیات کے آگے رکھتے تو شاید نتیجہ بہتر ہوتا۔

☆ تخلیق کار اُمید و بیم کا پیامبر ہوا کرتا ہے جبکہ آپ سیدھا سیدھا خدا سے دنیا لپیٹنے کی دعا مانگ رہے ہیں؟

☆☆ آپ بجا فرما رہے ہیں کہ تخلیق کار کو امید کی positivity کی باتیں کرنی چاہئیں۔ لیکن جہاں امید بر آتی نظر نہیں رہی وہاں نا امیدی، ناراضگی، دکھ، تکلیف کا اظہار بھی اس کا فرض ہے۔ اور نا امیدی اور ناراضگی کا یہ سُر ہر دور کی شاعری میں سنائی دیتا ہے۔ وہ علامہ اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ ہو یا پھر فلم پیاسا کے گیت کی امر لائن:

یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

میں نے جو اپنے شعر میں خدا سے کائنات سمیٹنے کی بات کہی تو وہ ایک طرح کا شکوہ ہی ہے۔ یا تو دنیا کو بہتر جینے لائق بنایا سمیٹ لے، حالاں کہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے نہ کسی کے کہنے سے دنیا بنائی تھی نہ کسی کے کہنے سے سمیٹے گا، میرے ایک اور شعر کا مصرع ہے:

خدا ہے تُو تو کر شمے بھی کچھ خدا کے دِکھا
تو انتظار ہے خدا کے کرشموں کا

☆ آپ کی نسبت لکھے گئے ایک مضمون میں اُن قوموں اور معاشروں کو نشان زد کیا گیا ہے جو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر کان دھرنے کے بجائے دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اگر اس بیان کو ہم اپنے خطے کے عوام اور حکمرانوں کو سامنے رکھ کر جانچیں، پرکھیں تو کس طرح کے نتائج سامنے آتے ہیں؟

☆☆ ہمارا معاشرہ، ہماری قوم اور ہمارا خطہ تینوں پر غور کریں تو سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ جاہل، کاہل اور ناکارہ لوگ اسی خطے میں پائے جاتے ہیں اور ہمارے حکمرانوں کا تو کہنا ہی کیا، سب سے زیادہ نیچ، نکمے، اور کرپٹ حکمراں ہمارے ہی نصیب میں آئے ہیں، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور یہ ہمیں ابھی بھی ذات پات اور مذہب کی لڑائیوں میں الجھائے ہوئے ہیں۔

آپ اور ہم جس ویسٹرن ورلڈ کو گالیاں دیتے نہیں تھکتے، نئی سے نئی ساری ایجادیں وہیں ہوئی ہیں۔ دنیا کو ماڈرن انھوں نے ہی بنایا ہے، انھیں کی ایجادوں کے بل پر آج ہم عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی ترجیحات بالکل واضح رکھیں، مذہب کو گھر میں رکھا اور ترقی کو اہمیت دی۔ ہماری ترجیحات کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے، سری لنکا کی حالت ہم دیکھ رہے ہیں۔ پاکستان اور انڈیا اسی لائن میں ہیں، دعا کیجئے کہ اس خطے کے عوام جاگیں اور حکمرانوں کو صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور کر سکیں۔

☆ ایک شعری مجموعہ کے بل پر جس قدر عزت و احترام، شہرت و ناموری آپ کے حصّے میں آئی اس کی مثال کم کم نظر سے گزری ہے۔ مستقبل کے حوالے سے کس قسم کے ارادے اور منصوبے ترتیب پا رہے ہیں؟

باقی صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ کیجیے

''خوشبو کے معنیٰ''

جناب راجیش ریڈی کے غزلیہ کلام کی اُٹھان

عطیہ سکندر علی ..... سحر

پھول کے ہونٹوں سے خوشبو کے معانی سن کر
اپنا شعر اچھا لگا تیری زبانی سن کر

آنکھ میں اشک کی آہٹ ہوئی، دِل چونک اٹھا
کان صحرا کے کھڑے ہو گئے پانی سن کر

میں نے جس شخص کے آنسو کبھی گرنے نہ دیئے
ہنس پڑا وہ بھی مری رام کہانی سن کر

ختم ہوتے ہی نہیں رنج الم کیوں یا رب !
ہَم تو آئے تھے یہاں دنیا کو فانی سن کر

یہ تبسم ہے مرے شعر کا پہلا مصرع
تبصرہ کیجئے گا مصرعِ ثانی سن کر

..... ○ .....

☆

کچھ اپنی جیب سے ہر دن لگانا پڑتا ہے
ہمیں تو روز خسارہ کمانا پڑتا ہے

بدل-بدل کے سبھی راستوں کو دیکھ لیا
ہر ایک رستے پہ آگے زمانہ پڑتا ہے

بنانے پڑتے ہیں پہلے سراب صحرا میں
پھر ان سرابوں سے دریا بنانا پڑتا ہے

انھیں تو موت کبھی مار ہی نہیں سکتی
کہ جن کو عشق میں مر کر دکھانا پڑتا ہے

یہ جو ضمیر ہے سونے کا روگ ہے اِس کو
اِسے جھنجھوڑ کے ہر دن جگانا پڑتا ہے

وہ جو خلاؤں میں سب سے بڑا خلاء ہے نا
اُسی خلاء میں ہمارا ٹھکانا پڑتا ہے

○

☆

مٹّی زمین کی تھی سو مٹّی زمیں پہ ہے
لیکن ہماری روح خلا میں کہیں پہ ہے

کاندھا کوئی نہیں ہے کہ سر جس پہ رکھ سکیں
سارا کا سارا بوجھ ہمارا ہمیں پہ ہے

اعمال آسمان پہ جائیں گے تیرے ساتھ
یعنی وہاں کا فیصلہ ہونا یہیں پہ ہے

کافی نہیں ہے تیری عبادت کا یہ ثبوت
سجدے کا اک نشان جو تیری جبیں پہ ہے

اب اپنے آپ پر تو بھروسہ نہیں رہا
لیکن اک اعتبار سا تیرے یقیں پہ ہے

دیوار و در کے کان بھی ہوتے ہیں، آنکھ بھی
یعنی نظر مکاں کی مسلسل مکیں پہ ہے

○

☆

بری ہونا ہے اب مشکل ہمارا گواہی دے رہا ہے دل ہمارا
نہ رک پایا ہماری خود کشی تک بہت عجلت میں تھا قاتل ہمارا
جب اپنے آپ میں ڈوبے تو جانا ہمیں میں تھا کہیں ساحل ہمارا
ڈگر کرتے رہے اوروں کی آساں سفر ہوتا رہا مشکل ہمارا
اکیلے کب رہے ہم محفلوں میں اکیلا پن رہا شامل ہمارا
ہمیں رہنے بھی دے اپنے سفر میں نہ رستہ روک اے منزل ! ہمارا

..... ○ .....

☆

ہم سمجھتے تھے کہ اب کے ہیں یہ، کب کے نکلے
نئے آنسو تو کسی پچھلے سبب کے نکلے
راہبر کو بھی کچھ اندازہ نہیں رستے کا
جانے کب پہنچیں گے منزل پہ یہ کب کے نکلے
غم نہ کر گر نہ ہوئی تیری تمنا پوری
آخر اس دنیا میں ارماں کہاں سب کے نکلے
اک ذرا دیر کو روشن ہوئی جن سے مری رات
چاند -تارے وہ کسی اور کی شب کے نکلے
میں سمجھتا تھا کہ دشمن ہی مرے دشمن ہیں
یار دشمن تو مرے تم بھی غضب کے نکلے
کل بھی خواب آئے تھے ٹھہرے نہیں لیکن شب بھر
یہ مسافر تو کسی اور ہی ڈھب کے نکلے
ڈھونڈتے رہ گئے سب لوگ کوئی دوسرا رنگ
رنگ سب میرے سخن میں تری چھب کے نکلے
عمر بھر جن کو عقیدوں نے لڑائے رکھا
بعد مرنے کے وہ سب ایک ہی رب کے نکلے

○

☆

اب کیا بتائیں ٹوٹے ہیں کتنے کہا سے ہم
خود کو سمیٹتے ہیں یہاں سے وہاں سے ہم
کیا جانے کس جہاں میں ملے گا ہمیں سکوں
ناراض ہیں زمیں سے خفا آسماں سے ہم
اب تو سراب ہی سے بجھانے لگے ہیں پیاس
لینے لگے ہیں کام یقیں کا گماں سے ہم
لیکن ہماری آنکھوں نے کچھ اور کہہ دیا
کچھ اور کہتے رہ گئے اپنی زباں سے ہم
آئینے سے الجھتا ہے جب بھی ہمارا عکس
ہٹ جاتے ہیں بچا کے نظر درمیاں سے ہم
ملتے نہیں ہیں اپنی کہانی میں ہم کہیں
غائب ہوئے ہیں جب سے تری داستاں سے ہم
کیا جانے کس ٹھکانے پہ جا کر لگیں گے کب
چھوڑے تو جا چکے ہیں کسی کی کماں سے ہم
غم بک رہے تھے میلے میں خوشیوں کے نام پر
مایوس ہو کے لوٹے ہیں ہر اک دکاں سے ہم

○

☆

کوئی گلہ کسی سے نہ شکوہ ہی رب سے ہے　　ہم کو غرض ہی کوئی کہاں روز و شب سے ہے
میں کس سبب سے ہوں تو یہاں کس سبب سے ہے　　یہ اک سوال جب سے یہ دنیا ہے تب سے ہے
یا رب ! تو اپنے باقی کے منظر سمیٹ لے　　ہم کو تو کام ایک فقط ایک چھب سے ہے
یہ اور بات بچ کے گزرتے ہیں ہم سے لوگ　　ورنہ دعا - سلام ہماری تو سب سے ہے
تیرا جمال اپنی جگہ ہے مگر اے دوست　　لب پر تیرے نکھار ہمارے ہی لب سے ہے
مٹی کو آرزو ہی نے سونا بنا دیا　　دنیا میں جو کشش ہے ہماری طلب سے ہے

...... O ......

☆

خواب سے باہر نکل آنے کی لاچاری کے بعد
دیکھنا آساں نہیں دنیا کو بیداری کے بعد
ضبط نے روڑے بچھائے لاکھ ، لیکن اشک نے
راہ آساں کر ہی لی تھوڑی سی دشواری کے بعد
ساری کی ساری اگر مل بھی گئی دنیا تجھے
یہ بتا تو کیا کرے گا ساری کی ساری کے بعد
بعد مدت کے تم آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا
کام آنکھوں کو ملا ہے کتنی بے کاری کے بعد
اب کسی بھی موت پر تھوڑا سا مر جاتے ہیں ہم
جینا آساں ہو گیا مرنے کی تیّاری کے بعد
زندگی تو خیر آنی ہی نہ تھی ، آئی نہیں
موت بھی آئی تو آئی کتنی لاچاری کے بعد
ہوتے- ہوتے یہ ہوا خود کے مخالف ہو گئے
اِس کی،اُس کی جانے کِس-کِس کی طرفداری کے بعد
سب کا بچپن لوٹ آیا اک نئی آمد کے ساتھ
گھر کا گھر تُتلا رہا ہے ایک کلکاری کے بعد

O

☆

گھر سے چلے تھے دل میں کیا کیا خیال باندھے
لوٹے تیری گلی سے سو سو ملال باندھے
تصویر میں اترنے والی کہاں ہے خوشبو
لفظوں میں کوئی کیسے تیرا جمال باندھے
ایسا لگا کہ جیسے دنیا ہی باندھ لی ہو
کچھ اس ادا سے اس نے زلفوں کے بال باندھے
بوسے کی بات ہنس کر ٹالی گئی تو ہم نے
پہلا جواب سن کر باقی سوال باندھے
سنتے ہیں آئینے نے ہم پر کمر کسی ہے
ہم بھی نکل پڑے ہیں تلوار ڈھال باندھے
سارے مسافروں کے رخت سفر میں رب نے
ارمان انگنت اور گنتی کے سال باندھے
سستی چمک سے سارا بازار پٹ چکا تھا
ہم اک طرف کھڑے تھے گٹھڑی میں مال باندھے
جب تک مرے سخن کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں
میں نے بھی شاعری میں ہجر و وصال باندھے

O

☆

پہلے تھا کوئی ساتھ نہ اب ہے ہمارے ساتھ — لے-دے کے ایک رب تھا سو رب ہے ہمارے ساتھ
بچھڑی پلک جھپکتے ہی جب سے شب وصال — تب سے طویل ہجر کی شب ہے ہمارے ساتھ
آنکھوں میں خواب آتے ہیں آتی نہیں ہے نیند — مدت سے مسئلہ یہ عجب ہے ہمارے ساتھ
جو کچھ بھی تھا ہمارا وہ ہم سے بچھڑ گیا — جو کچھ نہیں ہمارا وہ سب ہے ہمارے ساتھ
اے دورجانے والے تجھے کچھ خبر بھی ہے — پہلے سے بھی زیادہ تو اب ہے ہمارے ساتھ
ہم اس کو دیکھ لیتے ہیں آنکھوں کو موند کر — اک چھب ہمارے ساتھ تھی، چھب ہے ہمارے ساتھ

..... ○ .....

☆

لفظوں کے معانی کے بھی اُس پار کہا ہے
ہم نے جو کہا ہے پسِ اظہار کہا ہے
آئینے کو جو کہنا ہے کہتا رہے گھر میں
لوگوں نے ہمیں صاحب کردار کہا ہے
شاہوں کے لئے جھک کے قصیدے نہیں لکھے
ہم نے نہ کبھی جوتی کو دستار کہا ہے
زنداں میں بھی آواز نے پہنی نہیں زنجیر
جو کہنا تھا ہم نے وہ سرِ دار کہا ہے
اب تُو بھی ہوا رقص کناں بین کی دھن پر
میں نے تو مرے یار! تجھے یار کہا ہے
جس شعر کو حاصل نہ ہوئی تیری توجہ
وہ شعر یہ لگتا ہے کہ بیکار کہا ہے

○

☆

پوری پڑتی ہے کائنات کہاں
لے کے جاؤں میں اپنی ذات کہاں
اپنی قسمت میں ان کا ساتھ کہاں
ہم کہاں اور ممکنات کہاں
آخری سانس تک اڑی ہی رہی
ٹالنے سے ٹلی حیات کہاں
دن اسی فکر میں گزرتا ہے
آج گزرے گی اپنی رات کہاں
اب تو اخبار یہ بتاتے ہیں
ہونے والی ہے واردات کہاں
رائیگاں ہی گئی خموشی بھی
اس نے سمجھی ہماری بات کہاں

○

☆

ہماری بانہوں میں آ کر بھی کیوں ہمیں سے گریز
سپردگی میں کبھی تو کرو ''نہیں'' سے گریز

میں داستان میں اس کی جہاں جہاں بھی رہا
سنا رہا ہے وہ کر کے وہیں وہیں سے گریز

تمام عمر ہمیں اُس مکاں میں رہنا پڑا
وہ جس مکان کو ہر پل رہا مکیں سے گریز

ملا کے ہاتھ ہی کیوں رک گئے گلے بھی ملو
بنے ہو دوست تو پھر کیوں ہو آستیں سے گریز

نہ کھلتے راز کبھی کائنات کے ہم پر
ہماری جستجو کرتی نہ گر یقیں سے گریز

فلک سے نکلا تو رستے میں پڑ گئی یہ زمیں
میں چاہ کر بھی نہ کر پایا اِس زمیں سے گریز

..... ○ .....

☆

روز ارادوں میں ذرا رد و بدل کرتے ہوئے
عمر گذری ہے یوں ہی آج کو کل کرتے ہوئے

درد کو حد سے گزاریں گے دوا کر لیں گے
اپنے ہر زخم کو ہم صبر کا پھل کرتے ہوئے

زندگی ایک پہیلی ہے پہیلی رہے گی
آپ الجھتے ہی چلے جائیں گے حل کرتے ہوئے

ہم تو چھوڑیں گے نہیں تجھ پہ بھروسہ کرنا
تُو ہی تھک جائے گا شاید کبھی چھل کرتے ہوئے

ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہاتھوں سے کسی دن ہم بھی
کہیں تعمیر کوئی تاج محل کرتے ہوئے

زندگی ! شکریہ احسان ہے تیرا ہم پر
ہم سخنور ہوئے ہیں تجھ کو غزل کرتے ہوئے

○

☆

مان کر کوئی دوسرا خود کو
دیتا رہتا ہوں مشورہ خود کو

جب بھی ہاتھوں میں تیرا ہاتھ آیا
میں نے محسوس کر لیا خود کو

ٹھیک سے دیکھنے دے کون ہے تو
درمیاں سے ذرا ہٹا خود کو

یوں بھی مصروف خود کو رکھّا ہے
خود سے روٹھے منا لیا خود کو

ہم اداسی سے جب بھی اوب گئے
ہم نے جبراً ہنسا لیا خود کو

اس سلیقے سے میں ہوا برباد
میں نے لگنے نہ دی ہوا خود کو

○

دیدِ مسلسل کا نیا بیانیہ

شافع قدوائی
(علی گڑھ)

کائنات کے مانوس مظاہر، معمولہ حقائق، گردوپیش کا جغرافیائی منظرنامہ، شخصی کوائف اور باہمی تعلقات پر مبنی عام مشاہدات اور مانوس تجربات تکرار اور یکسانیت سے گرانبار ہوتے ہیں اور اسیری کے ان مروّجہ اسالیب سے رہائی کی شعوری کوشش ایک قابل قدر انسانی سرگرمی سمجھی جاتی ہے۔ فن، علی الخصوص شاعری فہم عامہ سے ماخوذ ان تصورات کی صداقت پر سوالیہ نشان قائم کرتی ہے اور ان مانوس تصورات میں مضمر جزوی سچائی کو مسلمہ حقیقت کے طور پر پیش کرنے کی روش کی بے مائیگی کو طشت از بام کرتی ہے۔ سطح پر موجزن ہوتی حقیقت بھی یک سطحی اور سپاٹ نہیں ہوتی کہ اس میں تجسس اور اسرار کا ایک پہلو مستتر ہوتا ہے۔ پیش پا افتادہ شے سے شغف کارِ لاحاصل کے مترادف نہیں ہے کہ ارتکاز سے مانوس حقیقت ایک نئی صورت میں منقلب ہوتی ہے۔ اس کا ادراک عام نہیں تاہم ادب عام حقیقت کی کنہ میں موجود تازہ کاری کے امکانات کو بروئے کار لاتا ہے اور یہ باور کراتا ہے کہ مسلسل دیکھنے کا عمل بسا اوقات دید کے ''نادیدہ'' پہلوؤں کا ایک مرتعش منظرنامہ پیش کرتا ہے۔ بدیہی حقیقت کو بھی اگر بہ نظر غائر دیکھنے کا مسلسل اہتمام کیا جائے تو اس کی ایک نئی تعبیر کے افق ہویدا ہو جائیں گے معاصر اردو شاعری، جسے ادبی جرائد میں شائع ہونے والی اور مشاعروں میں پڑھی جانے والی یا پھر ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید کے خانوں میں منقسم کیا جاتا ہے، میں اس نوع کے خیال انگیز نکات کا حسی رویا شاذ ہی پیش کرتی ہے۔ مقام حسرت ہے کہ عہد حاضر کے ایک خوش فکر شاعر راجیش ریڈی نے، جن کا کلام موقر رسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور مشاعروں میں بھی داد و تحسین کے ڈونگرے بٹورتا ہے۔ مانوس کو غیر مانوس بنانے کی سعی تو نہیں کی مگر انسانی زندگی میں اور ''ارتکاز'' اور استقلال کے بارآور ہونے کو فنی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''میری آنکھیں یہ کہا کرتی ہیں اکثر مجھ سے
آپ دیکھی ہوئی چیزوں کو بہت دیکھتے ہیں''

شعر کے راوی کی خودکلامی جو مکالمہ ایک صورت ہے، تشریح کی محتاج نہیں کہ یہاں دیکھی ہوئی چیزوں کو بہت دیکھنے کے عمل کو اوملاً کارِ بے مصرف یا ایک لاطائل عمر ٹھہرایا گیا ہے مگر یہ عمل اکہرا اور پیچیدگی سے عاری نہیں ہے۔ یہ تو درست ہے کہ اکثر قربت یا نزدیکی حقیقت کو ایک جامد شے کے طور پر قائم کرتی ہے مگر یہی یکسانیت اور تکرار بسا اوقات ایک ایسے لمحۂ منور (Moment of Epipheny) کو جنم دیتے ہیں جس کی تابناکی سے انسانی وجود کی تکمیل کی راہ روشن ہو جاتی ہے اور وہ اس حوالے سے اپنی شخصیت کے کسی پہلو کو خود از سرِ نو دریافت کرتا ہے۔ لمحۂ استغراق کے بطن سے ہی تابناکی، سرخوشی اور سرشاری پیدا ہوتی ہے۔ راجیش ریڈی نے Language of Unsaying سے تخلیقی سطح پر استنباط کر کے یہ باور کرایا ہے کہ ارتکاز پایان کار منتج ہو جاتا ہے نئے امکانات کی بیش از بیش فراوانی پر۔ کسی شے کو توجہ کا مسلسل مرکز بنانے سے معمولہ حقیقت بے دخل ہو جاتی ہے اور امکانات کا ایک نیا باب وا ہوتا ہے گو کہ اس کا عرفان عام نہیں ہے۔

خود کلامی کے مانوس پیرائیہ میں ملفوف یہ شعر راجیش ریڈی کی تازہ کاری اور پامال موضوعات کو ایک نیا معنیاتی تناظر عطا کرنے کے تخلیقی فطانت کو خاطر نشان کرتا ہے۔ نئی اشیاء سے محظوظ ہونے کا متبادل شاعر کے پاس موجود ہے اور اسے احساس ہے کہ وہ نئی راہ، جس کا انتخاب کرنے والے کم ہیں، تعین کر سکتا ہے مگر وہ بدستور اپنی روش پر قائم رہتا ہے۔ یہ جذباتی ردعمل نہیں بلکہ اس کا شعوری فیصلہ ہے۔ دیکھنے کا عمل کسی خارجی معروض سے مربوط نہیں بلکہ یہ حواس کو مجتمع کرنے کی قوت کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس صفت کو شاعر نے ''چھب'' سے تعبیر کیا ہے:

ہم اس کو دیکھ لیتے ہیں آنکھوں کو موند کر
اک چھب ہمارے ساتھ تھی، چھب ہے ہمارے ساتھ

انسانی زندگی متبادلات کی آماجگاہ ہے مگر شاعر اپنے انتخاب پر، خواہ وہ شدید خسارے کی ایک صورت ہو، شکوہ سنج نہیں۔ راجیش ریڈی کے اس نوع کے اشعار پڑھ کر مشہور امریکی شاعر رابرٹ لی فراسٹ (1874-1963) کی شہرہ آفاق نظم The Road Not Taken (1916) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس میں شاعر نے منتخب متبادل اور ممکنہ متبادلات کی آویزش کو ایک جذباتی فشار کا پیکر عطا کیا ہے۔ موجودہ صورت حال مطبوع خاطر نہ ہونے کے باوجود یکسر تاسف انگیز نہیں ہے۔ خسارہ اور سرخوشی ذہنی رویے کے سوا کچھ اور نہیں۔ انسان نفع کماتا ہے، اس کے لیے وہ دکھ اٹھاتا ہے اور مشقت کرتا ہے۔ نقصان شعوری نہیں ہوتا کہ یہ لابدی انسانی عمل (Elemental Human Predicament) ہے۔ عشق کا ماحصل دستیابی نہیں بلکہ خسارے کا مسلسل گہرا احساس ہے۔ راجیش ریڈی نے اس نکتے کو پالیا ہے۔

کچھ اپنی جیب سے ہر دن لگانا پڑتا ہے
ہمیں تو روزہ خسارہ کمانا پڑتا ہے

خسارہ اٹھانا عام طور پر مستعمل ہے مگر شعوری کوشش کو خاطر نشان کرنے کے لیے بہتر لفظ ''کمانا'' ہے جو شاعر نے استعمال کیا ہے۔ انسان طبعاً کامرانی اور شادکامی کا جویا ہوتا ہے مگر مسرت اپنے آخری تجربے میں ہزیمت اور شکست کا احساس کراتی ہے۔ لہٰذا خسارے کے لیے صعوبتیں اٹھانا دراصل اپنی شخصیت کے بعض نادیدہ گوشوں کی تکمیل کرنے کے مماثل ہے۔ ''اظہار'' یا سخن Sharing سے کہیں زیادہ دکھ بھوگنے کا عمل ہے۔ خاموشی سے نہ کچھ ضائع ہوتا ہے اور نہ اس سے کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اظہار پرسش غم کا وسیلہ بھی ہے مگر اس سے

اندر وہ آگیں صورت بھی پیدا ہوتی ہے کہ عام طور پر ہمدردی کے نام پر لوگ زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں۔ شاعری میں ہجر (دکھ) اور وصال (سرخوشی) کا ذکر ایک نوع کے ناپختہ شعور کا غماز ہوتا ہے۔ یہ مضمون راجیش ریڈی کو بہت مرغوب ہے۔ اس نوع کے دو اشعار دیکھئے:

آپ کہتے ہیں جس کو خاموشی
ہم تو شاعر اسی زبان کے ہیں

جب تک میرے سخن کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں
میں نے بھی شاعری میں ہجر و وصال باندھے

میر تقی میر نے بہت پہلے کہا تھا، یاں وہی ہے جو اعتبار کیا، یعنی حقیقت ہمیشہ خود ساختہ ہوتی ہے جو ذہن انسانی کی سب سے طاقتور مظہر زبان کی رہین منت ہوتی ہے۔ یوان ناطق اپنے نطق کو بروئے کار لا کر کائنات میں خود فریبی کے نت نئے امکانات پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہ فعل عبث نہیں کہ یہی کائنات کا بنیادی رمز ہے:

بنانے پڑتے ہیں پہلے سراب صحرا میں
پھر ان سرابوں سے دریا بہانا پڑتا ہے

سراب، صحرا اور دریا مماثلت اور تضاد کے رشتے میں باہمی منسلک ہیں۔ سراب تو Unreal ہوتا ہے جو اپنی موجودگی کا بھرم پیدا کرتا ہے مگر صحرا اور دریا جن کے جسمانی وجود کا ادراک کیا جا سکتا ہے، اصلاً یہ بھی بے معنی کائنات کو بامعنی بنانے کی انسانی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان کا وجود سیال ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی کا التباس انسان اپنی شعوری کوششوں سے قائم کرتا ہے۔ صحرا کی شناخت سراب کے بغیر قائم نہیں ہوتی اور پھر ''سراب'' کو واقعتاً بہتے ہوئے پانی کی صورت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے افزونی التباس ہی کائنات کی اساس ہے جسے ہم مسلمہ صداقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ راجیش ریڈی نے باور کرایا ہے فن بھی التباس حقیقت کی ایک شکل ہے اور اس کی مقبولیت کا جواز بھی یہی ہے۔

ماضی اور مستقبل انسان کی سب سے محفوظ جذباتی پناہ گاہیں ہیں خصوصاً ماضی اور دراصل ماضی نہیں بلکہ ماضی تمنائی۔ انسان ماضی تمنائی کو اپنا مستقبل سمجھنے کے سحر میں گرفتار رہتا ہے اور لمحۂ موجود کبھی اس کی مکمل توجہ کا ہدف نہیں بنتا۔ ماضی میں گم رہنا یا مستقبل میں الجھنے کا اصل سبب یہ ہے کہ حال ہمیشہ بے مایہ نظر آتا ہے۔ یہ عام انسانی مشاہدہ ہے۔ راجیش ریڈی کے نزدیک یہ التباس حقیقت کی بدترین شکل ہے کہ اس کے باعث انسان اپنے انفرادی تشخص سے عاری ہوتا چلا جاتا ہے، بالکل نادانستہ طور پر:

ماضی میں کبھی گم کبھی آئندہ میں الجھا
میں لمحۂ موجود میں موجود کہاں تھا

اظہار کا عمل اختیاری یا شعوری نہیں ہوتا کہ زبان پہلے سے موجود کسی حقیقت یا تجربے کو بیان نہیں کرتی بلکہ بیان ہی سے حقیقت کا رویا خلق کرتی ہے۔ لہٰذا یہاں سچ، جھوٹ اور کہنے اور نہ کہنے کا فرق بے معنی ہو جاتا ہے۔ کسی بات کو مخفی رکھنے یا اس کا اظہار نہ کرنے کی کوشش کا نتیجہ قطعی مختلف ہوتا ہے اور اخفا اظہار کو بالکل Upstage کر دیتا ہے۔ یہی فنکاری ہے۔ راجیش ریڈی کے درج ذیل اشعار شاعرانہ تعلّی بلکہ فن کے مقصود اولین کو نشان زد کرتے ہیں:

جو بات میں کہتا نہیں، کہہ جاتا ہوں وہ بھی
میں اپنے سخن میں وہ ہنر رکھے ہوئے ہوں

یہ تبسم ہے مرے شعر کا پہلا مصرع
تبصرہ کیجیے گا مصرعۂ ثانی سن کر

دوسرے شعر میں انسانی سرشت میں مضمور تعجیل پسندی کو طنزیہ پیرایہ بیان عطا کیا گیا ہے۔

راجیش ریڈی سمعی ذریعہ ترسیل (ریڈیو) سے ایک طویل عرصہ تک وابستہ رہے لہٰذا Spoken Word اور اس کے انسلاکات سے کما حقہ واقفیت نے ان کے شعری آہنگ کی تشکیل میں اساسی کردار ادا کیا ہے۔ مطبوعہ لفظ (printed Word) کے برعکس بولے گئے لفظ (Spoken Word) کی امتیازی صفت برجستگی اور تصنع سے یکسر عاری ہونا ہے۔ بول چال کی زبان جاں گسل احساسات کی ترسیل سکہ بند الفاظ سے کہیں بہتر انداز میں کرتی ہے غزل کی لفظیات رسمی اور پرشکوہ الفاظ سے مرتب اور متشکل ہوتی ہے مگر راجیش ریڈی غزل کے اس مروجہ پیرائیہ بیان سے ایک خوشگوار نکتہ انحراف کی خبر دیتے ہیں۔ ہجر آسا عاشق کی صعوبتوں کا ذکر اردو شاعری کا پامال موضوع ہے مگر راجیش ریڈی نے اس حکایت دل پذیر کے گہرے نقوش مرتسم کرنے کے لیے مرصع تراکیب اور طوالی اضافت سے گریز کیا ہے۔ ''یہاں''، ''وہاں''، ''کتنے''، ''کہاں''، ''کیسے'' احساسات کی ایک پیچیدہ دنیا آباد کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں راجیش ریڈی کا ایک مشہور مطلع ملاحظہ کریں:

اب کیا بتائیں ٹوٹے ہیں کتنے، کہاں سے ہم
خود کو سمیٹتے ہیں یہاں سے، وہاں سے ہم

یہاں وہاں تعینات میں اسیر نہیں ہیں۔ یہ جزو بھی ہیں اور کُل بھی، لہٰذا اس ہمہ گیر اور بے شناخت اندوہ کی شدت کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے کسی استعارے یا تشبیہہ یا بصری یا سمعی پیکر میں ملفوف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ''یہاں'' ''وہاں'' کی نوعیت بھی غیر زمانی ہے۔ لہٰذا سمیٹنے کے عمل کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ راجیش ریڈی نے روایتی مفہوم کو ایک وسیع تر حسی سیاق عطا کیا ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر بھی لائق توجہ ہے:

ملتے نہیں ہیں اپنی کہانی میں ہم کہیں
غائب ہوئے ہیں جب سے تری داستاں سے ہم

انسان رفاقت اور موانست کا خواہاں رہتا ہے اور یہی ایک مرکزی حوالہ اس کی شخصیت کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ جب یہ رشتہ مودت منقطع ہو جائے تو پھر انسان خود اپنی پہچان سے محروم ہو جاتا ہے۔ شعر میں کہانی اور داستان کے مابین فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ کہانی خود تشکیل کردہ یا خود ساختہ ہوتی ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے واقعے یا تجربے سے ہوتا ہے جو حواس پر وارد ہوتا ہے مگر داستان کبھی ذاتی تجربے کو منعکس نہیں کرتی۔ اس کا تعلق سماعت سے ہوتا ہے۔ حواس انسانی کا محرک اولین جذبہ اشتراک اور اتحاد ہے اس کے معدوم ہونے سے زندگی پارہ پارہ ہو جاتی ہے جس کی خیال انگیز توجیہ مذکورہ شعر میں کی گئی ہے۔

راجیش ریڈی زبان و بیان کے فنی نکات سے بخوبی واقف ہیں اور انہوں نے لفظی و معنوی رعایتوں کو فنی شعور کے ساتھ استعمال کیا۔ ''دل'' اور ''جی'' بظاہر ہم معنی الفاظ ہیں مگر مومن نے اپنی مشہور غزل کے ایک شعر میں دل میں ٹھاننے اور ''جی'' سے ناچار ہونے کا ذکر کر کے ان کے مابین لطیف فرق کو واضح کیا ہے۔ راجیش ریڈی نے ''جان'' اور ''جی'' کے استعمال سے کائنات کی ازلی خرابی یا کمی کو مرکز نگاہ بنایا ہے:

کوئی کمی تو ہے اس کائنات میں یارب
جان لگ گئی ہو پھر بھی نہ جی لگا میرا

کسی سرگرمی میں پوری طرح منہمک ہونے کے باوجود اس سے تعلق خاطر قائم نہ ہونا ایک ایسی ذہنی صورت حال ہے جس سے ہر حساس انسان دوچار ہوتا ہے۔ راجیش ریڈی کے بعض اشعار جذباتی تعینات کی بھی نفی کرتے ہیں کہ یہ معاشرتی جبر کے تئیں شاعر کی بے اطمینانی اور برگشتگی کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً:

جیت سے پہلے مری ہار کی توہین نہ ہو
ہارنے کا مرے اعلان تو ہو لینے دو

تمام عمر اسی اک مکاں میں رہنا پڑا
وہ جس مکان کو ہر پل رہا مکیں سے گریز

حیرت ہوتی ہے کہ راجیش ریڈی مشاعروں (جہاں Stock Response کی شاعری پر بے محابا داد ملتی ہے) میں بھی گہرے انسانی سروکاروں کو جذباتی خروش کے بغیر پیش کرتے ہیں اور اکثر مشکل ردیف و قوافی بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں جن کی ردیف کم کم بہت ہی کم، رکھے ہوئے ہوں، کے بعد، باندھے، سے گریز، کے نکلے، تو ہو لینے دو، بغیر بھی وغیرہ شاعر کی فنی ہنرمندی اور سہولت اظہار پر ماہرانہ دسترس کی غماز ہیں۔ راجیش ریڈی کی شاعری پامال موضوعات کو ایک نیا حسّی سیاق عطا کرنے اور انہیں ایک متحرک حسی تجربے کے طور پر پیش کرنے کا ایک نیا محاورہ قائم کرتی ہے جو معاصر اردو شاعری کو تازہ ہوا سے معطر کرتی ہے۔

- بقیہ -

براہِ راست

☆☆ آپ جو ناچیز کو اتنا مان دے رہے ہیں اس کے لئے میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں، ممنون ہوں ان سب چاہنے والوں کا جو میری شاعری سے اتنی محبت کرتے ہیں، میرے کلام کو اتنی عزت بخشتے ہیں، میں پھر کہوں گا کہ یہ میں نہیں کہہ رہا کوئی ہے جو مجھ سے یہ کام لے رہا ہے۔ اور جب میں نے یہ جان لیا ہے کہ کوئی اور مجھ سے کام لے رہا ہے تو میرے حق میں یہی مناسب ہے کہ میں یہی کام کرتا رہوں، یہی میرا منصوبہ ہے، یہی میرا ارادہ ہے۔

☆ ترقی اور مسابقت کی دوڑ میں اردو زبان و ادب اور شاعری کے مطلوبہ مقام حاصل نہ کرنے کی وجوہات آپ کے خیال میں کیا ہیں اور پوسٹ کرونا ورلڈ میں کیا ہو سکتی ہیں؟

☆☆ اردو زبان و ادب کے حوالے سے آپ نے جو سوال پوچھا اس کا جواب پیچیدہ بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اردو دنیا کی شاید واحد زبان ہے جو جتنی تیزی سے مقبول ہو رہی ہے اتنی ہی تیزی سے اس کی اسکرپٹ کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے، یہ بات میں انڈیا کے حوالے سے کر رہا ہوں۔ یہاں اردو ادب اور زبان کے چاہنے والے لگا تار بڑھ رہے ۸۷ ہیں لیکن اردو اسکرپٹ لکھنے، پڑھنے والے کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو یہاں دل کی زبان ہے لیکن ضرورت کی زبان انگلش اور ہندی ہے، اردو ادب کے دیوانے بھی منٹو، عصمت چغتائی، انتظار حسین کا کام ہندی میں پڑھ لیتے ہیں، اردو شاعری دیوناگری میں ہندی کویتاؤں سے زیادہ بکتی ہیں، مارکیٹ اور ضرورت کے دباؤ کے چلتے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے والے پیرنٹس بھی اپنے بچوں کو اردو سکھانا ضروری نہیں سمجھتے، لیکن ان سب کے باوجود اردو ادب کا پرچم لہرا رہا ہے۔ کورونا سے پہلے ورلڈ میں سوشل میڈیا ہی ایکٹیو تھا اور اس ایکٹی ویٹی میں اردو شاعری، فیس بک، ٹویٹر اور آن لائن مشاعروں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتی رہی۔ تو مسئلہ اردو ادب کا نہیں، اسکرپٹ ہے انڈیا میں۔

تخلیقی شاعری کے روشن دستخط

ڈاکٹر رونق شہری
(دھن باد)

راجیش ریڈی کوتقریباً ۴۰ برسوں سے میں پڑھ رہا ہوں۔ یہ عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں مشاہدہ مطالعے پر حاوی ہونے کی صورتِ حال کو بیان کرتا ہے۔ ساٹھ کے دہے میں جب جدیدیت کا غلبہ قائم ہوا تو کئی ترقی پسند شعرا بھی سینگ کٹا کر بچھڑے میں شمار ہو گئے۔ راجیش ریڈی نے جس وقت شاعری شروع کی وہ زمانہ بھی جدیدیت کا تھا لیکن انہوں نے ابہام و اہمال کی شاعری سے دانستہ پرہیز کرتے ہوئے ترسیل کی ناکامی کا نہ صرف برملا اظہار کیا بلکہ اپنے لیے ایک ایسی تخلیقی فضا سے ہم آہنگ شاعرانہ طبیعت کو خلق کیا جس کے وہ لاشعوری طور پر متلاشی تھے۔ راجیش ریڈی شروع سے ہی انکشافِ ذات کے لیے شاعری کو فنونِ لطیفہ کی ایک نفیس چادر قناعت سے ڈھکنے کا اہتمام کرتے رہے ہیں۔ ان کے یہاں لفظ و معنی کے بیچ تصادم نہیں بلکہ ہم آہنگی کا عُنصر شروع سے ہی موجود رہا ہے۔ یہ جدیدیت کی لہر شانت ہونے کے بعد فوری طور پر ابھرنے والے شاعروں میں ہے۔ اس عہد کے شعراء کے یہاں اسلوب اور لہجے کی سطح پر نظم و ضبط کا خوشگوار سنگم دیکھنے کو ملتا ہے۔ راجیش ریڈی نے اپنے پیش روؤں کی تخلیقات کو پڑھا بھی ہے اور سمجھا بھی ہے لیکن اپنے عہد کے غالب فکری رویوں کو ہی تعینِ قدر کے لیے ذمہ دار سمجھا ہے۔ اچھی اور سچّی شاعری کے جو پارکھ ہیں وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ نئی شاعری (جدیدیت نہیں) کے معتبر شعراء میں راجیش ریڈی کا مقام کتنا ارفع و اعلیٰ ہے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ راجیش ریڈی کی پر مغز شاعری سے میں کافی متاثر ہوں۔ ابتدائی چند سطور ان کی شاعری سے متعلق تمہید کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

راجیش ریڈی کی شاعری کا وزن تلاش کرنے سے پہلے ان کے سوانحی خاکے کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ بطور انسان/ آدمی زندگی کرنے کی محو میں کس حد تک سماج اور معاشرے کے لیے ذمہ دار اور اپنے لیے مخلص رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک جدوجہد بھری زندگی کا تصوّر ذہن میں نہ ہو تب تک شاعر کا ذات و کائنات کے تئیں مثبت و منفی رویے کے لیے ذمہ دار وجود کی تلاش بے معنی ہو سکتی ہے۔ راجیش ریڈی میرے ہم عصر ہیں میں ان کا ہم سر ہوں کہ نہیں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن عمرِ طبعی کے اعتبار سے ہم عمر ہونے کے باوصف اچھی بُری شاعری کی تمیز دونوں کو ہے۔ ہم دونوں میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ مشاہدے کی لازوال قوت نے دونوں کو زندگی آمیز شاعرانہ رویوں کو برتنے میں اہم رول ادا کیا۔ لوگ کہیں گے میں راجیش ریڈی کے بیچ کہاں سے آ گیا تو اس ضمن میں عرض ہے کہ بعض معاملاتِ زندگی ایسے ہوتے ہیں جن میں مشترک مشاغل اپنائے جانے کے درمیان دشواریاں بھی ایک جیسی ہو کر سامنے آتی ہیں۔ اور یہ محض حسن اتفاق نہیں ہے کہ راجیش ریڈی کی غزلیہ شاعری میں زمان و مکاں کے بعض اہم غالب رویے بھی یکساں طور پر میری شاعری کے بھی مقبول منظر نامے پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہاں تقابلی جائزہ مقصود نہیں کہ اس سے خودستائی کا پہلو بھی نکل سکتا ہے۔ میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ راجیش ریڈی اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں۔ اپنی اثر انگیز شاعری کی بدولت یہ عالمی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ بیرونِ ملک بھی ان کی غزلوں کے بے شمار سامعین و قارئین موجود ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو ممبئی کے اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہونے والے راجیش ریڈی ہندو پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں تواتر سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق علمی گھرانے سے ہے اس لیے سیکولر ذہن ہونے کے باوصف شاعری میں محزونی کیفیت بیان کرنے کا ایک الگ ہی انداز ہے کہ ان کے یہاں بھاری بھرکم فارسی آمیزی نہیں ہے اس کے باوجود یہ گرے پڑے الفاظ اٹھا کر نئے مضامین باندھنے کی شعوری کوشش کا ڈرامہ نہیں کرتے۔ جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ شاعری زندگی کی نقالی ہے تو شاعری فنونِ لطیفہ کی سب سے دلچسپ کاریگری بن کر سامنے آتی ہے۔ انگریزی میں کاریگری کے لیے لفظ Craftmanship استعمال ہوتا ہے، اس سے بہتر دوسرا متبادل آ بھی نہیں سکتا۔ راجیش ریڈی کے یہاں مضمون آفرینی کے لیے لاشعور کی سطح سے آواز ابھرنے پر ہی فکری و فنی کاریگری کا عملاً اظہار یہ سامنے آتا ہے۔ یہ شعری عمل اتنا آسان بھی نہیں ہے اس لیے کہ شاعر کا ذہن ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ یہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بہت دور نکل جاتا ہے۔ اس کے لیے چونکہ مراجعت کا سلیقہ بھی چاہیے۔ سو راجیش ریڈی اس پیش رفت اور مراجعت کے بیچ تیسری راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

تیسری راہ سے مراد معینہ راستے سے ہٹ کر تلاش و جستجو کے عمل کا بامعنی ہونا ہے۔ اس پس منظر میں ان کے چند متفرق اشعار دیکھئے۔

کسی دن زندگانی میں کرشمہ کیوں نہیں ہوتا
میں ہر دن جاگ تو جاتا ہوں زندہ کیوں نہیں ہوتا

شام کو جس وقت خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں میں
مسکرا دیتے ہیں بچے اور مر جاتا ہوں میں

یوں دیکھئے تو آندھی میں بس اک شجر گیا
لیکن نہ جانے کتنے پرندوں کا گھر گیا

جتنی بنی تھی بٹ چکی یہ زمیں
اب تو بس آسمان باقی ہے

سر قلم ہونگے کل یہاں ان کے
جن کے منہ میں زبان باقی ہے

دل بھی اک ضد پہ اڑا ہے کسی بچّے کی طرح
یا تو سب کچھ ہی اسے چاہیے یا کچھ بھی نہیں

ساری شکایتیں ترے لہجے سے ہے مجھے
لفظوں پہ اعتراض تو کر ہی نہیں رہا

میری آنکھیں یہ کہا کرتی ہے اکثر مجھ سے
آپ دیکھی ہوئی چیزوں کو بہت دیکھتے ہیں

غم چھپانے کے سو طریقوں میں
مسکرانا ہی سب سے مشکل ہے

مرے دل کے کسی کونے میں اک معصوم سا بچہ
بڑوں کی دیکھ کر دنیا بڑا ہونے سے ڈرتا ہے

یہ دو اشعار ایسے ہیں جنھیں گنگنانے کے لیے بھی ایسی ہی سنگین صورت حال کے انکشاف کا جوش وجذبہ چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان اشعار کو راجیش ریڈی نے جوش میں آ کر نہیں بلکہ جذبہ ترحم کو اپنا کر پیش کیا ہے:

صبح ہوتے ہی ہوا محسوس یہ
دوسرے دن کے لیے زندہ ہوا

حسن نظامی کا یہ شعر وجود کی رائیگانی اور اس کی ماتم پُرسی کے لیے جو ٹریجڈی بیان ہوئی ہے وہ دلدوز ہے۔ لیکن راجیش ریڈی کا شعری ٹریٹمنٹ کچھ الگ اور منفرد نوعیت کا ہے۔ یہ شعر میٹروپولیٹن شہر کی مصروف ترین زندگی کے المیے کی تاثیر انگیزی سے عبارت ہے۔ دوسرے شعر میں دن بھر کی مصروفیت سے فرصت پا کر جب شاعر گھر بیٹھتا ہے تو خالی ہاتھ دیکھ بچے کی طنزیہ مسکراہٹ کاٹ لیتی ہے۔

تیسرے شعر میں آندھی میں اک شجر کرنے کا المیہ بیان ہوا ہے لیکن اس کے گرنے سے ہونے والے نقصان آئندہ پر بھی شاعر کی نظر ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کا شعری انہماک غضب کا ہے۔ آج کی شاعری بھی اسی طرز پیشکش کی متقاضی ہے کہ ایک منظر سوچنا ہے اور ساتھ ہی ایک منظر دیکھنا بھی ہے۔ میں نے پہلے بھی اس ضمن میں کہا تھا کہ راجیش ریڈی کی شاعری Multi Dimention ہے۔

اب چوتھے شعر کی طرف دھیان مرکوز کرتا ہوں کہ زمین کی تقسیم کا المیہ کس حد تک غریبِ شہر کی لامکانی کو منعکس کرتا رہا ہے۔ راجیش ریڈی بھی میٹروپولیٹن شہر ممبئی میں بود و باش اختیار کرتے ہیں اور اس شہر کے مسئلے سے بنیادی طور پر واقف ہیں۔ اس لیے ان کی نوکِ قلم سے ان نوع کا شعر نکلتا ہے

جتنی بٹنی تھی بٹ چکی ہے زمیں
اب تو بس آسمان باقی ہے

خاکسار نے زمین و آسمان کی تقسیم سے پیدا شدہ بحران کو دس برس پہلے اپنی غزل میں یوں پیش کیا تھا:

زمیں سے پہلے ہی آکاش بٹ گیا رونق
تصرفات کے جھگڑے وہی پرانے ہیں

برسبیلِ تذکرہ یہ شعر پیش کر رہا ہوں ورنہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی:

پانچویں شعر میں آواز کی سرکوبی کرنے کی بین الاقوامی سازشوں کے خلاف احتجاج بلند کرنے والا یہ شعر ازبر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے:

سر قلم ہونگے کل یہاں ان کے
جن کے منہ میں زبان باقی ہے

اس شعر میں بے ساختگی بھی ہے اور مظلوموں کے دل کی زبان بھی ہے راجیش ریڈی کے یہاں فکر و احساس کے بیچ بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ دماغ سائنٹفک سوچ کا مظہر ہے اور دل احساسِ جمالیات کا عکاس۔ ان دونوں کیفیات کو برتنے میں انہیں دشواری نہیں ہوتی کہ خیال کا منصب ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اس کو بہت عمدہ شعری زبان عطا کی گئی ہے:

دل بھی ایک ضد پہ اڑا ہے کسی بچّے کی طرح
یا تو سب کچھ ہی اسے چاہیے یا کچھ بھی نہیں

احتجاج و انحراف نئی شاعری کا فکری حسن ہے اس بات کو راجیش ریڈی نے بہت سلیقے سے پیش کیا ہے:

ساری شکایتیں ترے لہجے سے ہے مجھے
لفظوں پہ اعتراض تو کر ہی نہیں رہا

راجیش ریڈی کا یہ لہجہ متعدد شعراء کے بیچ امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ اسی نوع کے اشعار ان کی شناخت میں معاون ہوئے ہیں۔ نئی شاعری میں تہی دستی سے کہیں زیادہ آنکھ کی تہی منظری ایک اہم فکری رویہ بن کر ابھری ہے۔ یہ الگ بات کہ بقدرِ پیمانہ تخیل ہے۔ راجیش ریڈی کی انفرادیت دیکھئے:

میری آنکھیں یہ کہا کرتی ہیں اکثر مجھ سے
آپ دیکھی ہوئی چیزوں کو بہت دیکھتے ہیں

نئی غزل کے منظر نامے میں اس طرح کے اشعار خال خال ہی نظر آتے ہیں ایسا اس لیے ہے کہ خواہش کے ابھرنے پر سامنے کا منظر ڈوبنے لگتا ہے پھر شاعر اپنے اندر غرقاب ہونے لگتا ہے۔ غور و فکر کا یہ سلسلہ خود احتسابی کے عمل سے گزرنے تک باقی رہتا ہے۔

راجیش ریڈی بھاری بھرکم فارسی تراکیب کا استعمال نہیں کرتے ہیں سامنے کے الفاظ سے در منظر کھولتے بھی ہیں اور مقفل بھی کرتے ہیں یہ سلیقہ کسی سینئر شاعر کی پیروی کا نتیجہ نہیں بلکہ مسلسل ریاضتِ فن سے حاصل ہوا ہے۔

متفرق اشعار میں یہ شعر دیکھئے:

غم چھپانے کے سو طریقوں میں
مسکرانا ہی سب سے مشکل ہے

راجیش ریڈی کے اس شعر میں غضب کا Pathos ہے۔اس شعر میں مملکتِ غم کی شہزادی زہرخنداں مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی ہے۔

آج کے عہدِ صارفیت میں معصوم ذہنیت کس طرح سوچتی ہے اس کا برملا اظہار اس شعر میں ہوا ہے۔ بچے کے تصور کا آسمان وسیع نہ ہو کر خوف کی حدّت سے سمٹا سمٹا نظر آتا ہے۔

مرے دل کے کسی کونے میں اک معصوم سا بچہ
بڑوں کی دیکھ کر دنیا بڑا ہونے سے ڈرتا ہے

راجیش ریڈی کے یہاں کفایت لفظی کا ایک ضوفشاں روپ تکرارِ لفظی کی صنعت سے عبارت ہے۔دوسرے مصرعے میں لفظ بڑا دو بار آیا ہے اور دونوں الفاظ مختلف Shades کو اجاگر کرتے ہیں۔

انہوں نے مجھے متعدد غزلیں فراہم کی ہیں۔کاش ان کا کوئی شعری مجموعہ میرے پیش نظر ہوتا۔جو غزلیں انہوں نے فراہم کی ہیں ان میں اپنی پسند کے اشعار درج کرنے کی کوشش کرتا ہوں:

اترے گا کہاں قبر میں یہ جسم اکیلا
اس جسم کے ساتھ اترے گا مر جانے کا ڈر بھی

لیے جاتی تھی بے چینی فلک پر
سکون کے ساتھ اب زیرِ زمیں ہوں

سکوں تو دیکھئے بجھتے ہی جا رہے ہیں دیے
ہوا کے سر کوئی الزام بھی نہیں آتا

کوئی کمی تو ہے اس کائنات میں یارب
کہ جان لگ گئی پھر بھی نہ جی لگا میرا

خدا کا شکر اک دوری بنائے رکھی دنیا سے
کرم اس کا ہوا ہم رائیگاں کم کم بہت ہی کم

آنکھوں میں خواب آتے ہیں آتی نہیں ہے نیند
مدت سے مسئلہ یہ عجب ہے ہمارے ساتھ

گھر سے چلے تھے دل میں کیا کیا خیال باندھے
لوٹے تری گلی سے کیا کیا ملال باندھے

خواب سے باہر نکل آنے کی ناچاری کے بعد
دیکھنا آساں نہیں دنیا کو بیداری کے بعد

جب بھی ہاتھوں میں تیرا ہاتھ آیا
میں نے محسوس کر لیا خود کو

میں داستاں میں اس کی جہاں جہاں بھی رہا
سُنا رہا ہے وہ کر کے وہیں وہیں سے گریز

زندگی !باہری جنگوں میں نہ اُلجھا مجھ کو
ختم اندر کا یہ گھمسان تو ہو لینے دے

سب کے لیے کنارے پہ ہوتا نہیں کوئی
کچھ لوگ ڈوبتے ہیں کنارے بغیر بھی

محولہ گیارہ اشعار کی شانِ نزول پر دھیان مرتکز کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ راجیش ریڈی کی فکر کی تہ داری میں ڈوبنے کے لیے کسی مبصّر یا ناقد کو شاعر کو درپیش مسائل کی شدت سے روبرو ہونا لازمی ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں فکر کے انعکاس کا جو ذریعہ فراہم کیا ہے وہ عہد بہ عہد تغیر پذیر صورتِ حال کا مظہر ہے۔ اس میں شاعر کی اپنی کتنی شمولیت ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ یہ خود تماشا بھی ہے اور تماشائی بھی۔بقول شاعر:

خود ہمیں تماشا ہیں خود ہمیں تماشائی
کھیل ختم ہوتے ہی ورنہ اپنے گھر جاتے

موجودہ شعر منظر نامے میں راجیش ریڈی کسی جذبہ ترحم کا حوالہ دے کر لوگوں کا دھیان مبذول نہیں کرتے بلکہ تہ در تہ ڈوب کر بھی لہجے میں ایک مخصوص قسم کی تیزابی کیفیت سے گزرنے کا احساس دلاتے ہیں۔منقولہ گیارہ اشعار میں جہاں سیاسی، تہذیبی، ادبی، ثقافتی، سماجی بحران کا راست اظہار موجود نہیں ہے پھر بھی اپنی بات جو کہنا چاہتے ہیں وہ مختلف شعری جہات (Dimension) کو ایک ساتھ Cover کرنے میں کامیاب ہیں۔شاعری میں جب تک تجسس کرید بے چینی کے عناصر نہ ہوں اعلیٰ مرتبت نہیں ہو سکتی۔ان کی شاعری میں جو بے چینی ہے وہ کم وبیش سب جگہ یکساں ہے۔سب جگہ سے مراد عشقِ زندگی میں عروج وزوال سے گذرنے کے دوران لاحاصلی سے پیدا شدہ اظہار میں شدت انگیزی سے ہے۔

راجیش ریڈی کے یہاں نئے نئے تلازمے غزل میں دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں جیسے بے چینی کا فلک پر پہنچانے کی کوشش پر زیرِ زمیں آ کر شانت ہونا، چراغوں کے بجھنے کے باوجود ہواؤں کے سر الزام نہ آنا، جان لگنے کے باوجود دنیا سے جی کا نہ لگنا، دنیا سے دوری بنانے رکھنے کے سبب رائیگانی کا کم کم احساس ہونا، نیند کی جگہ صرف خواب آنا، گھر سے خوش فہم ہو کر کیا کیا خیال باندھنے اور گلی سے لوٹنے کے بعد ملال باندھنے، ناچاری کے بعد خواب سے باہر نکل آنے اور بیداری کے بعد دنیا کو دیکھنے میں دشواری پیدا ہونا ہاتھوں میں کسی کا بازو آنے کے بعد خود کو محسوس کرنا، راوی کی داستان میں جہاں جہاں ذکر مقصود تھا وہیں داستان گو کا گریز کرنا، زندگی سے براہِ راست مخاطبے میں اُکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے ذات کے اندر گھمسان کا تذکرہ کرنا سب کے لیے کنارے پر کوئی ہو یہ ضروری نہیں اس لیے کہ کچھ لوگ کنارے بغیر بھی ڈوبتے ہیں۔اس سمت متوجہ کرنا، کچھ ایسی نادر معنوی تراکیب ہیں جسے اردو شاعری میں غالباً پہلی بار برتا گیا ہے۔راجیش ریڈی کے یہاں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شعر مکمل کرنے کے لیے فہم فراست کے در چہار سمت کھُلے رکھتے ہیں۔ان کی فکر پر کوئی غالب رویہ حاوی ہو کر شعر کے اندازِ گفتنی کو منفرد کر دیتا ہے۔

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ کیجیے

طلسمِ کائنات

رفیع رضا
(کینیڈا)

شاعری پر کسی تمہید کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیئے تاہم کسی شاعر کی شاعری کا لُبِ لباب آخر کیا ہے؟ اسکے لئے لازمی تمہید کی ضرورت درکار ہے اور یہ سوال سب سے پہلے میں نے ہی اُٹھایا تھا۔ کیونکہ خود بطور شاعر یا ناقد مجھے شعر کہنے سمجھنے پر کہنے درستی تجویز کرنے کا وسیع تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ اب میں خود کو اس مقام پر سمجھتا ہُوں جس پر ظفر اقبال خود کو سمجھتے ہیں لیکن میں اُن سے مختلف اِس لئے ہُوں کہ میں اپنے دعوے کا ثبوت دلیل و مواد سے پیش بھی کرتا ہُوں، ذاتی پسند کو بیچ میں نہیں لاتا۔

ہوتا یوں رہا ہے کہ کسی بھی شاعر پر کوئی مضمون تحریر کرنے میں کسی بھی مشہور ناقد و پروفیسران کو کبھی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ وُہ کٹ پیسٹ سے ہی کام چلاتے ہیں۔ ہر شاعر انوکھا، اپنا خاص لہجہ رکھتا ہے، جدت طرازی ہے کلاسیکی سے بھی جُڑا ہے۔ زمینی حقیقتوں سے واقف ہے وغیرہ۔۔ جیسے فقرے ہر شاعر پر لاگو کر دیئے جاتے رہے ہیں۔

اس لئے میں صرف واقعی انوکھے شعرا پر لکھنے کی کوشش کرتا ہُوں۔

راجیش ریڈی اِسلئے انوکھے نہیں کہ اور بھی بہت سے شعرا و ناقدین نے انکے تعریف کی ہے، بلکہ وُہ اس لئے انوکھے ہیں کہ انڈیا کی کُل مشاعراتی شاعری میں تین نام ایسے ہیں جنکو باقی جمگھٹے سے الگ کیا جاسکتا ہے۔

پہلا نام فرحت احساس کا ہے دوسرا نام راجیش ریڈی کا اور تیسرا نام پریت پال سنگھ بیتاب کا ہے۔

میرا ایمان بالکل ٹی ایس ایلیٹ جیسا ہے کہ شعر کو بیرونی جمالیاتی سطح پر پُرکشش ہونا پہلے لازم ہے، خیال کی گہرائی بعد کی بات ہے۔ جمالیاتی سطح بیرونی کرافٹ کی وہ سطح ہے جو پڑھتے ہی یا سنتے ہی قاری کو ساتھ لگا لیتی ہے۔ مصرع سے دیکھیں:

جانے کتنی اڑان باقی ہے

کیا پڑھتے ہی آپکا ذہن اس سوالیہ استفہامیہ خیال کے جواب کی طلب نہیں کرتا؟ بالضرور کرتا ہے۔ اسکے مقابل آپ کو مصرع دیتا ہوں:

فقط مال و زرِ دیوار و در اچھا نہیں لگتا

(عباس تابش)

میں سمجھتا ہُوں کہ مجھے کوئی خاص طلب نہیں ہوئی کہ میں آگے جاننے کی کوشش کروں کہ مزید شاعر کو کیا اچھا نہیں لگتا۔۔۔

کہنے سے یہ مراد ہے کہ پیشکاری میں سامع یا ناظر کو ساتھ لگا لیجانے والی بات نہ ہو تو شعر کجی کا شکار ہی ہوگا۔

راجیش ریڈی اپنے شعر میں جمالیاتی کشش کا اہتمام کر کے انوکھے خیال کی جانب قاری کو لاتے ہیں۔

جانے کتنی اڑان باقی ہے
اِس پرندے میں جان باقی ہے

(راجیش ریڈی)

اب وہ دنیا عجیب لگتی ہے
جس میں امن و امان باقی ہے

(راجیش ریڈی)

آپ اب ان اشعار پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے اشعار قافیے کے لئے نہیں لکھے گئے۔ یہ والا وصف، راجیش ریڈی کا تیسرا خاص وصف ہے اوپر پہلے دو وصف بیان کر چکا ہوں۔

اگلے شعر میں بھی وُہ انہیں اوصاف کو استعمال کرتے نظر آئے۔۔۔ وہ کہتے ہیں:

سر قلم ہوں گے کل یہاں اُنکے
جن کے مُنہ میں زبان باقی ہے

(راجیش ریڈی)

ان تین اشعار میں آج کا پاکستان، آج کا بھارت، آج کا عراق، آج کا کشمیر و افغانستان، غرض آج کا کُل جہان نظر آرہا ہے۔

حقیقی اور بڑا شاعر معاشرے کا وُہ فرد ہوتا ہے جو موجود اور امکان و مستقبل پر جذباتی، عقلی، وجدانی، محسوساتی نظر ڈالتا ہے۔

عام شعرا صرف زبان کے چٹخارے کے لئے شعر کہتے ہیں انکو بھی سامعین مل جاتے ہیں، بلکہ انکو زیادہ سامعین ملتے ہیں کیونکہ زرد صحافت کی طرح زرد ادب میں اردو ادب خود کفیل ہو چکا ہے۔ ظفر اقبال کے تتبع میں پاکستان کے ہزاروں شعرا کی شاعری اکٹھی کر دی جائے تو ہرگز کوئی نہیں بتا سکتا کہ کونسی غزل کس شاعر کی ہو سکتی ہے۔ انفرادو انوکھا پن ہی تو شاعر کی ادبی قدامت طے کرتا ہے۔

آیئے انکے خاص اشعار دیکھتے ہیں، ویسے یہ مشکل کام ہے کہ کونسے اشعار چھوڑ دیئے جائیں اس لئے بجائے ڈھونڈنے کے جو سامنے آرہے ہیں لکھ رہا ہُوں،، کیونکہ کثرت سے اعلیٰ اشعار موجود ہیں۔

کسی دن زندگانی میں کرشمہ کیوں نہیں ہوتا
میں ہر دن جاگ تو جاتا ہُوں زندہ کیوں نہیں ہوتا

شام کو جس وقت خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں میں
مسکرا دیتے ہیں بچے اور مر جاتا ہوں میں

یوں دیکھیے تو آندھی میں بس اک شجر گیا
لیکن نہ جانے کتنے پرندوں کا گھر گیا

مرے دل کے کسی کونے میں اک معصوم سا بچہ
بڑوں کی دیکھ کر دنیا بڑا ہونے سے ڈرتا ہے

جتنی بٹنی تھی بٹ چکی یہ زمیں
اب تو بس آسمان باقی ہے

دل بھی اک ضد پہ اڑا ہے کسی بچے کی طرح
یا تو سب کچھ ہی اِسے چاہئے یا کچھ بھی نہیں

ساری شکایتیں ترے لہجے سے ہیں مجھے
لفظوں پہ اعتراض تو کر ہی نہیں رہا

میری آنکھیں یہ کہا کرتی ہیں اکثر مجھ سے
آپ دیکھی ہوئی چیزوں کو بہت دیکھتے ہیں

لیکن ہماری آنکھوں نے کچھ اور کہہ دیا
کچھ اور کہتے رہ گئے اپنی زباں سے ہم

دنیا کو ریشہ۔ ریشہ اُدھیڑیں ، رفو کریں
آ بیٹھ تھوڑی دیر ذرا گفتگو کریں

لوگ طے کرتے ہیں کیا دیکھنا کیا کہنا ہے
میری آنکھیں نہیں میری، مرے لب میرے نہیں

ایک مدت سے میں سمجھائے چلا جاتا ہوں
دل مگر مانتا کب ہے کہ وہ اب میرے نہیں

بری ہونا ہے اب مشکل ہمارا
گواہی دے رہا ہے دل ہمارا

نہ رک پایا ہماری خودکشی تک
بہت عجلت میں تھا قاتل ہمارا

جب اپنے آپ میں ڈوبے تو جانا
ہمیں میں تھا کہیں ساحل ہمارا

ڈگر کرتے رہے اوروں کی آساں
سفر ہوتا رہا مشکل ہمارا

چونکہ ذاتی طور پر انہیں موسیقی سے لگاؤ ہے اس لئے وہ مترنم غزلیں خوب کہتے ہیں۔

ہم جی رہے ہیں جان ! تمہارے بغیر بھی
ہر دن گزر رہا ہے گزارے بغیر بھی
سب کے لئے کنارے پہ ہوتا نہیں کوئی
کچھ لوگ ڈوبتے ہیں پکارے بغیر بھی
آسان ہوگا مرنا سمجھ لیں جو ہم یہ بات
دنیا یوں ہی رہے گی ہمارے بغیر بھی
جیتے بغیر جیتنے والوں کے دور میں
کچھ لوگ ہار جاتے ہیں ہارے بغیر بھی
ایسے بھی ہیں جو ڈوب گئے دل کے ساتھ ساتھ
دریا میں اپنی ناؤ اتارے بغیر بھی
ہر حال میں بڑے ہی رہیں گے جو ہیں بڑے
وہ آسماں ہیں چاند ستارے بغیر بھی
یارب ! ہر اِک طلسم تری کائنات کا
کھلنے لگا ہے ہم پہ اشارے بغیر بھی

راجیش ریڈی کے ہاں نام نہاد مذہبی خدا سے مخاطبت کرتے بہت سے اشعار نظر آتے ہیں

دل کی تسکین کا سامان تو ہو لینے دے
اے خدا ! درد سے ہلکان تو ہو لینے دے
زندگی! باہری جنگوں میں نہ الجھا مجھ کو
ختم اندر کا یہ گھمسان تو ہو لینے دے

راہبر کو بھی کچھ اندازہ نہیں رستے کا
جانے کب پہنچیں گے منزل پہ یہ کب کے نکلے

پہلے تھا کوئی ساتھ نہ اب ہے ہمارے ساتھ
لے دے کے ایک رب تھا سو رب ہے ہمارے ساتھ

آپ نے غور کیا ہوگا کہ کسی بھی شعر میں مفرّس ترکیب نہیں جو قاری کو لسانی ثقالت میں اُلجھا دے اور یہ وہ اہم وصف ہے جسکے سبب ان کی شاعری پر

تنقیدی مضمون لکھتے ہوئے سخت دشواری ہوتی ہے۔وہ اتنی آسانی سے اور آسان زبان میں شعر کہنے پر کامل ہیں کہ ناقد کو شعر کی تفسیر و محاسن کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

ایک چیز جس پر میری نظر گئی وہ انکی انتخاب کردہ شعری بحور ہیں۔ راجیش ریڈی کثرت سے اور روانی سے، رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع نامی بحر کا استعمال کرتے ہیں۔۔۔جیسے:

ہم سمجھتے تھے کہ اب کہیں یہ، کب کے نکلے
نئے آنسو تو کسی پچھلے سبب کے نکلے
راہبر کو بھی کچھ اندازہ نہیں رستے کا
جانے کب پہنچیں گے منزل پہ یہ کب کے نکلے
اک ذرا دیر کو روشن ہوئی جن سے مری رات
چاند تارے وہ کسی اور کی شب کے نکلے
میں سمجھتا تھا کہ دشمن ہی مرے دشمن ہیں
یار دشمن تو مرے تم بھی غضب کے نکلے
عمر بھر جن کو عقیدوں نے لڑائے رکھّا
بعد مرنے کے وہ سب ایک ہی رب کے نکلے

انکی ایک غزل میں انکا انوکھا لہجہ نمایاں ہے جہاں راجیش ریڈی شعر کی زمین اور ردیف کو برتنے میں مشینی انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ قافئے کو لایا نہیں، خود آیا جیسا محسوس کروانے میں کامیاب ہوئے ہیں جبکہ مضامین فلسفیانہ بھی ہیں اور طنزیہ بھی جیسے:

میں داستان میں اس کی جہاں جہاں بھی رہا
سنا رہا ہے وہ کر کے وہیں وہیں سے گریز
تمام عمر ہمیں اُس مکاں میں رہنا پڑا
وہ جس مکان کو ہر پل رہا مکیں سے گریز
ملا کے ہاتھ ہی کیوں رک گئے گلے بھی ملو
بنے ہو دوست تو پھر کیوں ہو آستیں سے گریز
نہ کھلتے راز کبھی کائنات کے ہم پر
ہماری جستجو کرتی نہ گر یقیں سے گریز

اس سلیقے سے مَیں ہُوا برباد
مَیں نے لگنے نہ دی ہوا خود کو

یہاں مجھے، مَیں، کے دوبار استعمال پر تحفظات تھے لیکن غور کیا تو یہ کُھلا کہ دوسرے مصرع کا حُسن " اور زورداری۔۔مَیں۔۔۔کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اگر پہلے مصرعے کو بدل دیا جائے۔۔۔جیسے:

اس سلیقے سے ہو گیا برباد۔۔۔

تو ایسا کرنے سے قاری کا ذہن فوری شاعر کی طرف نہیں بلکہ تیسرے شخص کی جانب جائے گا۔اس لیے راجیش ریڈی نے درست سمجھا کہ۔۔ مَیں۔۔کا لفظ پہلے مصرعے میں بھی رہنے دیا

انکی ایک غزل کے یہ اشعار کتنے بھرپور ہیں غور کیجئے۔

خواب سے باہر نکل آنے کی لاچاری کے بعد
دیکھنا آساں نہیں دنیا کو بیداری کے بعد
ساری کی ساری اگر مل بھی گئی دنیا تجھے
یہ بتا تو کیا کرے گا ساری کی ساری کے بعد
بعد مدت کے تم آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا
کام آنکھوں کو ملا ہے کتنی بے کاری کے بعد
زندگی تو خیر آنی ہی نہ تھی ،آئی نہیں
موت بھی آئی تو آئی کتنی لاچاری کے بعد
سب کا بچپن لوٹ آیا اک نئی آمد کے ساتھ
گھر کا گھر شُتلا رہا ہے ایک کلکاری کے بعد

وہ جو اوپر ذکر کیا تھا کہ کلاسیک سے جُڑنا، تو راجیش کا کلاسیکی اردو شاعری سے جُڑنا اُس شاعر کا چربہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ اُن خیالات کی بندش والے الفاظ سے نئے خیالات نکالنے میں کامیاب ہوئے ہیں یہ انکا چھٹا خاص وصف ہے۔میں کہا کرتاہُوں کہ کسی کی زمین ہرگز نہیں لکھنا چاہئیے،، تا آنکہ ایسا لکھنے میں کامیاب ہوں کہ دوسری کی شاعری اور زمین بیکار ثابت ہو جائے۔لیکن آجکل یہ دستور عام ہے کہ دوست احباب کثرت سے ایک دوسرے کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی کی زمین میں لکھتے ہیں۔ میں اسے اردو طرزِ شاعری کا سرقہ کہوں گا کیونکہ آپ نے کسی کی شاعری کی زمین کا انتخاب ہی اسکے سرقے سے کیا ہے۔ پھر آپ قافئیے بھی وہی برتیں گے ردیف تو وہی ہے۔ پھر مضامین بھی وہی لائیں گے، جیسے ، دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے۔۔۔کو زیادہ سے زیادہ ، دلِ پاگل تجھے ہُوا کیا ہے۔۔۔دلِ شاعر تجھے ہُوا کیا ہے۔۔۔کہہ سکتے ہیں لیکن۔۔۔جو بھی کہیں گے اصل تو غالب کا سرقہ ہی کیا ہوگا۔

لیکن راجیش کے ہاں یہ وصف ہے کہ وہ انتہائی گیروں میں سے نہیں بلکہ دیکھے منظر میں کوئی اور رنگ اُنڈیل دیتے ہیں اور یہ مثال اس دعوے کو ثابت کرتی ہے۔

گھر سے چلے تھہ دل میں کیا کیا خیال باندہے
لوٹے تیری گلی سے سو سو ملال باندہے
تصویر میں اترنے والی کہاں ہے خوشبو
لفظوں میں کوئی کیسے تیرا جمال باندہے
ایسا لگا کہ جیسے دنیا ہی باندھ لی ہو
کچھ اس ادا سے اس نے زلفوں کے بال باندہے

بوسے کی بات ہنس کر ٹالی گئی تو ہم نے
پہلا جواب سن کر باقی سوال باندھے
سنتے ہیں آئینے نے ہم پر کمر کسی ہے
ہم بھی نکل پڑے ہیں تلوار ڈھال باندھے
سارے مسافروں کے رختِ سفر میں رب نے
ارمان انگنت اور گنتی کے سال باندھے
سستی چمک سے سارا بازار پٹ چکا تھا
ہم اک طرف کھڑے تھے گٹھڑی میں مال باندھے
جب تک مرے سخن کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں
میں نے بھی شاعری میں ہجر و وصال باندھے

راجیش ریڈی کا ایک شعر پڑھا تو اپنا ایک بہت پرانا شعر یاد آ گیا:

کچھ میری طبیعت میں شرارت بھی بہت ہے
کچھ رَہ پہ زمانہ مجھے آنے نہیں دیتا
(رفیع رضا)

راجیش ریڈی کہتے ہیں:

برباد مجھے کرنے پہ آمادہ ہے دنیا
خود میں بھی کہاں کوئی کسر رکھے ہوئے ہوں

حیرت انگیز طور پر میرا ایک شعر اور راجیش کا شعر ایک جیسے الفاظ کے باوجود بالکل مختلف خیالات رکھتا ہے۔۔

سَر رکھ کے رونے کی بھی جگہ کوئی دو مجھے
میّت کو دے رہے ہو جو کندھا، مَیں کیا کروں
(رفیع رضا)

کاندھا کوئی نہیں ہے کہ سر جس پہ رکھ سکیں
سارے کا سارا بوجھ ہمارا ہمیں پہ ہے
(راجیش ریڈی)

شاید اسی لئے ظفر اقبال کا خیال ہے کہ نوعِ انسانی کے احساسات و خیالات سب کے سب پہلے باندھے جا چکے ہیں۔۔۔اب پیشکاری ہی مختلف ہے لیکن راجیش ریڈی کے اشعار جو کلاسیکی غزل کی زمین میں ہیں۔۔۔ہم نے بھی اپنے دل سو سو خیال باندھے۔۔۔سے بہت مختلف خیالات پر مبنی ہیں اور پورا تغزل بھی رکھتے ہیں۔

آپ جب راجیش کا کلام پڑھیں گے تو آپکو مشکل ترین فلسفیانہ خیالات کے نتائج کا آسان ترین بیان پڑھنے کو ملے گا اور آپ کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ وحدت الوجود، یا وحدت الشہود اور نامی گرامی فلاسفر کی زندگیوں کا نچوڑ یہ ہی ملے گا۔

انسانی کاوش و مشاہدہ و تجربہ کی روز کی کاوش کے بعد وہ کہتے ہیں:

زندگی ایک پہیلی ہے پہیلی رہے گی
آپ الجھتے ہی چلے جائیں گے حل کرتے ہوئے
(راجیش ریڈی)

اور وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ مصنوعی یا جعلی منظر تخلیق نہیں کرتے جیسے مشہور شاعر عباس تابش کے ہاں ہوتے ہیں، جیسے:

ہم ہیں سُوکھے ہُوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

یعنی عباس تابش کو پوری زندگی گزار کر بھی یہ نہیں معلوم ہوا کہ پوری دنیا میں پرندے اور بگلے اور ہنس، موسموں کی تبدیلی کے ساتھ ہجرت اختیار کرتے ہیں وہ سوکھے تالابوں پر ہرگز ہرگز نہیں بیٹھتے،، اس لئے عباس تابش کی شاعری زندگی پر مبنی شاعری نہیں بلکہ بنائے گئے منظر پر مبنی شاعری ہے۔ ادھر راجیش کو ادراک ہے کہ وہ زندگی کے تجربات و مشاہدات کو بیان کرتے شاعر بنے وہ کہتے ہیں۔

زندگی ایک پہیلی ہے پہیلی رہے گی
آپ الجھتے ہی چلے جائیں گے حل کرتے ہوئے
ہم تو چھوڑیں گے نہیں تجھ پہ بھروسہ کرنا
تُو ہی تھک جائے گا شاید کبھی چہل کرتے ہوئے
ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہاتھوں سے کسی دن ہم بھی
کہیں تعمیر کوئی تاج محل کرتے ہوئے
زندگی ! شکریہ احسان ہے تیرا ہم پر
ہم سخنور ہوئے ہیں تجھ کو غزل کرتے ہوئے

مندرجہ بالا وصف انکی شاعری کا ساتواں اہم وصف ہے۔ انکی شاعری کا آٹھواں وصف، انکا شکست تسلیم کر لینا ہے۔ وہ میری طرح ازل تک لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے، وہ شکست تسلیم کرتے ہیں مگر سفلی مایوسی کا شکار نہیں ہوتے کہ جون ایلیا کی طرح بیمار ذہنی کو شعر بنانے کی کوشش کریں۔ جیسے کہ جون ایلیا نے کوئی 18 اشعار ایسے کہے جن میں خون تھوکنے کا ذکر ہے۔۔حتیٰ کہ خون تھوکا شرارت میں۔۔۔جیسی کراہت پر مبنی مصرعوں کا استعمال ہے۔ شاعری اعلیٰ احساسات پر مبنی خیالات کی پیشکاری کا نام ہے۔ میں کہا کرتا ہُوں کہ کوئی قصاب کبھی شاعر نہ ہُوا نہ ہوگا۔۔نہ کوئی جلاّد کبھی ہُوا نہ ہوگا۔ اسی لئے مجھ سے مسلسل طلب کی جاتی ہے کہ جون ایلیا پر تفصیلی مضمون لکھوں جو ضرور پیش کرونگا۔ کہ کیسے اور کیوں پاکستان جیسے جبری فوجی اور مذہبی ماحول سے فرار کی خواہش میں پابند جنسی پابندیوں کے شکار، جنسی فراوانی کی خواہش میں لتھڑے، معاشرے کے بعض بیمار نوجوانوں میں جون ایلیا کی شاعری کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی اور سماجی تجزیہ ضرور کروں گا۔ جبکہ ادھر راجیش ریڈی کہتے ہیں۔۔

سبق کے طور پہ کام آ رہے ہیں لوگوں کے
ہمارا رائیگاں ہونا بھی رائیگاں نہ گیا

سفر ہمیشہ ہی مشکل پسند آیا مجھے
جہاں پہنچنا تھا آسان میں وہاں نہ گیا
کسی سے اس نے بھی پوچھا نہ میرا حال احوال
سنانے میں بھی اسے اپنی داستاں نہ گیا
نہ قید کر سکا صیّاد جذبہ پرواز
پروں کو کھول کے بھی آنکھوں سے آسماں نہ گیا

بعض معاشروں کا مسلسل زوال اس لئے جاری رہتا ہے کہ وہاں کے لوگ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو عجز سے تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی کوتاہی کا الزام دوسروں پر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔تاہم راجیش کی شاعری کچھ اور طرح سے عجز تسلیم کرتی ہے:

سر بازار بھی خود دار ہوئے بیٹھے ہیں
ہم خود اپنے لئے دشوار ہوئے بیٹھے ہیں
وہ کسی اور کا بیمار ہوا ہے اور ہم
ایک بیمار کے بیمار ہوئے بیٹھے ہیں
موت ہی ’آئی ، ابھی آئی‘ کہے جا رہی ہے
ہم تو کب سے یہاں تیار ہوئے بیٹھے ہیں
جن کو رستے کی خبر ہے نہ پتہ منزل کا
قافلے کے وہی سالار ہوئے بیٹھے ہیں
کہیں پل بھر کے لئے بھی نہیں ٹکتی نظریں
جانے کس شئے کے طلب گار ہوئے بیٹھے ہیں
کوئی پوچھے تو سہی حال کہ اک مدت سے
درد آمادہ ٔ گفتار ہوئے بیٹھے ہیں
لوگ ڈرتے ہیں نہ ہونے کے تصور بھر سے
اور ہم ہونے سے بیزار ہوئے بیٹھے ہیں

- بقیہ -

تخلیقی شاعری کے روشن دستخط

اردو شاعری میں شعر ونغمہ کی اصطلاح بہت پہلے سے رائج ہے۔ان کی غزلوں میں کاٹتے لمحوں کا زہر نغمگی سے نکل جاتا ہے۔ ان کی مترنم بحر کی غزلوں کو جگجیت سنگھ، پنکج ادھاس، بلوینیدر سنگھ، طلعت عزیز، رجکمار رضوی چھایہ کانگولی جیسے مغنّیوں نے گایا ہے۔ انہوں نے غالب کی منتخب غزلوں کو موسیقی کا لباس عطا کیا ہے۔ یہ متعدد بین الاقوامی مشاعرے میں شرکت کر چکے ہیں ۔ امریکہ ،کینیڈا، دبئی، ابوظہبی، بحرین، ماریشس، عمان کویت میں ان کا کلام بہت پسند کیا گیا ہے۔ یہ ہندی میں پوسٹ گریجویٹ ہیں اس لیے اردو ہندی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ان کا ایک شعری مجموعہ ’’وجوذ‘‘ کے نام سے بہت پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ انڈو پاک کے مقتدر جرائد ورسائل میں ان کا کلام چار دہائی سے متواتر شائع ہو رہا ہے۔ سنجیدہ قارئین کا حلقہ ان کی شاعری کو نگاہِ پسندیدگی سے دیکھتا ہے۔

یہ آل انڈیا ریڈیو ممبئی سے اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ سروس کی نوعیت بھی شاعر و ادیب کے ذہنی ترفع میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، تعلقاتِ عامہ کی راہ وسیع کرتی ہے۔راجیش ریڈی کا اختراعی ذہن شاعری میں پابند استعاراتی نظام کے حصار کو توڑ کر آگے بڑھنے میں کامیاب ہوا ہے۔

میں ان کی مزید ادبی فتوحات کے لیے نیک خواہش کا اظہار کرتا ہوں۔

بقیہ : ہمارے عہد کے ایک اہم شاعر

یہ کیا ستم ہے جہاں چاہیں چیخ کر رونا
وہاں بھی قہقہہ ہم کو لگانا پڑتا ہے

یہ جو ضمیر ہے، سونے کا روگ ہے اسکو
اسے جھنجھوڑ کر ہر دن جگانا پڑتا ہے

کافی نہیں ہے تیری عبادت کا یہ ثبوت
سجدے کا اک نشان جو تیری جبیں پہ ہے

آپ ان ہاتھوں کی چاہیں تو تلاشی لے لیں
میرے ہاتھوں میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

مان کر کوئی دوسرا خودکو
دیتا رہتا ہوں، مشورہ خودکو

اس سلیقے سے میں ہوا برباد
میں نے لگنے نہ دی ہوا خود کو

کیا جانے کس جہاں میں ملے گا ہمیں سکوں
ناراض ہیں زمیں سے خفا آسماں سے ہم

لیکن ہماری آنکھوں نے کچھ اور کہہ دیا
کچھ اور کہتے رہ گئے اپنی زباں سے ہم

دعا کرتا ہوں، کہ راجیش ریڈی کو معیاری شاعری کی دنیا میں مزید مقبولیت کی بلندیاں حاصل ہوتی رہیں۔

ہمارے عہد کے ایک اہم شاعر

ہریہ درشی ٹھاکر خیال

(دہلی)

فیس بک کے عہد میں بہت ممکن ہے کہ جن لوگوں سے ہم کبھی ملے بھی نہیں، وہ ہمارے دوست بن جائیں، جن کا دیوان پڑھا نہ ہو انکے کلام کے مرید ہو جائیں۔ راجیش ریڈی اور میرے درمیان بھی کچھ ایسا ہی تعلق ہے میں ان سے کبھی نہیں ملا لیکن وہ میرے فیس بک فرینڈ ہیں اور میں انکی شاعری کا مرید ہوں،۔ انکی ذاتی زندگی کے بارے میں جو مختصر جانکاری ہے وہ انکے چھوٹے بھائی کمل ریڈی کے حوالے سے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کمل سے بھی میرا رابطہ محض فیسبک اور فون کے ذریعے سے ہی ہے۔ بہرحال، ان سے بات چیت کے دوران یہ ضرور ظاہر ہوا کہ راجیش ریڈی میرے پیارے شہر جے پور میں پلے بڑھے ہیں۔

راجیش ریڈی کا نام پہلی مرتبہ کئی سال پہلے تب سنا تھا جب جگجیت صاحب نے انکی غزل- یہ جو زندگی کی کتاب ہے۔ گائی تھی۔ تب یہ لگا تھا کہ شاید وہ حیدرآباد میں اردو شاعری کی سیکڑوں سال پرانے ادبی سلسلے کے کوئی ابھرتے نمائندے ہونگے۔

جب اس بات کا علم ہوا کہ وہ جے پور کے زایدہ ہیں تو ان سے قربت کا بڑا شیریں سا احساس ہوا۔

راجیش ریڈی ہمارے عصر کے ان شعرا میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنا ایک منفرد مقام بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے، باوجود اس ابتدائی ہینڈی کیپ کے کہ انھوں نے بچپن یا اسکول کے دنوں میں اردو نہیں پڑھی ہوگی (اگرچہ یہ محض میرا قیاس ہی ہے)

فیسبک پر راجیش ریڈی جب اپنی غزلیں پوسٹ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ انہیں لائکس اور پازیٹو کمینٹس زیادہ بڑی تعداد میں ایسے لوگوں سے حاصل ہوتے ہیں جو اردو ادب کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔

مرحوم پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے اردو غزل کے حوالے سے چاہے جیسے بھی خیالات اظہار فرمائے ہوں، غزل کی صنف ہے تو وہ چمبک جس سے کھنچ کر نہ جانے کتنے لوگ اس دور میں غزل کی ٹانگ توڑنے میں مبتلا ہیں۔ پر میرے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ راجیش ریڈی کو شامل کرتے ہوئے میرے زیادہ تر جاننے والے اس ہجوم میں شامل نہیں۔

آسان اور عام فہم الفاظ میں گہرے اشعار کہنے والے راجیش ریڈی کی شاعری میں جہاں ایک طرف روایت کی زعفرانی مہک ہے وہیں دوسری جانب اس سے جدید ذہانت کی خوشبو بھی آتی ہے۔ غزل کی دنیا میں ہر بات نئی ہو، یہ تو بہت مشکل ہے۔ روایت کے اثر سے بالکل آزاد تو شاید ہی کوئی ہوتا ہو، مگر راجیش ہمارے وقت کے ان گنے چنے شعرا میں ہیں جو اپنے اندازِ بیاں سے پرانی بات میں بھی نیا مفہوم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

راجیش ریڈی اپنے ایک حالیہ شعر میں کہتے ہیں۔

دل تھا کسی نے توڑ دیا کھیل کھیل میں
اتنی ذرا سی بات پہ کیا ہاؤ ہو کریں

دراصل، سچ یہ ہے کہ عمر بھر کی ہاؤ ہو تو شاعر کا نصیب ہوتا ہے، وہ اس سے کہاں بچ پاتا ہے۔ اس شعر میں شاعر کا اشارہ شاید اس دور کی بے حس نسبتوں کی جانب زیادہ ہے جن میں بریک اپ کے بعد بہت ہاؤ ہو کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اسی غزل کا ایک اور شعر کا ملاحظہ ہو

انکی یہ ضد کہ ایک تکلف بنا رہے
اپنی تڑپ کہ آپ کو تم، تم کو تو کریں

غالب کے جملوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ۔ اور سو بھی اتنی نفاست سے، مراسم کی جستجو کرتے ہوئے، یہ کمال تو راجیش ریڈی جیسا شاعر ہی کر سکتا ہے۔ بڑے میاں کا شعر تو اپنی جگہ ہے ہی، مہندی حسن صاحب کی آواز میں تم اور تو کے جملے والا ایک اور شعر بھی یاد آتا ہے:

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم، تم سے تو ہونے لگی

انکے باوجود راجیش ریڈی کا شعر اپنی جگہ آپ بنا لیتا ہے اور قائم رہتا ہے۔ ایک مطلع، ایک شعر اور ملاحظہ کریں

بری ہونا ہے اب مشکل ہمارا
گواہی دے رہا ہے دل ہمارا

جب اپنے آپ میں ڈوبے تو جانا
ہمیں میں تھا کہیں ساحل ہمارا

یہ موضوع بھلے ہی کئی پرانے اشعار میں دیکھنے کو مل جائیں، لیکن جتنے آسان اور کم الفاظ میں راجیش ریڈی نے انھیں نئے سرے سے باندھا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ چہارسو کا ایک خاص شمارہ راجیش ریڈی کی شاعری پر شائع کیا جا رہا ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اس میں ایک ایسے شاعر کے بارے میں کچھ کہنے کا موقع حاصل ہوا ہے جنہوں نے اس پائے کے اشعار سے ادب کی خدمت کی ہے۔

جیت سے پہلے مری ہار کی توہین نہ کر
ہارنے کا مرے اعلان تو ہو لینے دے!

جتنی بٹنی تھی بٹ چکی یہ زمیں
اب تو بس آسمان باقی ہے

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ کیجیے

''سلسلۂ یادِ رفتگاں''

نسیم سحر
(راولپنڈی)

مُجھے اِن دنوں ایک بہت مختلف اور منفرد انداز کی خوبصورت غزلیہ شاعری ایک دوست کی معرفت مطالعہ کرنے کو ملی۔ غزل کی صنف میں یہ شاعری ایسی ہے کہ آپ اسے سرسری نظر سے دیکھ کر گزر رہی نہیں سکتے، ورنہ ہمارے عہد کے ایک سینیئر شاعر اور بے لاگ نقاد ظفر اقبال تو کہتے ہیں کہ ان دنوں غزل ٹنوں کے حساب سے لکھی جا رہی ہے۔ وہ سچ ہی کہتے ہیں کہ ان ''ٹنوں'' میں خود اُن کی شاعری بھی کسی حد تک شامل ہے۔ بہرحال راجیش ریڈی کی غزلیں پڑھ کر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ''ٹنوں'' میں نہ سہی، ''گراموں'' میں سہی، مگر یہ خالص سونے کی طرح ہے، تازہ پھولوں کی خوشبو کی طرح ہے، صبح کی پہلی کرنوں کی طرح، سریلے پرندوں کی نغمہ زا صدا کی طرح۔

کمال یہ ہے کہ شاعر کا تعلق پاکستان کے پڑوسی ملک ہندوستان سے ہے جہاں پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے نقادانِ فن کی نظر میں پاکستان کی شاعری کے معیار سے کمتر شاعری ہو رہی ہے جو مشاعروں میں تو مقبول ہوتی ہے مگر تخلیقی سطح پر اُس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا جاتا۔ مقامِ مسرّت ہے کہ وہاں کی شعری فضا میں رہ کر بھی راجیش ریڈی پاکستان کے بہت سے شعراء کی نسبت بھی عمدہ اور جاندار غزل کہہ رہے ہیں۔

غزل میں نئے موضوعات برتنے اور ان سے شعری انداز میں انصاف کرنے کا ہُنر اتنا عام بھی نہیں ہوتا۔ راجیش ریڈی کا کلام قبل ازیں بھی جستہ جستہ نظر سے گزرتا رہا ہے، مگر اب جب ان کی بہت سی غزلیں ایک ہی نشست میں مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ محض شعر سازی یا شعر بازی کے قائل نہیں بلکہ ان کے ذہن میں کچھ اچھوتا موضوع آتا ہے تو ہی وہ شعر کہتے ہیں اور واضح رہے کہ شاعر کا محض اچھوتا خیال ہی اس کے شعر کو اچھا نہیں بناتا، بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اس نے اِس موضوع کو لفظیات کا پیرہن کس پیرایے اور کس اسلوب میں دیا ہے کہ شعری لطافت، شعری ابلاغ کے ساتھ ساتھ ایک نئے خیال کی کامیاب اور جیتی جاگتی تصویر بن کر سامنے آئے اور تازہ کاری کے نشاط انگیز ذائقے سے بھی سیراب کرے۔ موضوع اور لفظی پیرہن کی ہم آہنگی کی گواہی دیتے ہوئے اُن کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

ہر کوئی جا چکا خود سے کہیں ہجرت کر کے
اب کہاں اپنے مکانوں میں مکیں ملتے ہیں
دنیا بلاتی رہ گئی، ہم ہی نہیں گئے
کیا مفلسی میں رونقِ بازار دیکھنا
میں سمجھتا تھا کہ دشمن ہی مرے دشمن ہیں
یار، دشمن تو مرے تم بھی غضب کے نکلے!

راجیش ریڈی کی غزلوں کی جو خصوصیت قابلِ ذکر ہے، وہ اُن کے مطلعے ہیں، عموماً شعراء کی غزلوں کے مطلعے برائے مطلعے ہی ہوتے ہیں، جہاں قافیے اور ردیف کی ہم آہنگی کے سِوا دونوں مصرعوں میں کوئی خاص کشش نہیں محسوس ہوتی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ مطلع بہت اچھا شعر بھی ہو، اور جس شاعر کو کوئی اچھا مطلع نصیب ہو جائے یوں جانیے کہ اس کی پوری غزل ہی اچھی ہو گئی کہ غزل کی عمارت کی پہلی اینٹ مطلع ہی تو ہوتی ہے۔ راجیش ریڈی کی جتنی غزلیں میں نے پڑھیں، یہی دیکھا کہ اُن کا کوئی بھی مطلع بھرتی کا نہیں ہے، ذرا یہ چند مطلعے دیکھیے اور بتایئے کیا مَیں غلط کہہ رہا ہوں؟

روز ارادوں میں ذرا ردو بدل کرتے ہوئے
عمر گزری ہے یونہی آج کو کل کرتے ہوئے
میں راکھ ہو کے خلا میں کہاں کہاں نہ گیا
وہاں وہاں بھی، جہاں تک مرا دھواں نہ گیا
ہم جی رہے ہیں جان تمہارے بغیر بھی
ہر دن گزر رہا ہے گزارے بغیر بھی
ساری بستی پہ خوف طاری ہے
آج کیا جانے کس کی باری ہے
مان کر کوئی دوسرا خود کو
دیتا رہتا ہوں مشورہ خود کو
دن کو گھڑی میں باندھ، رات سمیٹ
اے خدا، اب یہ کائنات سمیٹ
میں کس سبب سے ہوں، تو کہاں کس سبب سے ہے
یہ اک سوال جب سے یہ دنیا ہے تب سے ہے
خواب سے باہر نکل آنے کی لاچاری کے بعد
دیکھنا آساں نہیں دنیا کو بیداری کے بعد
کوئی ساتھ، نہ اب ہے ہمارے ساتھ
لے دے کے ایک رب تھا، سو رب ہے ہمارے ساتھ

راجیش ریڈی کی شعری ہُنر کاری اور بُنت، اُن کا جمالیات سے بھرپور لہجہ، اور اُن کی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی، بے وفائی کے علاوہ معاملاتِ حُسن و عشق کا بیان ایسی تخلیقی صفات اور تنوّع سے مالا مال ہے جو کسی شاعر کو مسلسل ریاضت کے بنا نصیب نہیں ہو جاتا۔ ان کے مزید کچھ اشعار ان کی متنوّع تخلیقی وسعت کا اعتراف کرتے ہوئے ملاحظہ ہوں جنہیں پڑھ کر یقیناً نقادانِ دن بھی تسلیم کریں گے کہ وہ مستقبل قریب میں سرمایۂ غزل میں ایسا اضافہ کریں گے جو

صرف انہی کے نام سے شناخت اور انہی سے منسوب ہوگا:

ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہاتھوں سے کسی دن ہم بھی
کہیں تعمیر کوئی تاج محل کرتے ہوئے
زمانہ ہو گیا ان کو گئے ہوئے راجیشؔ
پہ دل سے سلسلۂ یادِ رفتگاں نہ گیا
نئی مشکل سے نوازے چلا جاتا ہے مجھے
پچھلی مشکل ذرا آسان تو ہو لینے دے!
یوں ہے کہ زندگی نہیں آئی مری طرف
یوں ہے کہ زندگی کی طرف مَیں نہیں گیا
نکل آتا ہوں میں اکثر باہر
کوئی خود میں رہے کتنا موجود
اس ڈر سے میں قمیض کبھی جھاڑتا نہیں
کب جانیں آستین سے احباب گر پڑیں
ایسا لگا کہ اس نے دنیا ہی باندھ لی ہو
کچھ اس ادا سے اس نے زلفوں کے بال باندھے
سستی چمک سے سارا بازار پٹ چکا تھا
ہم اک طرف کھڑے تھے گٹھڑی میں مال باندھے

- بقیہ -

سالہا رفت بداں

نہ رک پایا ہماری خودکشی تک
بہت عجلت میں تھا قاتل ہمارا
ختم ہوتے ہی نہیں رنج و الم کیوں یارب
ہم تو آئے تھے یہاں دنیا کو فانی سن کر

میں نے شروع میں جون کیٹس کے خط کا ذکر کیا تھا، اسی خط میں جون کیٹس لکھتا ہے کہ اگر شاعری اس قدر فطری (natural) نہ ہو جیسے درختوں پر پتے آتے ہیں تو ایسے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔ راجیش صاحب کے کلام میں شعریت اور اس کی روانی و شگفتگی، اس کی تاثیر و بلاغت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ کیٹس جس فطری شاعر کی بات کرتا ہے اور اس کے لئے جو پیمانہ اس نے بنایا ہے، راجیش صاحب اُس پیمانے پر بلا شبہ کھرے اترتے ہیں، بلکہ اُس پیمانے میں کچھ اور خوش کن اضافہ ہی کرتے ہیں۔

گورکن

(منیج : راجہ یوسف)

تنویر رومانی (جمشید پور)

نعش قبرستان کے انتظار گاہ میں رکھی ہوئی تھی۔ سرکاری اسپتال کا عملہ نعش کو اسی اہتمام کے ساتھ لے کر آیا تھا، جیسا کورونا کے مریضوں کی نعش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

جنازے کی نماز پڑھی جا چکی تھی۔ گنتی کے پانچ لوگ جنازے میں شریک تھے۔ میت کے تین رشتے دار، ایک مسجد کے امام صاحب، جنہیں جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے خاص طور پر بلایا گیا تھا اور ایک غیر متعلق شخص، جو اپنے کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ جنازے میں بہت کم لوگ ہیں تو ازراہِ ثواب شریک ہو گیا تھا۔ جنازے کی نماز کے بعد جب تدفین کی باری آئی تو معلوم ہوا کہ قبر تو کھودی ہی نہیں گئی ہے۔

یہ کیا ماجرا ہے؟ وہاں موجود سارے لوگ حیران تھے۔

امام صاحب نے جب رشتے داروں سے دریافت کیا تو مرحوم کے بھائی نے بتایا۔ ''میں نے قبرستان کے سکریٹری کو فون کیا تھا کہ بھیّا کا انتقال ہو گیا ہے۔۔۔ان کی قبر کھودنے کا کہیں سے انتظام کروا دیجئے۔۔۔ادھر سے کوئی جواب ملتا تبھی فون کٹ گیا۔۔۔کئی بار کوشش کی لیکن نیٹ ورک ملا ہی نہیں۔۔۔میں نے سوچا میری بات تو انہوں نے سن ہی لی ہے۔۔۔کہیں نہ کہیں سے انتظام کر دیں گے۔۔۔مجھے کیا معلوم کہ۔۔۔''

اس کے آگے وہ کچھ بول ہی نہ سکا کیونکہ اس پر بری طرح جھنجھلاہٹ اور رقت طاری ہو گئی۔

اپنے عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے والا شخص سماجی کارکن تھا۔ قبرستان کے سکریٹری سے اس کے روابط تھے۔ اس نے اپنے موبائل فون پر سکریٹری سے رابطہ قایم کیا۔ اس نے سکریٹری کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے سوال کیا۔ ''جب آپ کو فون کر دیا گیا تھا تو آپ نے قبر کھودنے کا انتظام کیوں نہیں کرایا؟''

ادھر سے سکریٹری کی آواز آئی۔ ''صاحب، میں نے بہت کوشش کی لیکن قبر کھودنے کے لیے کوئی آدمی ملا ہی نہیں۔''

''کوئی آدمی کیوں۔۔۔جو گورکن ہے وہ کہاں گیا؟''

ادھر سے جواب ملا۔ ''ارے صاحب!۔۔۔آپ کو معلوم نہیں؟۔۔۔جس میت کے پاس آپ کھڑے ہیں، وہ اسی گورکن کی ہے۔''

سالہارفت بداں

اجمل سعید
(دہلی)

ہندوستان میں اردوغزل میں جوتبدیلیاں آئی ہیں اس کے سیاسی تاریخی اور معاشراتی اسباب ظاہر ہیں، پاکستان میں اردو کوقومی زبان بنایا گیا خوب فروغ ملا،لیکن ہندوستان میں تمام طرح کی پریشانیوں کے باوجود ہر دور میں اردوادب کے پرچم کی لاج رکھنے والے موجود رہے اوراس شان کے ساتھ کہ ہاں یہ اُسی خطے کے لوگ ہیں جہاں اردو نے پرورش پائی اوراردوغزل پروان چڑھی۔ ایسے ہی البرداروں میں راجیش ریڈی کا شمار ہے۔اردو نہ زیادہ تر اسکولوں میں پڑھائی جاتی نہ ذرائع ابلاغ میں اردو کا کوئی خاص دخل، یہ زبان کب کی کالعدم ہو گئی ہوتی مگر کچھ اردو کی جاذبیت،اور کچھ ایسے البرداروں کا جنون ہے کہ اردو آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ ہےاورایک عالم دیوانہ بنائے ہوئے ہے۔

زلفِ ہندوئے تو گفتم کہ دگر رہ نہ زند
سالہارفت بداں سیرت وسانست کہ بود
(حافظ)

جون کیٹس نے جون ٹیلر کوخط میں لکھا تھا کہ شاعری وہ ہے جوقاری کو اس کی اپنی آپ بیتی معلوم ہواور پڑھنے کے بعداسے وہ اپنی ہی کوئی یادداشت لگے۔ راجیش ریڈی صاحب کا کلام بایں معنی شاعری شاعری اور بس شاعری ہے۔

عوام وخواص سب کو یکساں متاثر کرنے کا اور سب کو یکساں مسحور کرنے کا جو ہنر راجیش ریڈی صاحب کے یہاں ہے وہ شاذ ہی نظر آتا ہے،اور کمال یہ ہے کہ یہ کام اتنی صفائی سے ان کے یہاں عمل میں آتا ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔

نہ گنجلک مضمون، نہ مشکل زبان، بس سادہ سا پیرایۂ بیان جوقاری پر اجنبیت طاری نہیں ہونے دیتا۔

مجھ کو تو انتظار بھی اس کا نہیں ہے اب
پھر وقت کیوں گزارے گزر ہی نہیں رہا

اسی غزل کا ایک شعراور دیکھئے

ساری شکایتیں ترے لہجے سے ہیں مجھے
لفظوں پہ اعتراض تو کر ہی نہیں رہا

یہ ہے وہ روانی وہ ثلاثت۔ آپ صرف اسی مصرعہ ''لفظوں پہ اعتراض تو کر ہی نہیں رہا'' کو دیکھئے گویا بحراور ردیف قافیے کی پابندی میں رہتے ہوئے کسی سے آمنے سامنے بات ہورہی ہے،-ایسے خیال اوراس پر یہ مکالماتی لہجہ، یہ ہے وہ جادو جوقاری کواس کی خود کی یادداشت ہی نہیں بلکہ کسی خاص لمحے میں اس کا خود کا کہا ہوا جملہ لگتا ہے۔

راجیش صاحب عوامی مسائل کو بھی چھوتے ہیں تو وہی نرمی، وہی حساسیت،اوروہی سلیقہ جوانہیں اس غزل کی روایت نے ورثے میں دیا ہے۔

شام کو جس وقت خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں میں
مسکرا دیتے ہیں بچے اور مر جاتا ہوں میں

یہ کون سا ایسا خیال ہے جو نایاب ہو،سیکڑوں کہانیاں افسانے شعر گیت اسی خیال کو لئے پھرتے ہونگے جہاں باپ شام میں خالی ہاتھ گھر لوٹ کے جاتا ہے،مگر شاعری کیا صرف خبر دینے کا نام ہے؟ شاعری تو وہ ہے کہ خبراس طرح دی جائے کہ پڑھنے والا اس خبر کوآپ بیتی کی طرح محسوس کر پائے۔بچوں کے مسکرانے کے عمل کے مقابل باپ کے مرجانے کو رکھنا، یہ ہے وہ شعر کا حصہ جس نے اس خبر کوآپ بیتی بھی بنایا ہےاوراس کرب کواور گہرا کر دیا ہے۔نہ بچوں کی بھوک کا ذکر ہے پورے شعر میں نہ ہی باپ کو دیکھ کر کھانے کی امید کا ذکر ہے،بس شاعر نے ایک مسکراہٹ کی لکیر کھینچی ان کے چہرے پراور بس۔بچوں کی مسکراہٹ دیکھ کر باپ کا شرم سے مرنا، یہ الگ کرب میں اضافہ کرتا ہے۔آپ چاہیں تو کرب کی جگہ شعریت پڑھ لیں لیکن بات اصل میں یہی ہے کہ خوشی غم فخر ناز کرب سکون وغیرہ یہ ہی وہ کیفیات ہیں جوقاری محسوس کر پائے تو شعر شعر کہلاتا ہے۔اور یہ محسوس کروا پانا شاعر کوشاعر بناتا ہے۔راجیش صاحب کا شعر ہے

بنانے پڑتے ہیں پہلے سراب صحرا میں
پھر ان سرابوں سے دریا بنانا پڑتا ہے

قاری صرف بہتے دریا کو دیکھ پائے اوراور پورا پروسیس اس کی آنکھ سے اوجھل ہوجائے جس میں شاعر نے صحرائے عدم میں پہلے سراب کوخلق کیا اور پھراس سراب سے دریارواں کیا۔دوشعر بلاتبصرہ یہاں لکھ رہا ہوں:

مرے دل کے کسی کونے میں اک معصوم سا بچہ
بڑوں کی دیکھ کر دنیا بڑا ہونے سے ڈرتا ہے

دل بھی اک ضد پہ اڑا ہے کسی بچے کی طرح
یا تو سب کچھ ہی اسے چاہئے یا کچھ بھی نہیں

میں چونکہ یہ مضمون ایک قاری کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں تو ایسی باتیں بھی کرنے کا حق رکھتا ہوں جوصرف محسوسات کے دائرے میں آتی ہیں اور تنقید کی اصطلاحات کی قید سے ماورا ہوتی ہیں۔میں بہت ہی نوسٹالجیا میں جینے والا انسان ہوں،ماضی کا ماتمی ہوں، نئے ماحول سے حتی الامکان احتراز کرتا ہوں، چند لوگوں اور چند چیزوں سے باہر جانا پریشان کرتا ہے، مجھے راجیش صاحب کا ایک شعر پڑھ کر یوں لگا جیسے یہ شعرانہیں نے سب کیفیات کے لئے کہا ہے،وہ شعر یہ ہے:

میری آنکھیں یہ کہا کرتی ہیں اکثر مجھ سے
آپ دیکھی ہوئی چیزوں کو بہت دیکھتے ہیں

انسانی نفسیات کے حوالے سے کئی چونکانے والے شعر راجیش صاحب کے یہاں ہیں اور ایسے کہ شاعر کے مشاہدے کی داد دئے بنا نہ رہا جائے۔ کسی ماہر نباض طبیب کی طرح نفسیاتِ انسانی کی نبض پکڑتے ہیں

غم چھپانے کے سو طریقوں میں
مسکرانا ہی سب سے مشکل ہے

سچ ہو چھیئے تو عشق کسی اور کے نہیں
اپنے ہی انتظار میں رہنے کی بات ہے

بعد میں ڈوبی ہوگی ناؤ
پہلے دل ڈوبے ہونگے

ہم کو بھی تیز لگتی تھی رفتار وقت کی
لیکن یہ انتظار سے پہلے کی بات ہے

جاں ہے کہ چاہے چھوڑ کے جانا جہان کو
جی ہے کہ اس جہان سے بھر ہی نہیں رہا

بہت عالمانہ انداز بیان کے بجائے سہل طرزِ بیان کو اپناتے ہیں، تصوف ہو یا فلسفہ، اسے فلسفیانہ نہیں ہونے دیتے، شعر کا لباس اسپر پھب سکے اس لائق اسے بناتے ہیں۔

دھوکا ہے اک فریب ہے منزل کا ہر خیال
سچ پوچھیئے تو سارا سفر واپسی کا ہے

جو دکھائی ہی نہیں دیتا کہیں
دیکھتا رہتا ہوں اس کو دھیان سے

ساری کی ساری اگر مل بھی گئی دنیا تجھے
یہ بتا تو کیا کریگا ساری کی ساری کے بعد

اسی غزل کا ایک اور بہت پیارا شعر ہے، خالص کیفیت کا شعر ہے

بعد مدت کے تم آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا
کام آنکھوں کو ملا ہے کتنی بیکاری کے بعد

اردو شاعری کے روایتی عاشق کی آنکھیں تو رائگاں ہی ٹھہریں اگر دیدارِ یار سے محروم رہیں یا اشکِ غمِ دوست سے خالی رہیں۔ اشک کا ذکر ہے تو ایک اور نرالا شعر دیکھئے پورا روایتی اقدار میں رچا بسا مگر پھر بھی جداگانہ حیثیت کا حامل:

سخن کو سن کے مرے چونکتے ہیں آنسو بھی
یہ کون ہے جو ہماری زبان بولتا ہے

میرے خیال میں اس دور میں خوشی سے زیادہ کشش غم میں ہوتی ہے، اور غمِ عشق تمام غموں ہر فوقیت رکھتا ہے، کم از کم ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ تک تو یہ بات درست ہے ہی۔

غم کو برتنے کا انداز بھی راجیش صاحب کا وہی ہے، نہ کوئی شورِ ماتم، نہ سینہ کوبی، بس ایک ٹیس سی ہے جو رہ رہ کے اٹھتی ہے۔

جہاں آپس میں فلک اور زمیں ملتے ہیں
جو بچھڑ جاتے ہیں وہ لوگ وہیں ملتے ہیں
کچھ ہیں ایسے جو بچھڑ کر بھی جدا ہوتے نہیں
اور کچھ ہیں کہ جو مل کر بھی نہیں ملتے ہیں
ہر کوئی جا چکا خود سے کہیں ہجرت کر کے
اب کہاں اپنے مکانوں میں مکیں ملتے ہیں

حد نظر سے آگے لگاتار دیکھنا
زنداں میں آ گیا پسِ دیوار دیکھنا
دنیا بلاتی رہ گئی ہم ہی نہیں گئے
کیا مفلسی میں رونقِ بازار دیکھنا

وہ کسی اور کا بیمار ہوا ہے اور ہم
ایک بیمار کے بیمار ہوئے بیٹھے ہیں
کوئی پوچھے تو سہی حال کہ اک مدت سے
درد آمادۂ گفتار ہوئے بیٹھے ہیں

یقیں ہزار دلاتی ہی رہ گئیں آنکھیں
مگر گماں جو تھا دل میں مرے، گماں نہ گیا

کاندھا نہیں ہے کوئی کہ سر جس پہ رکھ سکیں
سارا کا سارا بوجھ ہمارا ہمیں پہ ہے

راجیش صاحب کے یہاں یوں تو خوب شعر ہیں جو ان کے عشق کے تصور کے بارے میں ہمیں بتاتے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لئے صرف ایک شعر دیکھئے کہ محبت اور وہ بھی اس شخص کی محبت جس کا شیوہ ہنگامہ آرائی نہ ہو، جس کو ماتمی لہجے سے بھی عار ہو، اس کے لئے سوزِ محبت کا تصور کیسا ہوگا

محبت نام ہے جس کا اک ایسی آگ ہے جس میں
جلن بھرپور ہوتی ہے دھواں کم کم بہت ہی کم

موصوف کی شاعری قاری کو دکھی کرتی بھی ہے تو مایوس نہیں کرتی، ایک سلور لائننگ، ایک حوصلہ آمیز اور حوصلہ آموز اثر ساتھ رکھتی ہے۔ گویا درد اور دوا کا حسین اور مناسب امتزاج۔

پہلے تھا کوئی ساتھ نہ اب ہے ہمارے ساتھ
لے دے کے ایک رب تھا سو رب ہے ہمارے ساتھ
اے دور جانے والے تجھے کچھ خبر بھی ہے
پہلے سے بھی زیادہ تو اب ہے ہمارے ساتھ
ہم اس کو دیکھ لیتے ہیں آنکھوں کو موند کر
اک چھب ہمارے ساتھ تھی چھب ہے ہمارے ساتھ
آپ کے یہاں ہمہ رنگی خوب ہے، سادگی ہے تو شوخی بھی جا بجا
موجود ہے، عاشق کا شرارتی لہجہ دیکھئے
ان کی یہ ضد کہ ایک تکلف بنا رہے
اپنی تڑپ کہ آپ کو تم تم کو تو کریں

اتنی جلدی نہ گرا اپنے حسیں رخ پہ نقاب
تو مجھے ٹھیک سے حیران تو ہو لینے دے

ہماری بانہوں میں آ کر بھی کیوں ہمیں سے گریز
سپردگی میں کبھی تو کرو ''نہیں'' سے گریز
اس اندرد ھنش کے کچھ اور رنگ دیکھئے
عکس موجود نہ سایہ موجود
مجھ میں اب کچھ نہیں میرا موجود
نکل آتا ہوں میں اکثر باہر
کوئی خود میں رہے کرنا موجود
میں ذرا بھی نہیں اُس میں لیکن
مجھ میں وہ سارا کا سارا موجود
جب تلک پیاس ہے مجھ میں باقی
بس تبھی تک ہے یہ دریا موجود

اتنا بھی مت بڑھایئے رختِ سفر کہ کل
جب ہوٹلی اٹھائیں تو اسباب گر پڑیں

زندگی تو نے لہو لے کے دیا کچھ بھی نہیں
تیرے دامن میں مرے واسطے کیا کچھ بھی نہیں
آپ ان ہاتھوں کی چاہیں تو تلاشی لے لیں
میرے ہاتھوں میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

جاتے ہی ان کے ٹھہر سی جاتی ہے زندگی
آتے ہی ان کے وقت کی رفتار دیکھنا

تجویز اپنی رہنے دے اے چارہ گر تجھے
آتا نہیں ہے عشق کا بیمار دیکھنا

سرِ بازار بھی خوددار ہوئے بیٹھے ہیں
ہم خود اپنے لئے دشوار ہوئے بیٹھے ہیں
لوگ ڈرتے ہیں نہ ہونے کے تصور بھر سے
اور ہم ہونے سے بیزار ہوئے بیٹھے ہیں

میں راکھ ہو کے خلا میں کہاں کہاں نہ گیا
وہاں وہاں بھی جہاں تک مرا دھواں نہ گیا
سبق کے طور پہ کام آ رہے ہیں لوگوں کے
ہمارا رائگاں ہونا بھی رائگاں نہ گیا

زمیں کافی نہ تھی اور آسماں کم کم بہت ہی کم
مری وسعت کو تھے دونوں جہاں کم کم بہت ہی کم

خواب سے باہر نکل آنے کی لاچاری کے بعد
دیکھنا آساں نہیں دنیا کو بیداری کے بعد
اب کسی بھی موت پر تھوڑا سا مر جاتے ہیں ہم
جینا آساں ہو گیا مرنے کی تیاری کے بعد
سب کا بچپن لوٹ آیا اک نئی آمد کے ساتھ
گھر کا گھر تتلا رہا ہے ایک کلکاری کے بعد

مان کر کوئی دوسرا خود کو
دیتا رہتا ہوں مشورہ خود کو
جب بھی ہاتھوں میں تیرا ہاتھ آیا
میں نے محسوس کر لیا خود کو

ہم جی رہے جان! تمہارے بغیر بھی
ہر دن گزر رہا ہے گزارے بغیر بھی
سب کے لئے کنارے پہ ہوتا نہیں کوئی
کچھ لوگ ڈوبتے ہیں پکارے بغیر بھی
جیتے بغیر جیتنے والوں کے دور میں
کچھ لوگ ہار جاتے ہیں ہارے بغیر بھی

بری ہونا ہے اب مشکل ہمارا
گواہی دے رہا ہے دل ہمارا

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ کیجیے

بابِ سخن کھلا ہے

نوید سروش
(میرپورخاص)

راہِ مضمون تازہ بند نہیں
تاقیامت کُھلا ہے بابِ سخن

یہ دعوتِ فکر ہے کہ تخلیق کار آئیں اور اپنے فن کے جوہر نذرِ قرطاس کریں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں اردو زبان کے پھیلاؤ میں اردو غزل کا مضبوط اور پُراثر کردار رہا ہے اور ہے۔ ولی دکنی سے غالب تک، میر سے منیر تک اور علامہ اقبال سے ظفر اقبال تک غزل کے مختلف لہجے، موضوعات اور اسلوب دیکھنے میں آتے ہیں۔

موجودہ عہد کے اکثر شعراء کے لہجوں، آوازوں اور فکر میں ایک نامعلوم سی یکسانیت نظر آتی ہے اس کا سبب کیا ہے؟ یہ الگ بحث ہے بعض شعراء آگہی کے بغیر جدیدیت اور انفرادیت کے چکر میں اپنی غزل کو بے لطف کر رہے ہیں۔ معاصر شعراء میں ایسے بھی ہیں جن کے ہاں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جو منفرد ہے نیا پن نیا مانوس انداز ہے اُن کی غزل کو بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ راجیش ریڈی بھی اُنہیں معاصر شعراء میں شامل ہیں جن کا لہجہ، آواز اور فکر توجہ طلب ہے ان کی انفرادیت اجتماعی آگہی سے وابستہ معلوم ہوتی ہے اسی زاویۂ نظر اور لفظیات کی خاص نشست کے سبب جس نئے پن اور نئی معنویت نے ان کی شاعری میں جنم لیا ہے وہ جدا بھی ہے اور یاد رہ جانے والی بھی ہے۔ وہ زندگی کے مختلف تضادات، سماجی حقیقتوں، انسانوں کے مختلف مسائل، جذبوں کا احساس اور اندرون ذات کی مختلف کیفیات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کہیں داخلی کیفیات خارجی تناظر میں کے ساتھ نظر آئے گی اور کہیں خارجی معاملات داخلی احساس کو اجاگر کرتے نظر آئیں گے۔ یہ روایت انہیں میر تقی میر کے قریب کرتی ہے۔

خواب سے باہر نکل آنے کی لاچاری کے بعد
دیکھنا آساں نہیں دنیا کو بیداری کے بعد

یہ خوابوں کے چکنا چور ہونے کا نوحہ ہے یہ عمل شاعر، جیسی دنیا کا خواب دیکھنا چاہتا ہے اُس کی تعبیر نظر نہیں آتی۔ اُس کے اندر کا خوف اُسے انسانیت سے دور لے جاتا ہے اُسے نہ دیکھنے کی خواہش کرتا ہے دوسری جانب اُسے اپنے اشرف ہونے پر یقین اور فخر بھی ہے۔

مٹی کو آرزو ہی نے سونا بنا دیا
دنیا میں جو کشش ہے ہماری طلب سے ہے

وہ دنیا کے مختلف سماج میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کے مسائل کے بارے میں سوچتے ہیں اُن کی بدحالی اور مستقبل کی فکر شاعر کو افسردہ کر دیتی ہے۔ وہ اس افسردگی میں انسانیت اور مکالمہ کا چراغ روشن کرتے ہیں:

دنیا کو ریشہ ریشہ ادھیڑیں رفو کریں
آ بیٹھ تھوڑی دیر ذرا گفتگو کریں

اعمال آسماں پہ جائیں گے تیرے ساتھ
یعنی وہاں کا فیصلہ ہونا یہیں پہ ہے

جس جدید سائنسی دور میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کے دَین برق رفتار تبدیلی ہے ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دنیا ختم ہو رہی ہے اور ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے۔ نئی جنم لینے والی دنیا کا ہر لمحہ حیرانی کی طرف لے جا رہا ہے انسان، شاید مکمل طور پر اُس کا ساتھ نہیں دے پا رہا یا اپنے سامنے تیزی سے ماضی کو مٹتے ہوئے دیکھ کر ذہن کو آمادہ نہیں کر پا رہا یہ حالات اُسے کچھ پریشان کر رہے ہیں۔ شاعر کا خیال ہے کہ اس تیزی سے بدلتی دنیا کے زیرِ اثر انسانی مزاج، روّیوں، رشتوں، جذبوں اور ارادوں میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ یہ تبدیلی خصوصاً حساس لوگوں کو اکیلا کر رہی ہے۔ راجیش ریڈی نے اہم ''وقت'' اور ''رجحان'' کے جدید تقاضوں کو کلاسیکل انداز کے خوشنما ہلکے رنگوں کے ساتھ نئے رنگ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے:

ہائے کس تیزی سے بدلا ہے زمانے کا مزاج
غیر تو غیر میرے یار بھی اب میرے نہیں

بدل بدل کے سبھی راستوں کو دیکھ لیا
ہر ایک رستے پہ آگے زمانہ پڑتا ہے

روز ارادوں میں ذرا رد و بدل کرتے ہوئے
عمر گزری ہے یوں ہی آج کو کل کرتے ہوئے

شاعر خوابوں کا سوداگر ہوتا ہے خواب دیکھنا پھر خواب تقسیم کرنا منصب شاعری ہے۔ وہ خواب کیا ہیں یہی جواز شاعر کے مقام کو متعین کرتے ہیں۔ راجیش ریڈی عالمِ انسان کے لیے اعلیٰ اخلاقی روایات، اطمینان، امن، تحفظ، بے خوفی اور برابری کے خواب دیکھتے ہیں اُن کے یہ خواب، خواب ہی ہیں زمینی حقائق کچھ اور ہیں:

ساری بستی پہ خوف طاری ہے
آج کیا جانے کس کی باری ہے
اس کے ہاتھوں میں تیر ہے نہ کمان
وہ جو سب سے بڑا شکاری ہے

جمہوریت اور سیاست کے پردے میں دنیا کے طاقتور حکمرانوں کی

بربریت اور حقوقِ انسانی کی بے قدری پر گہرے طنز کا نمونہ دیکھئے پھر یہی کیفیت ہوتی ہے:

اچھے اچھے بھی چیخ اٹھیں جس میں
ہم نے وہ خامشی گزاری ہے

راجیش ریڈی اپنی ذات، فکر اور خیالات سے دنیا میں خرد افروزی، روشن خیالی، انسان دوستی اور خوش حالی کے چراغ روشن کرنا چاہتے ہیں وہ لوگوں کی راہ سے خار چُن کر پھول بچھانا چاہتے ہیں، مشکلات خود پر سہہ کر لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور غموں کو سینے سے لگا کر خوشیاں تقسیم کرنے کا جذبہ تازہ رکھتے ہیں:

ڈگر کرتے رہے اوروں کی آساں
سفر ہوتا رہا مشکل ہمارا

زنداں میں بھی آواز نے پہنی نہیں زنجیر
جو کہنا تھا ہم نے وہ سرِ دار کہا ہے
شاہوں کے لیے جھک کے قصیدے نہیں لکھے
ہم نے نہ کبھی جوتی کو دستار کہا ہے

ان اشعار میں محکومی، غربت و افلاس، جبر و استحصال اور خوف کے خلاف انقلابی سوچ ایک نئے انداز میں سنائی دے رہی ہے لہجہ فیض احمد فیض کی طرح دھیما ہے۔ فیض نے کہا تھا:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں! تلخیِ ایّام ابھی اور بڑھے گی
ہاں! اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

راجیش ریڈی دھیمے لہجے میں اپنی آواز توانا، جذبہ بلند اور جرأت تازہ رکھتے ہیں اور خالد علیگ کی طرح فیصلے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت نرالی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا
(خالد علیگ)

اب ذرا راجیش کا توانا اور طنزیہ انداز دیکھیے:

جن کو رستے کی خبر نہ ہے نہ پتا منزل کا
قافلے کے وہی سالار ہوئے بیٹھے ہیں
خاموش ہی رہنا ہے جو ہر بات پہ تجھ کو
رکھے ہوئے کیوں منھ میں زباں گھوم رہا ہے
نہ قید کر سکا صیاد جذبۂ پرواز
پروں کو کھو کے بھی آنکھوں سے آسماں نہ گیا

ہجرت کرنے والے کروڑوں مہاجرین کی بے بسی دنیا اس بے بسی بے رنگی کی طرف متوجہ نہیں۔

جس کی پہچان ہی نہ ہو پائی
ہاں وہی لاش تو ہماری ہے

ہمیں رہنے بھی دے اپنے سفر میں
نہ رستہ روک اے منزل ہمارا

راجیش ریڈی کی غزل کا ایک مرغوب موضوع تخلیقِ کائنات اور دنیا کے مختلف زمانوں کے نظریات ہیں۔ ان موضوعات پر غور و فکر کرتے ہوئے اندرونِ ذات کا سفر طے کرتے ہیں جس سے خارجی و داخلی کیفیات کا امتزاج ایک نیا آہنگ پیش کرتا ہے وہ اپنی ذات کے دکھوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے سماوی و ارضی مسائل پر بھی سوچتے ہیں:

ہر کوئی جا چکا خود سے کہیں ہجرت کر کے
اب کہاں اپنے مکانوں میں مکیں ملتے ہیں

راجیش ریڈی اس بات کا خوب ادراک رکھتے ہیں کہ گہرا مشاہدہ، مطالعہ، لفظیات کا خاص طریقے سے شاعرانہ استعمال اور غور و فکر کی عادت طاقتور، مثبت اور مستقل ہوگی تخلیقات میں اُس کا اثر نمایاں ہوگا۔ معنوی تہہ داری کے کچھ اشعار اس باب میں دیکھیے:

سارے مسافروں کے رختِ سفر میں ربّ نے
ارمان انگنت اور گنتی کے سال باندھے

غالب نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

راجیش ریڈی کی خواہش کی تکمیل اور سوچ کی پرواز کا عالم دیکھئے

ساری کی ساری اگر مل بھی گئی دنیا تجھے
یہ بتا تو کیا کرے گا ساری کی ساری کے بعد

اس سے آگے جا کر شاعر سوچتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر سوال اٹھاتا ہے اور سوال بھی ایسا جس سے کئی سوال جنم لیتے ہیں یا لے سکتے ہیں۔

میں کس سبب سے ہوں تُو یہاں کس سبب سے ہے
یہ اک سوال جب سے یہ دنیا ہے تب سے ہے
یہ دنیا میں اک زمانے سے ہوتا رہا ہے جو
دنیا یہ چاہتی ہے وہی ہُو بہ ہو کریں

شاعر فانی دنیا کے تقاضے، زندگی کی حقیقت، موسموں کی طرح بدلتے ہوئے لوگوں کے مزاج، پائیداری اور بے بسی سے خوب واقف ہے وہ ایسے حالات میں افسردہ نہیں بلکہ متشکر ہے:

خدا کا شکر اک دوری بنائے رکھی دنیا سے
کرم اس کا ہوئے ہم رائیگاں کم کم بہت ہی کم
جینا تو بس اک بار جینا ہے جہاں میں
مرنا ہے مگر عالم فانی میں کئی بار
کچھ بھروسا نہیں عناصر کا
اپنی بکھری ہوئی حیات سمیٹ

راجیش ریڈی کے ہاں موت کا تصور ایک ایسی حقیقت پر مبنی ہے جس میں خوف نہیں بلکہ تیاری کا پہلو ہے جس میں مایوسی نہیں بیداری کا اشارہ ہے درج بالا اشعار اس کا ثبوت ہیں۔ یہی ''تیاری'' اور ''بیداری'' شاعر میں اعتماد اور اپنے ہونے کا یقین پیدا کرتا ہے جو اُن کی غزل میں نظر آتا وہ حیران کر دیتا ہے وہ اپنے نظریات پر زندگی کے ہر رنگ، ہر مشکل پر ثابت قدم رہتے ہیں پیچھے نہیں ہٹتے، بعض موقعوں پر خاموش سوچ اور استعجاب میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ اُن کے کلام کا کمال ہے ارسطو نے کہیں کہا ہے کہ:

''فلسفہ کی مانند شاعری بھی انسانی حیرت اور استعجاب کو تحریک دینے کا ذریعہ بنتی ہے۔''

اب ذرا شاعر کا پُر یقین لہجہ دیکھیے جو حیرت و استعجاب کی منزل پر نظر آتا ہے:

اپنے بارے میں رہا رائے پر اپنی قائم
اپنے بارے میں نہ لی اوروں کی رائے میں نے

ثروت حسین نے کہا تھا:

موت کے درندے میں اک کشش تو ہے ثروت
لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خودکشی کے بارے میں

راجیش ریڈی کی مثبت سوچ اور رجائی پہلو جو حیرانی میں ڈالتا ہے:

اپنے سوا کسی کی طرف میں نہیں گیا
گھبرا کے خودکشی کی طرف میں نہیں گیا
وہ پیاس تھی کہ سات سمندر بھی کم پڑیں
پھر بھی کسی ندی کی طرف میں نہیں گیا
یوں ہے کہ زندگی آئی مری طرف
یوں ہے کہ زندگی کی طرف میں نہیں گیا

یہ اشعار شاعر کے اپنی ذات پر غیر معمولی اعتماد اور رجائیت سے بھر پور طرز فکر کے ترجمان ہیں اسی رجائی طرز فکر اور اعتماد نے غیر معمولی آگہی اور انفرادیت عطا کی۔ اس غیر معمولی آگہی شعور اور انفرادیت نے شاعر کو تکبر کے بجائے عاجزی، لاپروائی کی جگہ خود شناسی اور بے حسی کی جگہ حساسیت کی دولت عطا کی۔ جس پر وہ بجا طور پر فخر کرنے پر حق جانب ہیں یہی کیفیت اُن کے قارئین کی بھی ہو سکتی ہے بلکہ ہوتی ہے کیوں کہ حیرت و استعجاب زندگی کی بے شمار باتوں، واقعات اور مشاہدات میں چھپے ہوتے ہیں ہر انسان کے حیران ہونے کا پیمانہ الگ ہے۔ شاعر ایک نفسیات دان بھی ہوتا ہے راجیش ریڈی انسانوں کے ساتھ انسانوں کے مسائل میں زندگی بسر کرنے والے شاعر ہیں۔

ہماری کلاسیکل شاعری کے عہد سے لے کر موجودہ عہد تک غزل کا پسندیدہ موضوع ''عشق'' رہا ہے عشق کے حوالے سے مختلف کیفیات زمانے کے انداز بدلتی رہیں مگر عشق کا جذبہ زندہ رہا منفرد اسلوب اور لہجوں نے اپنا رنگ دکھایا ہے دیکھنا یہ ہے کہ عہدِ عصر میں رومانی یا عشقیہ شاعری کی گنجائش ہے یا نہیں ہے یہاں شاعر کا ''وجدان'' اور ''جمالیات'' کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ راجیش ریڈی کا جمالیاتی شعور، وجدان کے ذریعے حیات کے تلخ و شیریں تجربے کو ایک سلسلۂ خیال کی صورت میں سامنے لاتا ہے۔ شبلی نعمانی نے شعر العجم کی جلد چار میں:

''شاعری کو ایک ذوقی اور وجدانی چیز قرار دیا ہے۔ انسانی معاشرے کی کل سائنس اور فلسفے سے نہیں بلکہ جذبات سے چل رہی ہے، شاعری جذبات کی نمائندگی کرتی ہے''

انسان جب تک زندہ ہے مختلف جذبات بھی زندہ رہیں گے۔ راجیش ریڈی کے کلام میں جذبات بھی ہیں اور محسوسات بھی ہیں، تلخیاں بھی ہیں اور سماجی و معاشی مجبوریاں بھی ہیں۔ کسی کو پانا یا پا کر کھو دینا ایک الگ کیفیت ہے اور کسی کو زندگی بھر خلوت و جلوت میں لمحہ لمحہ محسوس کرنا دوسرا جذبہ ہے:

جب بھی ہاتھوں میں تیرا ہاتھ آیا
میں نے محسوس کر لیا خود کو
جس میں نہ تیرے نام سے مجھ کو پکارا جائے
ایسی کسی گلی کی طرف میں نہیں گیا

راجیش ریڈی کی غزل کا عاشق مہذب، شائستہ اور رکھ رکھاؤ والا ہے اظہارِ محبت کا انداز نکھرا ہوا اور مشرقی روایت سے جُڑا ہوا ہے جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے:

اتنی جلدی نہ گرا اپنے حسیں رخ پہ نقاب
تو مجھے ٹھیک سے حیران تو ہو لینے دے

ڈھونڈتے رہ گئے سب لوگ کوئی دوسرا رنگ
رنگ سب میرے سخن میں تری چھب کے نکلے

وصال و ہجر کے محسوسات کو کس اپنائیت اور رازداری کے انداز میں نظم کیا ہے۔

شب ہجراں کے اندھیروں میں اضافہ ہی ہوا
تیری یادوں کے دیے جب بھی جلائے میں نے

شاعر اپنی ''انا'' کو بالکل اسی طرح عزیز رکھتا ہے جس طرح زندگی میں ملنے والی محبت اور محبت میں ملنے والے دکھ۔

کسی سے اس نے بھی پوچھا نہ مرا حال احوال
سنانے میں بھی اُسے اپنی داستان نہ گیا

ان کی رومانی شاعری میں کلاسیکیت کا پُرکشش رنگ ہے مگر یہ رنگ ہلکا دیدہ زیب ہے جس کے سبب ان کے اشعار کتابوں میں رکھے پھول کی نازک پتیوں کی طرح ہیں جن کی خوشبو اور رنگ محسوس ہوتے ہیں یادیں تازہ کرتے ہیں۔ راجیش ریڈی ردکی ہوئی شعری روایت سے کامیابی کے ساتھ بچ نکلے ہیں۔ وہ لفظ کو سنوارنے، تراشنے اور لفظ کے معنی کو نکھارنے کا فن جانتے ہیں اس صناع گری میں زاویہ فکر کی تازہ گری اور جمالیات کا حسن برقرار رہتا ہے:

زمانہ ہو گیا ان کو گئے ہوئے راجیشؔ
یہ دل سے سلسلہ یادِ رفتگاں نہ گیا

ایک مدت سے میں سمجھائے چلا جاتا ہوں
دل مگر مانتا کب ہے کہ وہ اب میرے نہیں

اک بار دیکھ لیں جو وہ تیرے بدن کا نور
قدموں میں تیرے انجم و مہتاب گر پڑیں

تیرا جمال اپنی جگہ ہے مگر اے دوست
لب پر تیرے نکھار ہمارے ہی لب سے ہے

کچھ اشعار پڑھ کر شاعر لمسیات کہنے کو جی چاہتا ہے:

پھول کے ہونٹوں سے خوشبو کے معانی سُن کر
اپنا شعر اچھا لگا تیری زبانی سُن کر

شاعر کا مضبوط خیال ہے کہ زندگی کے مختلف صادق جذبوں کی طرح ''عشق'' بھی ایک خوبصورت جذبہ ہے جو ملن کا محتاج نہیں یہ جذبہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے ملنا بچھڑنا، وفا جفا اور وصال و ہجر اس کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں:

دل تھا کسی نے توڑ دیا کھیل کھیل میں
اتنی ذرا سی بات پہ کیا ہاؤ ہُو کریں

غالب نے کہا تھا:

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شاعر کی اس خواہش کو کیا نام دیں:

دل پھر بضد ہے پھر اسی کوچے میں جائیں ہم
پھر ایک بار وہ ہمیں بے آبرو کریں

جب شاعر ہمہ وقت کسی بھی صورت میں کوچۂ محبوب کو نہ چھوڑے تو اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ مصحفی نے اس بات کی تصدیق بہت پہلے کر دی ہے:

ترے کوچے ہر بہانے دن سے رات سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

راجیش ریڈی کے کلام پر غور کریں تو غالبؔ اور مصحفیؔ کے اشعار کو اپنا راہ نما بنا کر آگے کا راستہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اپنی کامیابی پر انکسار مگر جذبے کی شدت کے ساتھ ملاحظہ کیجیے:

بعد مدت کے تم آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا
کام آنکھوں کو ملا ہے کتنی بے کاری کے بعد

ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

''حسن و عشق غزل میں زندگی کی تمثیل بن جاتے ہیں اور شاعر، ان سے رموزِ حیات کو بے نقاب کرتا ہے۔''

یہی خوبی راجیش ریڈی کی غزل کا خاصہ ہے کہ وہ حسن و عشق اور حیات کے رموز کو نہ صرف بے نقاب کرتے ہیں بخوشی سامنا بھی کرتے ہیں۔

راجیش ریڈی کی ایک انفرادیت تفہیم کی آسانی ہے اُن کی غزل معنوی دروبست میں گہری ہونے کے باوجود مشکل ہرگز نہیں۔ ان کی غزل کے مطالعے کے بعد عام قاری ''عام'' نہیں رہتا بلکہ اس کی فکر اور سوچ کے زاویے آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے ہیں۔ شاعر کے فکری ارتقا کے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے قاری خوش گوار تازگی، اپنائیت اور ندرتِ خیال سے ہم آغوش ہوتا ہے تو وہاں اُس کا قیام زیادہ دیر رہتا ہے یہی شاعر کی کامیابی ہے۔ ان کی غزل ان کے ذہن کی ایک بسیط اور حیرت انگیز فکر کا استعارہ ہے ان کی غزل کا کینوس وسیع اور بلیغ ہے اسلوب میں تنوع اور موضوعِ سخن میں نیا پن ہے۔

- بقیہ -

شاعری میں ہجر و وصال

گھر سے نکلے تھے حوصلہ کر کے
لوٹ آئے خدا خدا کر کے

راجیش ریڈی کی شاعری خدا کی شاعری نہیں بندوں کی شاعری ہے وقت سے آنکھیں چرانے کی نہیں وقت سے آنکھیں ملانے کی شاعری ہے بے پروائی نہیں بیداری کی شاعری ہے انسان کے 'وجود' اور حقوق کی شاعری ہے انسانیت کے 'اڑان' کی شاعری ہے، معاشرے کو مُردہ ہونے سے بچانے والی شاعری ہے اور معاشرے کو ابھی اس شاعری کی بیحد ضرورت ہے۔

میرے لب تو ابھی کھلے ہی نہیں
اور تو کہہ رہا ہے بات سمیٹ

☆

شاعری میں ہجر و وصال

ارشاد خان سکندر
(دہلی)

کسی دن زندگانی میں کرشمہ کیوں نہیں ہوتا
میں ہر دن جاگ تو جاتا ہوں، زندہ کیوں نہیں ہوتا

اس شعر کے خالق ہیں جناب راجیش ریڈی۔

یہ بات سو فیصد سچ ہے کہ شعر کی تشریح کرنے سے شعر کے معانی سمٹ جاتے ہیں اسلئے کوئی تشریح نہیں، صرف اس شعر کے دو لفظ 'میں اور' کیوں' پر آپ کو غور و فکر کی دعوت دینا چاہتا ہوں، ۔اگر آپ کے جسم میں ایک دل ہے اور وہ دل دھڑک بھی رہا ہے اگر آپ ابھی تک ذہنی طور پر اپاہج نہیں ہوئے ہیں اگر آپ کی آنکھیں اپنے ہونے کا پتہ دیتی ہوں، خواہ آپ عام آدمی ہوں کہ خاص، آپ کو اس 'میں' اور' کیوں' پر بار بار غور کرنا چاہیئے، لیکن اگر آپ مردہ ہیں تو یہ شعر آپ کے لیے نہیں ہے، کہ شاعری مُردوں کے لیے نہیں بلکہ معاشرے کو مُردہ ہونے سے بچانے کے لیے ہوتی ہے، اور راجیش ریڈی صاحب اس بچاؤ ابھیان میں پورے طور پر جی جان سے جٹے ہوئے نظر آتے ہیں نہ صرف جٹے ہوئے بلکہ ان کی غزلیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص گلیوں گلیوں 'جاگتے رہو' کی صدا بلند کرتا ہوا پھر رہا ہو اور اس سفر میں جگہ جگہ بقول شجاع خاور

'ایک منظر ٹھیک میری آنکھ پر آ کر لگا' کی کیفیت سے دوچار ہو رہا ہو

بعد میں ڈوبی ہوگی ناؤ
پہلے دل ڈوبے ہوں گے

بار ہا راجیش ریڈی کے اندر کا شاعر بھی اس دل اور ناؤ کے ڈوبنے سے دکھی ہو جاتا ہے، ہو بھی کیوں نہ؟ شاعر جو ہے؟

وہ آفتاب لانے کا دیکر ہمیں فریب
ہم سے ہماری رات کے جگنو بھی لے گیا

مایوسی تب اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب صبح کی آمد بھی خالی ہاتھ ہوتی ہے

کچھ نہ بدلا صبح کے اعلان سے
تیرگی ہی آئی روشن دان سے

لیکن یہاں یہ شاعر تھک ہار کر بیٹھتا نہیں بلکہ کچھ ہی دیر بعد اپنی آنکھوں سے بہتی آنسوؤں کی دھار کو پونچھ کر کمر کس لیتا ہے اسے پھر نئی امیدیں نئے راستے سجھائی دینے لگتے ہیں،

حدّ نظر سے آگے لگا تار دیکھنا
زنداں میں آ گیا پسِ دیوار دیکھنا

راجیش ریڈی صاحب فرماتے ہیں

'اللہ جانتا ہے کہ کافر نہیں ہوں، میں'

یقیناً وہ خدائے سخن میر صاحب کے اس شعر پر پوری طرح ایمان لا چکے ہیں

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

غزل کے معانی اگر محبوب سے باتیں کرنا ہے تو راجیش ریڈی کا محبوب پورا معاشرہ ہے ان کی تمام شاعری سماج کے دکھ درد میں ایک ہمدرد کی طرح ساتھ کھڑی اور سماج کو تکلیف پہنچانے والوں کے خلاف کھڑی نظر آتی ہے اور اس شاعری کی سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ اس کا لہجہ کرخت نہیں ہے، شاعری کو شاعری ہی رکھنا اسے تقریر ہونے سے بچا لینا راجیش ریڈی کا کمال فن ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں

آپ کہتے ہیں جسکو خاموشی
ہم تو شاعر اسی زبان کے ہیں

میری تھوڑی سی سمجھ کے مطابق یہی تو ہے کمال فن۔

حضرت غلام ہمدانی مصحفی صاحب (جنہوں نے زبان کی نوک پلک سنوارنے میں پوری عمر خرچ کر دی) کا ایک مطلع ہے

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

اس مطلعے کی یاد دیوں آئی کہ راجیش ریڈی صاحب نے بھی اس زمین میں شعر کہے ہیں اور کیا خوب شعر کہے ہیں،

ایسا لگا کہ جیسے دنیا ہی باندھ لی ہو
کچھ اس ادا سے اس نے زلفوں کے بال باندھے

جب تک مرے سخن کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں
میں نے بھی شاعری میں ہجر و وصال باندھے

صرف حضرت مصحفی ہی نہیں اور بھی بزرگوں کی زمینوں میں بھی راجیش ریڈی صاحب نے خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔

بیشتر روایت اور جدیدیت کے ملاپ سے انکی شاعری میں نغمگی اور موسیقیت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے سو آپ پڑھتے پڑھتے گنگنانے بھی لگتے ہیں

جو نیا ہے وہ پرانا ہوگا
جو پرانا ہے نیا تھا پہلے

جانے کتنی اڑان باقی ہے
اس پرندے میں جان باقی ہے

باقی صفحہ ۴۱ پر ملاحظہ کیجیے

حسیں رخ پہ نقاب

پرویز ساحر
(ایبٹ آباد)

جدید وقدیم کے حریرِ دو رنگ اور زمانی تقدّم کا عذر اپنی جگہ مگر غزل میں جدّت زائی لانا کلاسیکی شعریات اور روایت آشنائی بغیر ناممکن ہے۔ شاعری تاثرات وخیالات کا خارجی اظہار یہ ہی سہی' مگر شاعری میں شعریت اور ادبیت کو کسی طور دائرہ اہمیّت سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

افسوس کا محل ہے کہ زندہ شعری روایت سے نا آشنا اور زبان سے نا بلد کم کوش اور نام نہاد جدید شاعروں کی بے رس غزلیہ شاعری میں مایوس کُن بے مہابانہ رویّے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔

شاعر اپنے منتشر ادراک (Dispersed Cognition) اور فکری آوارگیوں کی شیرازہ بندی کر کے متخیّلہ کی ہنگامہ آرائیوں کا سامان باہم کرتا ہے۔ شاعری میں یوسفِ مُلکِ معانی کوئی کوئی ہوتا ہے۔

غزل تمدّنی منزلیں طے کر کے تخلیقی ارتقا (Creative Evolution) کے بعد جس مقام تک آن پہنچی ہے اب اس نزتکی کی خوش قبائی اور جمالِ جہت آشنا دیدنی ہے۔ البتّہ منفی غزل کو جدیدیت کے ساتھ متلازِم کرنا نِری جہالت ہے۔

راجیش ریڈی کا تعلق بمبئی (بھارت) سے ہے۔ تا حال ان کا ایک غزلیہ مجموعہ ' وجود ' ریختہ ویب کے توسّط سے ادبی دنیا میں دھوم مچا چکا۔ موصوف کا اصل حوالہ غزل ہی ٹھہرتی ہے' سودر ایں خصوص انتقادیانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ان کی غزل کے شعری اوصاف (Poetic Attributes) کو مختصرا نشان زد کیا جاتا ہے۔

راجیش ریڈی کی غزل میں ' لذّت بخش داخلی ہم آہنگی (Symphonic Enjoyable Interier Being)' وجود وعدم (And Nothingness Internal) کی جھلک اور خود کلامی (Internal Monologue) کی بھر مار ہے:

سچ پوچھیے تو عشق کسی اور کے نہیں
اپنے ہی 'انتظار' میں رہنے کی بات ہے

شام کو جس وقت خالی ہاتھ گھر جاتا ہوں میں
مسکرا دیتے ہیں بچّے اور مر جاتا ہوں میں

دھوکا ہے' اک فریب ہے' منزل کا ہر خیال
سچ پوچھیے تو سارا سفر واپسی کا ہے

زمانے کو نہیں جس کی ضرورت
میں شاید وہ ضروری آدمی ہوں

اب تو سراب ہی سے بجھانے لگے ہیں پیاس
لینے لگے ہیں کام یقیں کا۔۔۔ گماں سے ہم

میں سونے کا بہانہ کر کے اکثر سنتا رہتا ہوں
مِرے بارے میں جو باتیں در و دیوار کرتے ہیں

مرے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں
مجھے کہنا پڑا ' مَیں بھی یہیں ہوں

یوں دیکھیے تو آندھی میں بس اک شجر گیا
لیکن ' نہ جانے کتنے پرندوں کا گھر گیا

میں روشنی تھا ' مجھے پھیلتے ہی جانا تھا
وہ بجھ گئے' جو سمجھتے رہے چراغ مجھے

راجیش ریڈی اس قدر رشیتا سے شیتل اور رزل شعر کہتے ہیں کہ بندہ اُش اُش کر اٹھتا ہے۔ ان کے یاں غزل میں روایت اور جدیدیت کچھ اِس طور ہم آمیز ہوگئے کہ بس دیکھا چاہیے:

شرافت نے مجھ کو کہیں کا نہ چھوڑا
رقیب اپنے خط مجھ سے لکھوا رہے ہیں

غم چھپانے کے سو طریقوں میں
مسکرانا ہی سب سے مشکل ہے

ریت پر دُور تک یہ نقش قدم
جانے کس شخص کی تکان کے ہیں

بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں بے وفائی نہ تھی
میں انتظار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

جو دکھائی ہی نہیں دیتا کہیں
دیکھتا رہتا ہوں اس کو دھیان سے

بعد مدّت کے تم آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا
کام آنکھوں کو مِلا ہے کتنی بے کاری کے بعد

دُکھ کی پرتیں کھولنے والے ہوتے ہیں
کچھ سنّاٹے بولنے والے ہوتے ہیں

وہ آفتاب لانے کا دے کر ہمیں فریب
ہم سے ہماری رات کے جگنو بھی لے گیا

راجیش ریڈی غزل میں نئی معنویت کے باوصف نئے شعری تیور رکھتے ہیں۔ محیّر العقول مضمون آفرینی ان کا اصل فنی وَتیرہ ہے:

اُن آنکھوں کی بینائی کس کام کی ہے
جو حیرت سے کم پر راضی ہو جائیں

ہم کو بھی تیز لگتی تھی رفتار وقت کی
لیکن یہ انتظار سے پہلے کی بات ہے

اِتنی جلدی نہ گرا اپنے حَسیں رخ پہ نقاب
تو مجھے ٹھیک سے حیران تو ہو لینے دے

ساری کی ساری اگر مِل بھی گئی دنیا تجھے
یہ بتا تو کیا کرے گا ساری کی ساری کے بعد

عمر بھر جن کو عقیدوں نے لڑائے رکّھا
بعد مرنے کے وہ سب ایک ہی رب کے نکلے

جاگیں تو احتیاط سے پلکوں کو کھولیے
ایسا نہ ہو کہ آنکھوں سے کچھ خواب گر پڑیں

میری آنکھیں یہ کہا کرتی ہیں اکثر مجھ سے
آپ دیکھی ہوئی چیزوں کو بہُت دیکھتے ہیں

بعد میں ڈوبی ہوگی ناو
پہلے دل ڈوبے ہوں گے

سُورج کی روشنی تو ہمیں چاہیے، مگر
ہم یہ بھی چاہتے ہیں، کبھی دوپہَر نہ ہو

راجیش ریڈی جدید غزل کے جمالیاتی منظرنامہ (Aesthetical Scenario) میں بندھے ٹکے معیار سے الگ تھلگ (Disunified) ادبی مَقام رکھتے ہیں۔ راجیش ریڈی اپنے پیش تر ہم زمانی غزل گویاں کی بَہ نسبت صحیح معنوں میں تازہ بیان اور جدید طرزِ اظہار کے حیرت یاب غزل گو ہیں۔

Present of Mind

A lady in a faded grey dress and her husband dressed in a home made suit walked in timidly without an appointment into the Harvard University President's outer office.

The secretary could tell in a moment that such backwoods individuals had no business at Harvard and probably did not even deserve to be in Harvard.

"We want to see the President" the man said softly.

"He will be busy all day" the lady secretary snapped.

"We will wait" the lady replied.

For hours the secretary ignored them hoping that the couple would finally become discouraged and go away. They did not and the secretary grew frustrated and finally decided to disturb the president.

"Maybe if you see them for a few minutes, they will leave" she said to him. The president. stern faced and with dignity strutted towards the couple.

The lady told him "We had a son who attended Harvard for one year. He loved Harvard. He was happy here. But about a year ago he was accidentally killed. My husband & I would like to erect a memorial for him, somewhere on the campus".

The president was not touched, in fact he was shocked. "Madam" he said gruffly "We cannot put up a statue for every person who attended Harvard and died. If we did, this place would look like a cemetery".

"Oh No..No.." the lady explained quickly. "We do not want to erect a statue. We thought we would like to give a building to your Harvard in his fond memory".

The president rolled his eyes. He glanced at the lady's dress and man's suit and then exclaimed: "A Building?

"Do you have any earthly idea how much a building costs? We have over seven and a half million dollars in the physical buildings here at Harvard. For a moment the lady was silent. The president was pleased. Maybe he could get rid of them now.

The lady turned to her husband and said quietly "Is that all it costs to start a University? Why don't we just start our own?" Her husband nodded. The president's face wilted in confusion and bewilderment.

Mr. & Mrs. Leland & Jane Stanford got up and walked away, travelling to Paolo Alto, California where they established the University that bears their name: Stanford University - a memorial to a son that Harvard no longer cared about.

Most of the time we judge people by their outer appearance which can be misleading. And in the impression, we tend to treat people badly by thinking they can do nothing for us. Thus we tend to lose out potential good friends, employees or customers.

Though, it may not be convenient for you, do your best to always be supportive. Especially to your friends even if you think they can't offer you anything. Arrogance is a killer of friendship. A soft word turns away wrath! Humility is a virtue, so, please continue with it.

83 Noble prize winners till now are from this University!

''صحرا میں نقشِ پا''

(جناب راجیش ریڈی کے غزلیہ کلام کی بہار)

فاری شا (راولپنڈی)

مدت سے وہی جلتا مکاں گھوم رہا ہے
آنکھوں میں مری اب بھی دھواں گھوم رہا ہے

ڈر ہے نہ کہیں کر لے رخ آنکھوں کا کسی دن
سینے میں یہ جو درد نہاں گھوم رہا ہے

خاموش ہی رہنا ہے جو ہر بات پہ تجھ کو
رکھے ہوئے کیوں منہ میں زباں گھوم رہا ہے

ہر رات یہی پوچھا مرے رستوں نے مجھ سے
اس رات میں اس وقت کہاں گھوم رہا ہے

آنکھوں نے تو منظر پہ یقیں کر لیا کب کا
دل ہے کہ لئے اب بھی گماں گھوم رہا ہے

..... ○ .....

☆

دنیا کو ریشہ۔ ریشہ اُدھیڑیں ، رفو کریں
آ بیٹھ تھوڑی دیر ذرا گفتگو کریں

جس کا وجود ہی نہ ہو دونوں جہان میں
اُس شئے کی آرزو ہی نہیں جستجو کریں

دنیا میں اک زمانے سے ہوتا رہا ہے جو
دنیا یہ چاہتی ہے وہی ہو بہ ہو کریں

ان کی یہ ضد کہ ایک تکلف بنا رہے
اپنی تڑپ کہ آپ کو تم، تم کو تو کریں

ان کی نظر میں آئے گا کس دن ہمارا غم
آخر ہم اپنے اشکوں کو کب تک لہو کریں

دل تھا کسی نے توڑ دیا کھیل۔ کھیل میں
اتنی ذرا سی بات پہ کیا ہاؤ - ہُو کریں

دل پھر بضد ہے پھر اسی کوچے میں جائیں ہم
پھر ایک بار وہ ہمیں بے آبرو کریں

○

☆

سربازار بھی خود دار ہوئے بیٹھے ہیں
ہم خود اپنے لئے دشوار ہوئے بیٹھے ہیں

وہ کسی اور کا بیمار ہوا ہے اور ہم
ایک بیمار کے بیمار ہوئے بیٹھے ہیں

موت ہی 'آئی ، ابھی آئی' کہے جا رہی ہے
ہم تو کب سے یہاں تیار ہوئے بیٹھے ہیں

جن کو رستے کی خبر ہے نہ پتہ منزل کا
قافلے کے وہی سالار ہوئے بیٹھے ہیں

کہیں پل بھر کے لئے بھی نہیں ٹکتی نظریں
جانے کس شئے کے طلب گار ہوئے بیٹھے ہیں

کوئی پوچھے تو سہی حال کہ اک مدت سے
درد آمادۂ گفتار ہوئے بیٹھے ہیں

لوگ ڈرتے ہیں نہ ہونے کے تصور بھر سے
اور ہم ہونے سے بیزار ہوئے بیٹھے ہیں

○

☆

زمیں کافی نہ تھی اور آسماں کم کم بہت ہی کم
مری وسعت کو تھے دونوں جہاں کم کم بہت ہی کم

مرے تو روز و شب ہوتے رہے ہیں خرچ اوروں پر
مرے کام آئے میرے جسم و جاں کم کم بہت ہی کم

خدا کا شکر اک دوری بنائے رکھی دنیا سے
کرم اس کا ہوئے ہم رائیگاں کم کم بہت ہی کم

محبت نام ہے جس کا اک ایسی آگ ہے جس میں
جلن بھرپور ہوتی ہے دھواں کم کم بہت ہی کم

کہاں صحرا میں نقش پا ملیں گے ہر مسافر کے
یہاں رہ جاتے ہیں نام و نشاں کم کم بہت ہی کم

..... ○ .....

☆

چھوڑ کے جاتے ہوئے دیکھے ہیں سائے میں نے
ایک ہی صف میں رکھے اپنے پرائے میں نے

ناز کے ساتھ ندامت سے بھی بھر دیتے ہیں
وہ نشانے جو مچانوں سے لگائے میں نے

شب ہجراں کے اندھیروں میں اضافہ ہی ہوا
تیری یادوں کے دیے جب بھی جلائے میں نے

ڈوب کر سنتی رہی دیر تلک تنہائی
جب اداسی کے نئے راگ سنائے میں نے

اپنے مرنے کی خبر لوگوں کو لگنے نہیں دی
اِس کے اُس کے تو کئی سوگ منائے میں نے

اپنے بارے میں رہا رائے پر اپنی قائم
اپنے بارے میں نہ لی اوروں سے رائے میں نے

اپنی مرضی سے سرائے میں کہاں آیا تھا میں
اپنی مرضی سے کہاں چھوڑی سرائے میں نے

○

☆

ہم جی رہے ہیں جان ! تمہارے بغیر بھی
ہر دن گزر رہا ہے گزارے بغیر بھی

سب کے لئے کنارے پہ ہوتا نہیں کوئی
کچھ لوگ ڈوبتے ہیں پکارے بغیر بھی

آسان ہوگا مرنا سمجھ لیں جو ہم یہ بات
دنیا یوں ہی رہے گی ہمارے بغیر بھی

جیتے بغیر جیتنے والوں کے دور میں
کچھ لوگ ہار جاتے ہیں ہارے بغیر بھی

ایسے بھی ہیں جو ڈوب گئے دل کے ساتھ ساتھ
دریا میں اپنی ناؤ اتارے بغیر بھی

ہر حال میں بڑے ہی رہیں گے جو ہیں بڑے
وہ آسماں ہیں چاند- ستارے بغیر بھی

یارب ! ہر اِک طلسم تری کائنات کا
کھلنے لگا ہے ہم پہ اشارے بغیر بھی

○

☆

اس ڈر سے میں قمیص کبھی جھاڑتا نہیں
کب جانے آستین سے احباب گر پڑیں

جاگیں تو احتیاط سے پلکوں کو کھولئے
ایسا نہ ہو کہ آنکھوں سے کچھ خواب گر پڑیں

اک بار دیکھ لیں جو وہ تیرے بدن کا نور
قدموں میں تیرے انجم و مہتاب گر پڑیں

اتنا بھی مت بڑھایئے رختِ سفر کہ کل
جب پوٹلی اٹھائیں تو اسباب گر پڑیں

رہنے بھی دیں نہ منہ مرا کھلوایئے جناب
ایسا نہ ہو کہ آپ کے القاب گر پڑیں

..... ○ .....

☆

دن کو گھڑی میں باندھ، رات سمیٹ
اے خدا !اب یہ کائنات سمیٹ

میرے لب تو ابھی کھلے ہی نہیں
اور تو کہہ رہا ہے بات سمیٹ

کام باقی ہیں سو ابھی یا رب!
اتنی جلدی نہ اپنے ہاتھ سمیٹ

کچھ بھروسا نہیں عناصر کا
اپنی بکھری ہوئی حیات سمیٹ

''اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائے''
زندگی سے تعلّقات سمیٹ

دیکھتا کیا ہے آسمانوں سے
آ زمیں کے معاملات سمیٹ

مخبری پر نہ کل اتر آئیں
یوں نہ شعروں میں اپنی ذات سمیٹ

○

☆

اپنے سوا کسی کی طرف میں نہیں گیا
گھبرا کے خودکشی کی طرف میں نہیں گیا

یوں ہے کہ زندگی نہیں آئی مری طرف
یوں ہے کہ زندگی کی طرف میں نہیں گیا

جس میں نہ تیرے نام سے مجھ کو پکارا جائے
ایسی کسی گلی کی طرف میں نہیں گیا

وہ یار ہے اور اس کی یہ خوبی ہی خوب ہے
اُس کی کسی کمی کی طرف میں نہیں گیا

اک سانس کی طرح ہے عبادت مرے لیے
پابند بندگی کی طرف میں نہیں گیا

عرصہ ہوا ہے آئینہ دیکھے ہوئے مجھے
کب سے اُس اجنبی کی طرف میں نہیں گیا

وہ پیاس تھی کہ سات سمندر بھی کم پڑیں
پھر بھی کسی ندی کی طرف میں نہیں گیا

○

☆

عکس موجود نہ سایہ موجود مجھ میں اب کچھ نہیں میرا موجود
نکل آتا ہوں میں اکثر باہر کوئی خود میں رہے کتنا موجود
کبھی دریا سے ہے قطرہ غائب کبھی قطرے میں ہے دریا موجود
میں ذرا بھی نہیں اس میں لیکن مجھ میں وہ سارا کا سارا موجود
جب تلک پیاس ہے تجھ میں باقی بس تبھی تک ہے یہ دریا موجود
کاش ! موجود نہ ہو اپنا کوئی جس گھڑی ہونے لگوں لا موجود

..... ○ .....

☆

جہاں آپس میں فلک اور زمیں ملتے ہیں
جو بچھڑ جاتے ہیں وہ لوگ وہیں ملتے ہیں
کچھ ہیں ایسے جو بچھڑ کر بھی جدا ہوتے نہیں
اور کچھ ہیں کہ جو مل کر بھی نہیں ملتے ہیں
ہر کوئی جا چکا خود سے کہیں ہجرت کر کے
اب کہاں اپنے مکانوں میں مکیں ملتے ہیں
مل گیا ہے جو بھلا کوئی، غنیمت جانو
ڈھونڈنے سے بھی بھلے لوگ نہیں ملتے ہیں
اتنے سادہ بھی نہیں ہوتے یہ سادہ صورت
یہ بتاتے ہیں کہیں اور کہیں ملتے ہیں
لیکن ان آنکھوں کو بھاتی ہی نہیں دوسری چھب
ملنے کو شہر میں سو ماہ جبیں ملتے ہیں
جب کبھی ڈھونڈنے جاتے ہیں ہم اپنا ثانی
کیا کریں سامنے ہر بار ہمیں ملتے ہیں

○

☆

ساری بستی پہ خوف طاری ہے
آج کیا جانے کس کی باری ہے
ہم نے موجوں کو جسم سونپ دیا
اب سمندر کی ذمہ داری ہے
جس کی پہچان ہی نہ ہو پائی
ہاں وہی لاش تو ہماری ہے
زندگی سے ہے زندگی محروم
یہ وہ بیوہ ہے جو کنواری ہے
اس کے ہاتھوں میں تیر ہے نہ کمان
وہ جو سب سے بڑا شکاری ہے
ہنستے ہنستے اداس کرتے ہو
یہ ہی عادت بری تمہاری ہے
اچھے اچھے بھی چیخ اٹھیں جس میں
ہم نے وہ خامشی گزاری ہے

○

☆

دن بسر کرتا ہوں جس طرح یہ ڈھب میرے نہیں
زندگی میری ہے، جینے کے سبب میرے نہیں

ہائے! کس تیزی سے بدلا ہے زمانے کا مزاج
غیر تو غیر میرے یار بھی اب میرے نہیں

لوگ طے کرتے ہیں کیا دیکھنا کیا کہنا ہے
میری آنکھیں نہیں میری مرے لب میرے نہیں

ایک مدت سے میں سمجھائے چلا جا تا ہوں
دل مگر مانتا کب ہے کہ وہ اب میرے نہیں

کیا کرونگا میں بھلا دونوں جہاں لے کر بھی
جن کی اس دل کو طلب ہے وہ ہی جب میرے نہیں

..... ○ .....

☆

میں راکھ ہو کے خلا میں کہاں - کہاں نہ گیا
وہاں- وہاں بھی جہاں تک مرا دھواں نہ گیا

تمام عمر مرا دورِ امتحاں نہ گیا
تھی جان جسم میں جب تک، عذابِ جاں نہ گیا

یقیں ہزار دلاتی ہی رہ گئیں آنکھیں
مگر گماں جو تھا دل میں مرے، گماں نہ گیا

سبق کے طور پہ کام آرہے ہیں لوگوں کے
ہمارا رائیگاں ہونا بھی رائیگاں نہ گیا

سفر ہمیشہ ہی مشکل پسند آیا مجھے
جہاں پہنچنا تھا آسان میں وہاں نہ گیا

کسی سے اس نے بھی پوچھا نہ میرا حال-احوال
سنانے میں بھی اسے اپنی داستاں نہ گیا

نہ قید کر سکا صیّاد جذبہ پرواز
پروں کو کھو کے بھی آنکھوں سے آسماں نہ گیا

زمانہ ہو گیا ان کو گئے ہوئے "راجیش"
پہ دل سے سلسلہ یادِ رفتگاں نہ گیا

○

☆

دل کی تسکین کا سامان تو ہو لینے دے
اے خدا! درد سے ہلکان تو ہو لینے دے

اتنی جلدی نہ گرا اپنے حسیں رخ پہ نقاب
تو مجھے ٹھیک سے حیران تو ہو لینے دے

نئی مشکل سے نوازے چلا جاتا ہے مجھے
پچھلی مشکل ذرا آسان تو ہو لینے دے

جیت سے پہلے مری ہار کی توہین نہ کر
ہارنے کا مرے اعلان تو ہو لینے دے

ہاتھ مت کھینچ ابھی زخم سے اے چارہ گر!
ذرا ناسور کا امکان تو ہو لینے دے

فائدے کے لیے بے تاب نہ ہوا تا بھی
جو بھی ہونا ہے وہ نقصان تو ہو لینے دے

زندگی! باہری جنگوں میں نہ الجھا مجھ کو
ختم اندر کا یہ گھمسان تو ہو لینے دے

○

طاہر فراز، پرویز جعفر اور غضنفر ہاشمی (ہیوسٹن)

تبسم انوار اور شاہدہ حسن کے ساتھ (ٹورانٹو)

اشفاق حسین اور بھائی عرفان ستار (ٹورانٹو)

سیما غزل، محمد علوی اور احمد سلمان کے ساتھ (بحرین)

باصر کاظمی اور عنبرین عنبر کے ساتھ (نیوجرسی)

عرفان ستار، شاہدہ حسن اور سیما نقوی کے ساتھ (ٹورانٹو)

شیکسپیئر کے روبرو (سٹیٹ فورڈ)

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

ٹورانٹو کے مشاعرے میں

مشاعرہ کے بعد گروپ فوٹو (امریکہ)

ندا فاضلی اور بشر نواز (بھوپال)

کینیڈا کے مشاعرے کی گروپ فوٹو

جناب مسعود اشعر کے ساتھ (بحرین)

جگجیت سنگھ کے ساتھ (ممبئی)

عباس تابش اور باصر کاظمی کے ساتھ (امریکہ)

کامیڈی کنگ عمر شریف کے ساتھ (نیوجرسی)

ہندی کے مہان کہانی کار گیان رنجن جی کے ساتھ

سحر انصاری صاحب کے ساتھ (امریکہ)

جشنِ سحر انصاری (ہیوسٹن)

راحت اندوری کے ساتھ (لندن)

راج ببر، مثالی اور بھوپندر سنگھ (ممبئی)

بھائی عرفان کے ساتھ (ٹورانٹو)

اسٹیج فلم اداکار مکرند دیش پانڈے کے ساتھ (ممبئی)

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے ساتھ (دوبئی)

گریٹ کرکٹ لیجنڈ کپل دیو کے ساتھ (چندی گڑھ)

لیجنڈ احمد مشتاق کے ساتھ (ہیوسٹن)

بھائی راشد علی کے ساتھ (مونٹریال ائیر پورٹ)

"بادشاہِ عجم"

نعتِ رسول مقبولؐ

یہی ماننا ہے یہ مان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ
وہ خدا نہیں ہیں یہ جان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

وہ ہیں میر بدر و حنین کے، نہیں صرف نانا حسین کے
یہی شرطِ ایماں ہے ٹھان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

وہ بغیر عین عرب نہیں وہ رسول ہیں کوئی رب نہیں
یہی احترام ہے مان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

وہ عرب کے بے تاج بادشاہ وہ عجم کے بھی تو ہیں خیر خواہ
انھیں چھوڑ کر نہ جہان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

وہ جو انبیا کے امام ہیں تو اُنہی کے ہم بھی غلام ہیں
نہ تو ہم پہ تیر و کمان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

وہ خلاف فطرت و حق نہیں، کبھی بھولنا یہ سبق نہیں
تو یقین لے کہ گمان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

سبھی رنگ و بو کے اسیر ہیں کوئی میرزا کوئی میر ہیں
تو غلام جن کا ہے جان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

وہ قسم خدا کی بشر سہی مگر ان پہ آتی ہے وحی بھی
انھیں اپنے جیسا نہ جان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

تو رؤف خیر ہے اُمتی تو پناہ گاہ یہی تری
نہ کہیں بھی جا کے امان لے وہ ہیں عبدہٗ و رسولہٗ

ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

نعتِ رسول مقبولؐ

میں آرزو کی حدوں سے گذرنا چاہتا ہوں
حضور سجدہء تعظیم کرنا چاہتا ہوں

درود پڑھنے کی توفیق آپ دیتے ہیں
سو میں درود کے صدقے نکھرنا چاہتا ہوں

جہاں حضور نہاں بھی ہیں اور عیاں بھی ہیں
میں اس جگہ پہ عقیدت سے مرنا چاہتا ہوں

حضور آپ کا جلوہ ہے کائنات عظیم
میں کائنات کا ذرہ سنورنا چاہتا ہوں

حدود زیست کی پروا ہے کب مجھے انجم
سو خاک طیبہ میں مل کر بکھرنا چاہتا ہوں

انجم جاوید (کراچی)

''ہیلن جارج گرین''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

اخبار پڑھنے میں میرا دل نہیں لگا۔ میں نے اخبار ایک طرف رکھ کر ٹی وی آن کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس سے بھی دل بیزار ہو گیا۔ میں نے سوچا ناول ختم کر لوں تکہ واپس کر سکوں۔ کل ہی لائبریری سے مسز میکنزی کا فون آیا تھا کہ میں لیٹ ہو گئی ہوں۔ ناول میں بھی دل نہیں لگا۔ ایسا تو پہلے بھی کئی بار ہوا تھا کہ میری اور فلپس اپنی اسٹڈی کی وجہ سے ویک اینڈ میں مصروف ہوتے اور میں گھر کے کام کاج نمٹانے میں مصروف ہو جاتی کیونکہ مجھے بھی پورے ہفتے کے مسائل جوب کی وجہ سے انہی دنوں میں نمٹانا ہوتے۔ میں نے چابی اٹھائی گاڑی اسٹارٹ کی اور لانگ ڈرائیو کے خیال سے چل دی۔ پتہ نہیں کون کون سے خیالات ذہن میں گردش کر رہے تھے اور انہی خیالات میں غوطہ زن میں ڈرائیو کرتی رہی۔ نرم نرم مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس ہوتے ہی میں نے روڈ سائنز (Road Signs) پر نظر کی۔ میں لیک روڈ پر تھی۔ یہ جگہ مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔ شاید اسی لیے میں غیر ارادی طور پر یہاں پہنچ گئی۔ خوبصورت جھیل اور اس کا صاف، شفاف نیلگوں بہتا ہوا پانی ساری اداسی، ساری تنہائی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کیسا رشتہ ہے ان ابھرتی ڈوبتی لہروں سے انسان کا۔۔۔؟

میں نے گاڑی پارک کی اور جھیل کے ایک طرف تھوڑی اونچائی پر بنے لان کی سیڑھیاں چڑھ کر وہاں پہنچ گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے سبز رنگ کا رپٹ بچھا دیا ہے خوبصورت پھولوں اور پھلوں کے درختوں سے مزّین یہ لان رات کی بارش کی وجہ سے اور نکھر گیا تھا سارا سبزہ زمردی رنگ کا دکھائی دیتا تھا۔ گلاب اور بیلے کی بھینی بھینی خوشبو سے پورا لان مہک رہا تھا۔ بڑا ہجوم تھا۔ ویک اینڈ ہو اور موسم اچھا ہو تو ہجوم لازمی ہے۔ بچے بڑے سب انجوائے کر رہے تھے کوئی جھیل کے پاس کوئی لان میں۔ بعض لوگ بونگ کر رہے تھے۔ کچھ کنارے پر کھڑے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کنارے کنارے سفید بطخیں قیں قیں کرتی ہوئی تیر رہی تھیں جیسے وہ بھی موسم کے مزے لے رہی ہوں۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لان میں آ گئی اور درختوں کے سائے میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ سامنے ایک کنج میں درختوں کے جھرمٹ میں بہت ساری چڑیاں چہچہاتی ہوئی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدک رہی تھیں۔ پیلی چونچ، نارنجی اور ہرے پروں والی یہ چڑیاں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کافی دیر تک اس حسین نظارے میں قدرت کی کاریگری دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ اچانک کسی بچے کی بڑی سی گیند ایک درخت سے ٹکرائی اور ساری کی ساری چڑیاں اڑ گئیں۔ جب وہ اڑتی ہوئی جا رہی تھیں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے فضا میں نارنجی، ہرے اور پیلے رنگ کے ستارے جھلملا رہے ہوں۔ میں دور تک ان کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ اپنی منزل کی جانب میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میرا دل بھی نہیں لگا۔ میں نے سوچا کیوں نہ کافی پی جائے۔ میں ریسٹوراں کی طرف چل دی جو لان کے ساتھ ہی تھا۔ یہاں بھی خاصا رش تھا۔ میں نے دیکھا کونے میں دو میز خالی تھیں۔ یہ جگہ کھلی ہوئی تھی لیکن اوپر شیڈ ہونے کی وجہ سے دھوپ نہیں آ رہی تھی۔ یہ جگہ مجھے پسند آئی اور میں وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ اس جگہ میں ایک یہ بھی خوبی تھی کہ یہاں سے جھیل بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پانی کی ریشمی لہریں دور سے مچلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں یہ لہریں نت نئے رنگوں میں تبدیل ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ کبھی گہرا سبز، کبھی ہلکا سبز، کبھی ہلکا نیلگوں اور کہیں کہیں اس نیلگوں رنگ کے ساتھ گلابی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ لہریں سنگیت کی پائل پہنے دور تک گیت سناتی چلی جاتیں اور میں لہروں کے اس مدھر گیت کے سحر اور جھیل کے حسن میں کھوئی ہوئی تھی۔

''ہیلو''

ایک جانی پہچانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سامنے جارج کھڑا تھا۔

پانچ سال کے بعد آج میں نے جارج کو دیکھا۔

''ہائے مائی لائف'' میں نے مسکراتے ہوئے جارج سے کہا۔ شاید میں اس کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔

''آئی ایم ناٹ یور لائف'' جارج بولا۔

''اوکے'' میں نہیں چاہتی تھی کہ اتنے برس بعد جارج ملا ہے اور اس وقت کوئی لمبی بحث کی جائے۔ اگرچہ مجھے یہ کہنے کا حق تھا میں نے اس کے ساتھ بیس سال گزارے تھے۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا:

''اگر تم میرا ساتھ دیتیں اور میرا کہا مانتیں تو ہم لوگ علیحدہ نہ ہوتے۔ تم نے کبھی میرے گھر والوں کو ویک اینڈ پر دعوت نہیں دی۔''

''جارج تم جانتے ہو میں ویک اینڈ پر دوسری جگہ جوب کرتی تھی کیونکہ ہمارا خرچ پورا نہیں ہوتا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

برابر والے گھر سے کھانوں کی اچھی اچھی خوشبوئیں آتی تھیں اور ہمیں ناشتے میں سینڈوچز اور کافی پر گزارا کرنا ہوتا تھا۔ اور بچوں پر تم نے کتنی پابندیاں لگائی تھیں۔ ڈیٹ پر مت جانا، زیادہ وقت دوستوں میں نہیں گزارنا بس پڑھائی پر دھیان دینا اور جب ایک مرتبہ میری کومی نے ڈیٹ پر بھیج دیا تھا بغیر تمہیں بتائے تو تم نے کتنا ہنگامہ کیا تھا۔ اوراف! تمہاری تقریریں۔ ڈرنک مت پیا کرو۔ صحت خراب ہو جائے گی۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔'' جارج بولتا گیا۔

''جارج بچوں کی اچھی تعلیم اور تربیت کے لیے ضروری تھا یہ سب کچھ۔۔۔ میری ماں نے مجھے کبھی بھی ڈیٹ پر جانے نہیں دیا تھا۔ پھر تم نے خوشی خوشی مجھ سے کیوں شادی کی تھی۔ اور اس وقت تو تم میرے ہم خیال تھے۔'' میں

نے جارج کو بیچ میں روک کر کہا۔

''تو کیا بن گئے تمہارے بچے۔'' اس نے پوری کڑواہٹ کے ساتھ کہا۔

''میری ڈاکٹر بن رہی ہے اور فلپس سی۔اے کر رہا ہے۔'' میں نے جارج کی طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز میں کہا۔

مگر اس نے میری بات کو نظرانداز کر دیا اور کہنے لگا ''تم نے کبھی سمر (Summer) انجوائے نہیں کرنے دیا۔ ہمیشہ یہ بہانہ وہ بہانہ، یہ پابندی وہ پابندی'' وہ بولے جا رہا تھا۔

''جارج تم جانتے ہو کہ ہماری مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تمہاری کبھی بھی کوئی مستقل جوب نہیں رہی تھی۔ میں دو دو جوب کرتی تھیں۔ گھر کے اخراجات بچوں کے تعلیم کے اخراجات، بچوں کے اخراجات یہ سب بہت ہوتے تھے۔ اور بچے ہی ہماری سب سے پہلی ترجیح تھے۔ مگر اب۔۔۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا بہت دیر ہو گئی۔۔۔؟'' میں نے نرمی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر وہ تو جیسے میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا۔

''میں فی الحال سمر (Summer) انجوائے کر رہا ہوں اور مجھے زندگی انجوائے کرنے دو۔ تمہارے پاس تو زندگی صرف ذمہ داریوں کا نام ہے سو تم نبھاؤ۔۔۔'' وہ اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔۔۔ اٹھا اور مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی تمام کڑواہٹ اُگل کر جا رہا تھا اس نے کافی بھی نہیں پی جو میں نے اس کے لیے منگوائی تھی۔ میں نے اسے اپنی بصارت میں دور تک اور دیر تک پکڑے رکھا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ موسم کے مزے لوٹنے سے اس کی کیا مراد ہے۔ سمندر، پانی کی موجیں، ساحل کے نظارے۔۔۔ اور۔۔۔ کوئی سی بھی عورت۔۔۔

مجھے وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے ایسے ہی ایک سمر کی دوپہر تھی اس دن میری چھٹی تھی بچے بھی دونوں گھر پر تھے۔ ہم سب لنچ کر رہے تھے ''جارج نے کہا ہمیں کہیں گھومنے پھرنے چلنا چاہیے تم آفس سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لو اور ہم سب فلورڈا (Florida) چلتے ہیں۔ ہوٹل میں یہیں سے بک کرا لیتا ہوں۔''

''جارج مگر فلپس اور میری دونوں کے سمسٹر کی فیس جانی ہے اور اس کے بعد کہاں اتنے پیسے بچیں گے کہ ہم جا سکیں۔۔۔''

جارج غصّہ سے سرخ ہو گیا مگر بولا کچھ نہیں۔ اور پھر دوسرے دن اس نے اپنا سارا سامان سوٹ کیس میں ڈالا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''میں جا رہا ہوں''

''مگر کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ لیکن اس گھٹن سے بہت دور۔''

میں نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ چلا گیا۔ میں نے سوچا دو چار مہینے میں واپس آ جائے گا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا اور آج پانچ سال گزرنے کے بعد وہ اس طرح ملا اور مجھ پر الزامات کو بوچھاڑ کر کے چلا گیا۔

میں چاہتی تھی وہ رک جائے میرے ساتھ گھر چلے اور ہم پھر ایک بار ساتھ زندگی گزاریں۔ شاید میں اس سے ابھی بھی بہت محبت کرتی ہوں۔

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا جب وہ ایک سے زائد عورتوں والا ہو سکتا ہے تو میں ایک سے زائد مرد والی کیوں نہیں ہو سکتی؟

میرے لیے بھی تو دوسرا مرد عرصۂ دراز سے موجود ہے۔

ڈینس بیرل (Dennis Bryll) جو میرے ساتھ برسوں سے کام کرتا ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہے کب سے۔۔۔؟ اور شاید آج بھی وہ میرا منتظر ہو۔۔۔ لیکن میں تو آج بھی مسز ہیلن جارج گرین ہوں۔۔۔

میں پتھر کے زمانے کی عورت نہیں ہوں کہ اس کی اجازت دے دوں کہ کوئی بھی مرد مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اپنے غار میں لے جائے۔

میں نے جھیل کی طرف نظر کی ڈوبتے ہوئے سورج نے جھیل کے پانی میں سینکڑوں فانوس روشن کر دیے تھے۔ میں اٹھی ایک نئے عزم کے ساتھ۔ کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔

نوبل ون ٹو نٹی

طبقاتی اور جنسی استحصال کے ذاتی تجربات پر مبنی ناول لکھنے والی فرانسیسی مصنفہ اینی ایرناکس نے سال 2022 کا نوبل انعام برائے ادب اپنے نام کر لیا۔ مصنفہ کو یہ انعام دلیرانہ اور تنقیدی اندازِ تحریر رکھنے پر دیا گیا۔

قلم کی طاقت پر یقین رکھنے والی 82 سالہ اینی ایرناکس کا کام غیر مصلحت پسندی پر مبنی ہے اور سادہ زبان میں لکھا گیا ہے۔

ادب کا نوبل انعام فرانسیسی خاتون ادیب اینی ایرناکس کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ سویڈش اکیڈمی نے کہا ہے کہ بیاسی سالہ اینی ایرناکس نے اپنی تصانیف میں معاشرتی مسائل کو انتہائی عمدگی سے بیان کیا ہے اور ان کی گہری سماجی سمجھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ اپنی سوانحی کتابوں میں اینی ایرناکس نے فرانسیسی معاشرے میں محبت، سیکس، اسقاطِ حمل اور شرم کے موضوعات پر اپنا ذاتی اور جذباتی نکتہ نظر پیش کیا ہے۔ ان کی متعدد کتابیں عالمی شہرت یافتہ ہیں۔ ادب کا نوبل انعام 119 شخصیات کو مل چکا ہے جبکہ اینی ایرناکس یہ اعزاز حاصل کرنے والی 9 ویں خاتون ہیں۔

بن بلایا مہمان

عارف نقوی
(جرمنی)

ایک دن ہمارے گھر کی بالکونی پر ایک خوبصورت پرندہ کہیں سے اڑتا ہوا آ گیا۔ کاسنی رنگ پر ہلکی ہوئی چمکتی زردی۔ کاکا تو اکہوں یا کوئی اور نام دوں۔ لیکن تھا بہت خوبصورت سر پر کلغی ایسے لگائے جیسے کسی ملکہ کا تاج ہو یا کسی شاہی نائی نے اس کے بال قرینے سے اس طرح سجائے ہوں کہ وہ سر اٹھا کر اپنے حسن پر غرور کرے۔ پرندہ ہماری بالکونی کی گگر پر بیٹھ کر گا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو:

''میں ہوں سندر پنچھی مجھ پر سب کا دل للچائے''۔

میری اہلیہ نے کہا: دیکھو کون اتنی سریلی سیٹیاں بجا رہا ہے۔ میں نے کہا نہیں گنگنا رہا ہے۔ اور کمرہ کا دروازہ کھول دیا۔

وہ پرندہ اڑتا ہوا سیدھا ڈائننگ روم میں چلا آیا اور میری کتابوں کی الماری پر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی پروفیسر کتابوں کا جائزہ لینے کے لئے آیا ہو۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ہر مخلوق کی کمزوری بھوک اور پیاس ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک برتن میں کچھ پانی رکھ دیا۔ وہ پرندہ فوراً پانی کے کٹورے پر ٹوٹ پڑا۔ پھر ادھر ادھر مڑ کر دیکھا اور میرے کندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ زندگی میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ ایک اجنبی وہ بھی پرندہ اس بے تکلفی اور اتنی محبت سے میرے ساتھ پیش آئے۔ جبکہ اسے یہ نہیں معلوم ہے کہ میں اس کا شکاری ہوں یا دوست۔ پرندہ میرے کان کے پاس جا کر ہال کھجانے لگا۔ جیسے کچھ راز کی باتیں کہنا چاہتا ہو۔ میں اس کی زبان سمجھ گیا اور بیگم سے کہا:

''انگڑد، شاید یہ بھوکا ہے۔ اسے کچھ کھانے کو دیدو۔''

وہ پرندہ ہمارے گھر کا ایک رکن بن گیا۔ ہم نے اس کا نام 'شہزادہ لونی' رکھا۔ اس کے لئے بازار سے ایک بڑا سا پنجڑا لا کر رکھ دیا۔ مگر اس کے پٹ بند نہیں کئے۔ وہ روز صبح ہمیں اپنی چونچ پھیلا کر نئے نئے گیت سناتا۔ پیار بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھتا۔

گرمیوں میں انگڑد اس کے نہانے کے لئے ایک چھوٹے سے برتن میں پانی رکھ دیا کرتی اور وہ اس میں غوطے لگاتا اور پروں کو پھیلا کر نہانے کی کوشش کرتا کہ ہماری کھانے کی میز بھیگ جاتی۔ پھر وہ پر سکھا کر اپنے پنجرے میں چلا جاتا اور کوئی نیا گیت گانے لگتا۔

مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا۔ والد کی وفات کے بعد سے میں نے اپنا بچپن لکھنو چکبست روڈ کے ایک بنگلے میں اپنی دادی، چچا اور ان کے بیوی بچوں کے ساتھ گزارا تھا۔ صرف اتوار کو اپنی والدہ اور نانا کے پاس پنجابی ٹولے میں چلا جاتا تھا۔ دونوں جگہ بہت سے پرندوں اور جانوروں سے سابقہ رہتا تھا۔

میرے چچا کے گھر کے سامنے اور پیچھے ان کے دو خوبصورت باغیچے تھے، جو منڈیروں سے گھرے تھے اور بڑے بڑے اشوک کے پیڑوں اور خوبصورت پھولوں کی کیاریوں سے سجے رہتے تھے۔ چوہے، نیولے، خرگوش، اور رنگ برنگے گرگٹان جو ذرا سی آہٹ پر رنگ بدل لیتے تھے اور دیواروں سے چمٹی چھپکلیاں جو پتنگوں کو کھا جاتی تھیں اور پیڑوں پر اچھلتی ہوئی گلہریاں جو اپنے بچوں کو چھتوں کے کونے میں سوراخوں میں پالتی تھیں اور اگر وہ کبھی نیچے گر جاتے تھے تو ہم بچے روئی کو دودھ میں بھگو کر انہیں پلاتے اور پالتے تھے۔ پھر بڑا کر کے چھوڑ دیتے تھے۔ ہمارے گھر میں مرغیوں کا ایک بڑا سا پنجڑا بھی تھا جہاں طرح طرح کی مرغیاں انڈے دیا کرتی تھیں۔ اس کے قریب ہی بڑے سے پنجڑے میں ایک کالی پہاڑی مینا تھی، جس کے کانوں کی زرد زرد لویں اس کے حسن کو اس طرح نکھارتی تھیں جیسے کسی کالے برقعے میں سے چمکتی آنکھیں ''جمالو کھانا لاؤ! جمالو کھانا لاؤ'' کی خوش کن صدائیں نکالتی تھی اور ایک پہاڑی طوطا جسے میری دادی نے سکھا دیا تھا: ''مٹھو، منجی بھیجو! منجی بھیجو!'' چمن میں اشوک اور گلہڑ کے پیڑوں پر کالے کالے کوّے دن بھر چلایا کرتے تھے اور اپنے گھونسلے بناتے تھے۔ لیکن جب کوئی کویل ''کو، کو'' کرتی کسی پیڑ کے قریب آتی تو سب کوّے شور مچاتے ہوئے اس کے شکار پر نکل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ کوّا بھی جو گھونسلے میں بیٹھا انڈوں کی رکھوالی کر رہا ہوتا تھا اپنے انڈوں کو بھول کر کوئل کا تعاقب کرنے لگتا تھا اور مادہ کویل کو موقع مل جاتا کہ کوّے کے انڈے نیچے پھینک کر اپنے انڈے وہاں دیدے اور بیچارہ کوّے کا جوڑا انہیں اپنا سمجھ کر سیتا رہتا۔ ہمارے گھر کے عقب میں نوکروں کے جو کوارٹر تھے وہاں ڈرائیور پیٹر نے بہت سے کبوتر ایک بڑی سی ڈھابلی میں پال رکھے تھے اور ان کے لئے ایک اونچا مچان بنا دیا تھا۔ یہ اونچائی پر اڑنے والے کبوتر تھے سفید بے داغ، ہرے، دوباز، مکھی، جو صبح سے شام تک آسمان پر اڑتے رہتے تھے اور شام ہونے سے پہلے اپنے اڈّے پر واپس آ جاتے تھے۔ کبھی کبھی ہم شکاری پرندوں کو جنہیں ہم 'بہری' اور 'جنبش' کہتے تھے آسمان پر اڑتے ہوئے کبوتروں پر جھپٹتے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور کبوتروں کی سلامتی کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور اگر بہری یا جنبش نے کبوتر کو پکڑ لیا تو آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہری جو کہ جنبش سے کچھ چھوٹی ہوتی تھی کبوتر کا نرخرہ ہوا میں ہی کاٹ دیتی تھی۔ لیکن چیل نما جنبش اسے پکڑ کر کسی پیڑ پر بیٹھتا اور اس کے پر نوچنا شروع کر دیتا تھا۔ ہم سائیکل سے پیچھا کرتے تھے اور کبھی کبھی غلیل کی مدد سے جنبش پر کنکر مار کر کبوتر کو چھڑا لیتے تھے اور پھر اس کے پھٹے ہوئے پوٹے کو سوئی دھاگے سے سی کر اور اس کبوتر کی ہی بیٹ لگا کر اسے بچا لیتے تھے۔ حالانکہ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ سوئی کو ماچس سے جلا کر اس کا زہر مار دینا چاہئے۔

حالانکہ وہ کبوتر اچھا ہونے کے بعد پھر کبھی اونچا نہیں اڑتا تھا۔ لیکن ہم اس کی نسل کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

پنجابی ٹولے میں میرے نانا کے گھر میں بھی مرغیاں اور کبوتر بہت تھے۔وہاں اونچے اڑنے والے کبوتر ہی نہیں بلکہ خوبصورت سینوں پر چتیوں والے کالے اور کنٹھیٔ شیرازی،مور کی طرح دم اٹھائے سفید لقّے اور دوسرے طرح طرح کے خوبصورت کبوتر بھی تھے۔کبھی کبھی کوئی نیولا کسی کبوتر یا مرغی کو پکڑ لیتا تو ہم اسے چھڑا کر ہلدی اور ایک خاص پتّا، جسے غالباً ککروندا کہتے تھے،لگاتے۔کبھی جنگلی بلّی آتی تو اسے بڑے سے بلّی دان میں پکڑ کر اور پھر ایک بورے میں بند کر کے چھوٹی لائن کے ریلوے اسٹیشن پر، جسے 'سٹی اسٹیشن' کہتے ہیں، لے جاتے اور ٹرین میں بورے کو چھوڑ کر جب ٹرین رینگنے لگتی تو اتر جاتے۔اور کبھی شرارت سے کبوتر کے انڈے ہٹا کر اس کی ڈھابلی میں مرغی کا اڈا رکھ دیا کرتے اور اس انڈے کے ساتھ کبوتر کی ممتا اور پدری محبت پر محظوظ ہوتے اور بیسویں یا اکیسویں دن کا انتظار کرتے تا کہ چوزہ نکلتے ہی اسے وہاں سے ہٹا دیں اور کبوتر گھبرا کر اسے نہ مارنے نہ لگے۔پھر ہم اس ریشم کے گالے کے ساتھ کھیلتے،اسے ''کِٹ کِٹ'' کر کے انگلی کو فرش پر ٹھونکتے ہوئے دانہ کھلاتے،جب تک کہ اس کے پر نہ نکلنے لگتے اور وہ کچھ دن کے لئے بدصورت لگنے لگتا۔

اب اپنے گھر میں اس نئے مہمان کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اپنا بچپن یاد آگیا تھا۔میری بیٹی نے کہا:''ہوسکتا ہے یہ کسی پڑوسی کا پرندہ ہو۔وہ اسے ڈھونڈھ رہا ہوگا۔کسی دوسرے کا پرندہ اپنے گھر پر رکھنا جرم ہے۔''چنانچہ میں نے آس پاس کے سارے گھروں کے دروازوں پر نوٹس لگا دیا کہ ہمارے وہاں ایک اجنبی پرندہ آگیا ہے۔اگر کسی کا ہے تو آکر لے جائے۔لیکن ہفتوں گزر گئے کسی نے خبر نہ لی۔

کئی بار سوچا کہ اسے چھوڑ دیں۔اڑا دیں۔لیکن پھر خیال آیا کہ اس قسم کا پرندہ جرمنی میں نہیں ہوتا ہے۔دوسرے پرندے اسے مار ڈالیں گے۔غرضیکہ یہ بن بلایا مہمان واقعی میں اب ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔اس سے پہلے بھی ہمارے گھر میں کئی بار چڑیاں رہ چکی تھیں۔آسٹریلین برڈس لیکن ایسا شاندار،ملنسار اور عقلمند پرندہ نہیں آیا تھا۔کاش کہ کسی پارلیمنٹ کا رکن یا کسی سیاسی پارٹی کے بڑے لیڈر کا مشیر ہوتا تو وہ اس سے انسیت اور محبت کے مطلب سیکھ لیتا۔

ہمارے وہاں جو بھی آتا اس پرندے کی تعریف کرتا۔ایک بار میرے ایک دوست ڈاکٹر مظفر شیخ مانچسٹر برطانیہ سے جرمنی آئے تو اسی کمرے میں قیام کیا جہاں لونی کا پنجڑہ تھا۔وہ ان سے اس قدر ہل گیا کہ ان کے سر پر آکر بیٹھ جاتا تھا۔وہ بھی اس کے گرویدہ ہوگئے تھے۔آج تک یاد کرتے ہیں۔مجھ سے تو وہ اتنا ہل گیا تھا کہ آکر ہاتھ پر، کندھے پر اور گردن پر بیٹھ جاتا تھا۔کان کے پاس اپنی چونچ لے جا کر کھجانے لگتا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہے۔میرے گلاس میں کبھی کبھی چونچ ڈال کر پانی پینے لگتا تھا اور میں سینڈوچ کھاتا تھا تو وہ بھی اپنی چونچ بڑھا کر شریک ہوجاتا تھا۔گرمیوں کے موسم میں میری اہلیہ اس کا پنجڑہ بالکونی میں لیجا کر پچکاری کی دھار سے اسے نہلاتی تو خوش ہو کر پھڑ پھڑانے لگتا۔سارے پروں کو کھول دیتا۔جیسے کوئی شہزادہ تاج پوشی کے لئے تیار ہو رہا ہو اور قبا پہن رہا ہو۔

آج بھی ہم اپنے شہزادے کو نہلانا چاہتے تھے۔انگرڈ پنجڑے کو بالکونی میں رکھ کر پچکاری میں پانی بھر رہی تھی۔نہ جانے کیسے پنجڑے کا پٹ کھلا رہ گیا۔اچانک وہ باہر نکلا دائیں بائیں دیکھا۔پیڑوں پر چہچہاتی شڑیوں کی آوازیں سنیں۔فضا میں اڑتے ہوئے کوّوں کی کائیں کائیں سنیں اور نہ جانے کیا سوچا کہ شہزادہ لونی بالکونی کی پتلی سی دیوار کی کگر پر جا کر بیٹھ گیا۔اس سے پہلے کہ ہم اسے بلائیں وہ ہوا میں پرواز کرنے لگا۔درجنوں کائیں کائیں کرتے کوّے اس پر جھپٹ رہے تھے۔لونی ہماری نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔میں اور انگرڈ ایک دوسرے کو کربناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے دنیا کا آج کا سارا منظر نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔

- بقیہ -

جینا اسی کا نام ہے

موڈ میں تھا۔جب سے سیلاب آیا ہے ہم بے گھر ہو کر مفت میں حکومت کی جانب سے کھا پی رہے ہیں۔اتنے اچھے ہوٹلوں میں بیٹھے ہیں۔نہ مجھے کھانا پکانا پڑتا ہے نہ صفائی کرنی پڑتی ہے۔فلیٹ کو بھی چھوڑو ہم ایسے ہی زندگی گزار لیں گے۔شیلی نے کہا۔فاروق نے حیرت سے اسے دیکھا امو تم ٹھیک تو ہو۔ایسے در بدر پھرنا تم کو اچھا لگ رہا ہے۔ایک ٹھکانہ تو ہو۔ٹھکانہ کیا ہوتا ہے۔زندگی ایسے ہی گزر گئی جب سے ماں باپ کا گھر چھوڑا تب سے ہی خانہ بدوشوں والی زندگی ہے۔مگر بڑا لطف ہے بھئی اس زندگی میں۔وہ پھر بولی۔

فاروق نے اسے اکیلا چھوڑنا مناسب سمجھا اور کمرے سے نکل گیا۔وہ آہستہ سے پیر پھیلا کر سونے کے لیے لیٹ گئی اور خود سے بولی شیلی شہزادی اب سو جاؤ عظیم سے آج خوابوں میں ملاقات ہو جائے تو اسے بتاؤں تو سہی اگر وہ گھر بنا لیتا مجھے کام کرنے کی اجازت دے دیتا فاروق پر توجہ دے کر اس کی تعلیم کا خیال کر لیتا تو آج میں ایسا عیش تھوڑی کر رہی ہوتی۔تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔مگر وہ خوش تھی کہ روٹی، کپڑے اور مکان کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔نہ فاروق نے اس کا درد بانٹا تھا نہ عظیم نے۔مگر کوئی غیبی طاقت تو تھی جو اُس کی مسکراہٹوں کا صلہ اسے دے رہی تھی۔

''جینا اسی کا نام ہے''

رعنا کوثر
(نیویارک)

کسی کی مسکراہٹوں پہ ہو نثار
کسی کا درد مل سکے تو لے ادھار
کسی کے واسطے ہو تیرے دل میں پیار
جینا اسی کا نام ہے

شیلی گانا بھی سن رہی تھی اور مترنم آواز میں گا بھی رہی تھی۔ یہ اس کا پسندیدہ گانا تھا۔ فاروق کے ابو تم بھی باہر آ جاؤ بڑی پیاری ہوا چل رہی ہے۔ اس نے گانا گاتے ہوئے آواز لگائی۔ وہ عظیم کو ہمیشہ فاروق کے ابو بولتی۔ نام نہ لیتی۔ شام کا وقت تھا وہ نہا دھو کر گیلری میں بیٹھی تھی۔ بڑے اہتمام سے گانے لگائے ہوئے تھے۔ میں گیم دیکھ رہا ہوں۔ عظیم نے کہا۔ یہ والا گانا تو سن ہی لو شاید کچھ سیکھ لو۔ اس نے دوبارہ اسے آواز دی مگر اب کے تو عظیم کی آواز بھی نہ آئی۔ وہ خود ہی گنگناتی رہی۔ لمبے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی جو اس نے ابھی چند دن پہلے ہی رنگوائے تھے۔ اور اس کی گوری رنگت پر اچھے لگ رہے تھے۔ شیلی کے والدین انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان کے شہر سکھر میں آباد ہوئے تھے۔ پھر ان کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔ اور اس نے وہیں سے بی۔ اے کر لیا۔ ابھی ختم ہی کیا تھا کہ اس کا رشتہ آ گیا۔ لڑکا امریکہ سے آیا تھا۔ مڈل کلاس لوگ تھے مگر لڑکا پڑھا لکھا اور سمارٹ تھا۔ اُس نے بھی اچھے سکول اور کالج سے تعلیم لی تھی پھر وہ امریکہ چلا گیا۔ اب واپس آیا تو ایک خوبصورت لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔ یوں وہ عظیم کی دلہن بن کر امریکہ چلی آئی۔ شیلی شوخ چنچل حالات سے سمجھوتہ کرنے والی لڑکی تھی۔ انگریزی اچھی بول لیتی تھی۔ تیار ہونا بھی خوب آتا تھا فوراً ہی ایڈجسٹ ہو گئی۔ تین کمروں کے خوبصورت فلیٹ میں زندگی کا آغاز ہوا۔ نیویارک میں اتنا بڑا فلیٹ ملنا ہی غنیمت تھا۔ عظیم ایک ہوٹل میں منیجر تھا کمائی اچھی تھی۔ شیلی تیار ہو کر ادھر اُدھر گھومتی رہتی۔ عظیم نے اسے نوکری کرنے سے منع کر دیا تھا۔ شیلی نے شروع میں کہا بھی کہ میں کچھ کورس کر لیتی ہوں مگر وہ نا مانا اس نے بھی سوچا زندگی کو کون مشکل بنائے۔ فاروق پیدا ہوا تو وہ اس میں مصروف ہو گئی۔ ٹی وی اس کا اولین دن سے ساتھی تھا۔ سارے انگلش شو دیکھتی، کبھی انڈین فلمیں کبھی گانے۔ وہ شام کو نہا دھو کر اس کے آگے بیٹھ جاتی مجال ہے کہ کوئی اسے ہلائے۔

ابھی آئے ہوئے دو سال ہی ہوئے تھے کہ عظیم کے گھر والوں کو امریکہ کا امیگریشن ملنا شروع ہو گیا۔ ساس نند جیٹھ سب آہستہ آہستہ چلے آئے۔ عظیم کا تین کمروں کا فلیٹ بھر گیا۔ شیلی کا کام بہت بڑھ گیا۔ وہ کبھی جھنجلا کر کہتی نہ جانے کب تک رہیں گے یہ لوگ۔ رہنے دو یار ابھی آئے ہیں سب کے گھر ہو جائیں گے تم تو یوں ہی بولو گے۔ کبھی اپنا گھر بھی تو بناؤ وہ جھنجلا کر کہتی۔ گھر نیویارک میں تو میں خرید نہیں سکتا۔ بہت خرچہ ہے۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا۔ میں بھی کچھ کام کر لیتی ہوں۔ کوئی اچھا کورس کر لیتی ہوں وہ روز منصوبے بناتی مگر عظیم منع کر دیتا۔ تنگ آ کر اُس نے ٹی وی دیکھنا ہی اپنا مشغلہ بنا لیا۔ کبھی وہ عظیم سے الجھتی تم نے پاکستان کے اتنے اچھے سکول کالج میں تعلیم پائی۔ تمہارے دوست کہاں سے کہاں نکل گئے تم کیوں ایک ہوٹل میں ہی لگ کر رہ گئے۔ عظیم خشک لہجے میں جواب دیتا۔ میں اس جاب پر بھی ٹھیک ہوں اچھا خاصا کما لیتا ہوں۔ تم آرام سے رہتی ہو۔ زیادہ نہ بولا کرو۔

رات کو ہوٹل کی جاب کر کے عظیم دن میں سوتا۔ وہ فاروق کو سکول لاتی لے جاتی گھر میں کافی لوگ تھے فاروق سکول سے آ کر ان کے ساتھ لگ جاتا تعلیم پر توجہ کم ہی تھی۔ وہ بھی ہر طرف سے لاپرواہ ہو گئی تھی۔ عجیب بے حسی طاری ہو گئی تھی۔ کبھی پلٹ کر وطن نہ گئی۔ بہن بھائی والدین سب ہی پرائے ہو گئے تھے۔ سسرال والے بھی اس کے روّیے سے گھبرائے ہوئے تھے۔ نندوں کی شادیاں ہو گئیں۔ جیٹھ نے اپنا گھر لے کر اپنے بیوی بچوں کو بلا لیا ساس بھی وہیں چلی گئیں۔ بہت عرصے بعد تین کمرے کا فلیٹ پھر بہت بڑا لگنے لگا۔ فاروق نے جیسے تیسے ہائی سکول کیا اور کالج میں داخلہ تو لے لیا مگر اس کا دل پڑھائی میں نہ لگتا مشکل سے ہی یہ سفر طے ہو رہا تھا۔ شیلی کو ہمیشہ شکوہ تھا کہ سسرال والوں کی وجہ سے فاروق کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا۔ اپنے آپ کو تو وہ ذمہ دار ہی نہیں ٹھہراتی تھی۔ دوسرا شکوہ میاں سے تھا کہ گھر والوں کی وجہ سے وہ کبھی اکیلے گھر میں وقت نہ گزار سکے۔ اب گھر خالی تھا مگر فاروق کو پڑھائی کی طرف راغب کرنا مشکل تھا تنگ آ کر اُس نے بھی ایک کلینک میں نوکر کر لی جہاں وہ مریضوں کے چارٹ وغیرہ رکھتی۔ اُسے گھر سے نکل کر بہت مزا آتا۔ لمبے سنہرے بال سنوار کر پینٹ شرٹ پہن کر اتراتی ہوئی کام پر جاتی۔ کام کرتی ساتھی لڑکیوں سے گپ شپ کرتی اچھا وقت گزار کر گھر آ جاتی۔ زندگی میں کچھ رنگ آ گیا تھا کہ پھر رنگ پھیکے پڑنے لگے۔

عظیم کو ایک بیماری نے آ دبوچا۔ بیماری بہت خطرناک تھی۔ گردوں کا کینسر۔ عظیم کی جاب ختم ہو گئی۔ فاروق نے بھی ایک ہوٹل میں کام پکڑ لیا تھا۔ گھر کا کرایہ کیسے دیں گے سب نے سوچا اور خاموشی سے اتنا بڑا فلیٹ خالی کر دیا۔ کسی کے گھر کا زیرِ زمین کمرہ اس سے ملحقہ باورچی خانہ اور چھوٹا سا باتھ روم۔ فاروق اور شیلی کی نوکری سے کرایہ نکل ہی جاتا۔ عظیم جیسے ہی کچھ بہتر محسوس کرتا پھر اپنے کام پر چلا جاتا مگر کب تک علاج معالجہ کے باوجود وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔

شیلی کو اپنے سسرال والوں سے چڑ تھی وہ ان سے تعلقات ختم کر چکی تھی اپنے وطن کبھی گئی نہیں تھی۔ بہن بھائی بھی پرائے ہی سے تھے۔ ویسے بھی اسے زندگی گزرانی آ گئی تھی۔ اپنوں کے بغیر بھی اور غیروں کے بغیر بھی اس کا ساتھی ٹی۔ وی بھی تو تھا جس کے ساتھ وہ کافی وقت گزارتی۔ وہ کام سے واپس آ کر اس

میں ڈوبی رہتی۔ فاروق رات کی جاب کر کے سوتا اور وہ کام پر نکل جاتی۔ پھر اچانک ہی اس کی جاب ختم ہوگئی۔عمر زیادہ ہوگئی تھی کام کا خاص تجربہ نہ تھا۔ پھر بھی کام کی تلاش جاری رہی مگر کام کو ملنا تھا نہ ملا۔اسے اپنی انگریزی پر ناز تھا وہ کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں چاہتی تھی۔آفس جاب اسے اچھی لگتی تھی۔اب تو اس چھوٹی سی جگہ کا کرایہ بھی دینا مشکل تھا۔ فاروق کے اپنے خرچے تھے۔اکثر مالک مکان سے جھگڑا ہو جاتا کبھی یہ ٹوٹ کبھی وہ پھوٹ۔ایک دن تو اچانک تیز بارش مسلسل کئی دن ہوئی۔ایک سیلاب سا تھا جو نیویارک کی سڑکوں کو بہا کر لے گیا۔گھروں میں پانی گھس گیا۔ بے شمار لوگ جان بچا کر بھاگے۔گاڑیاں تک بہہ گئیں۔ایسے میں ان کا زیرِ زمین گھر کیسے بچتا۔سیلاب غریب ملکوں میں ہی نہیں آتا امیر ملکوں میں بھی تباہی لاتا ہے۔لوگ ہر جگہ بے گھر ہوتے ہیں۔شیلی اور فاروق بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے۔کہاں جائیں کدھر جائیں کسی رشتہ دار کے پاس تو جانا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے گرتے پڑتے ایک شیلٹر میں پہنچ گئے جو بے گھر لوگوں کے لیے حکومت نے قائم کیا تھا۔ ہر طرح کے لوگ تھے ہر قوم کے بے گھر گورے، افریقن، چائنیز، اسپنش کون نہیں تھا۔حکومت کی طرف سے کھانا، پینا، رہائش فری تھی۔شیلی کو امریکہ آئے پچیس تیس سال ہو گئے تھے اور وہ بے گھر لوگوں کی طرح اس شیلٹر میں پڑی تھی۔

امو۔۔۔ایک دن فاروق بڑی رازداری سے بولا۔اگر ہم بہت دن تک یہاں رہیں تو ہم کو ایک فلیٹ مل سکتا ہے وہ کیسے شیلی نے پوچھا۔امو یہاں بہت بڑی بلڈنگیں ہیں جو ان لوگوں کو بہت کم کرائے میں یا فری فلیٹ دے دیتے ہیں۔جو بیمار ہوں اکیلے ہوں اور بے روزگار ہوں۔ فاروق نے کہا۔اگر میں تمہارا نام لکھوا دوں تو ہم کو فلیٹ مل جائے گا۔کیونکہ تم بیمار بھی ہو اور بے روزگار بھی۔اس نے کہا۔صحیح کہہ رہے ہو شیلی نے کہا۔میری جاب پر ایک لڑکی جو چار بچوں کی ماں تھی اکیلی تھی اُن بلڈنگوں سے ہی آتی تھی۔ چلو مل جائے تو بہت ہی اچھا ہے۔ فاروق تو کبھی اتنا نہ کما سکے گا کہ ہمارا کچھ ہو پھر اس کے اپنے بھی خرچے ہیں۔اُس نے دکھی دل سے سوچا اچھا خاص پڑھ لکھ کر آئی تھی عظیم نے آگے ہی نہ بڑھنے دیا۔ہم تو اتنی اچھی جگہ آ کر بھی کچھ نہ کر پائے نکمّے کے نکمّے ہی رہ گئے۔عظیم نے تو پھر بھی اسے کچھ عیش کرا دیئے تھے۔ فاروق تو بالکل ہی گیا گزرا ہے۔اس کی عمر سے فائدہ اٹھا کر اس کے نام گھر لے گا اور خود بھی اُس گھر میں زندگی گزار دے گا۔

وقت گزر رہا تھا۔وہ لوگ شیلٹر سے نکل کر ہوٹل میں پہنچا دیے گئے تھے۔ ایک کمرہ ملا تھا جس میں دو بستر لگے تھے۔ایک الماری کونے میں کھڑی تھی جس میں ان دونوں نے اپنی جمع پونجی رکھ دی۔ایک طرف دیوار پر ٹی وی لگا تھا۔شیلی کے لیے وہی کافی تھا۔دن میں وہ ہوٹل سے باہر نکل کر ونڈو شاپنگ کرتی۔حکومت کی طرف سے ملے ہوئے کوپن سے کھانا لینے چلی جاتی۔مختلف کھانوں سے لد پھند کر اپنے کمرے میں پہنچتی اور ہفتے بھر وہ کھانا کھاتے۔نوکری کی تلاش میں مختلف جگہوں کے چکر لگاتی کوئی آفس جاب نہ ملتی ایک دفعہ وہ گرتے پڑتے ایک فیکٹری پہنچی تو پتہ چلا کہ یہاں تو گوشت پیک ہوتا ہے وہ الٹے پاؤں واپس ہو گئی اس کو شوگر اور بلڈ پریشر ہو چکا تھا۔اس کی صحت اور عمر دیکھ کر اُسے جاب ملنا آسان نہ تھا خاص طور سے وہ جاب جو وہ چاہتی تھی کرسی پہ بیٹھ کر کوئی اچھی سی جاب۔ فاروق تسلی دیتا امو جی چھوڑو کہاں کام ڈھونڈ رہی ہو جلد ہی تمہارا ایک فلیٹ ہوگا۔ زیادہ کام کرو گی تو وہ بھی نہیں ملے گا۔ میں نے لکھوایا ہوا ہے تم بیمار ہو۔وہ کہتا۔ ارے بیٹا کرونا کی وجہ سے آدھے ادارے بند ہیں۔آدھے ویسے ہی کام نہیں دیتے تم فکر نہ کرو میں بے روزگار ہی رہوں گی۔وہ طنز سے کہتی۔ہاں امو ہوٹلوں کا بھی یہی حال ہے اکثر بند ہیں۔ مجھے بھی جاب ملنا کوئی آسان نہیں ہے وہ بھی مایوسی سے کہتا۔

شیلی کو تو حالات سے سمجھوتا کرنے میں کمال حاصل تھا۔وہ اب بھی شام کو تیار ہو کر ٹی۔وی پر اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھتی اور اس میں ایسی کھو جاتی کہ غمِ زمانہ کی فکر نہ رہتی۔اب بھی غزلیں سنتی پرانے گانے اسے بہت یاد تھے۔ انہیں اپنی مترنم آواز میں اونچے سروں میں گاتی رہتی۔وہ اب تک دو ہوٹل بدل چکے تھے۔ پہلا والا غیر آباد علاقے میں تھا کمرے اچھے اور صاف تھے مگر باہر نکلنا خطرہ سے خالی نہ تھا دوسرا ہوٹل شہر میں تھا مگر کمرے چھوٹے فرنیچر ٹوٹا ہوا اور صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔

ابھی ابھی بہت اچانک فاروق نے اسے اطلاع دی تھی کہ ایک اور ہوٹل میں جگہ خالی ہوئی ہے۔امو جان فاروق نے کہا جلدی چلو ہوٹل میں کمرے کم ہیں دیر ہو گئی تو اچھے کمروں پر قبضہ ہو جائے گا۔شیلی نے اپنا اکلوتا سوٹ کیس اٹھایا اور ہوٹل سے باہر آ کر بیٹھ گئی اس کی طرح کے بے شمار خاندان بیٹھے تھے۔ جن کے پاس گھر بار نہیں تھے۔وہ کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچ گئے تھے اور ان کی طرح دھکّے کھا رہے تھے سب کو فلیٹ ملنے کا انتظار تھا۔وہ بھی نیویارک کی سڑک پر سواری کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ وہی شہر تھا جہاں تیس سال پہلے اس نے بڑے ارمانوں سے قدم رکھا تھا خواب بڑے نہ تھے مگر یہ بھی نہ سوچا تھا کہ وہ بے گھر ہی ہو جائے گی۔اس نے ارد گرد نظر دوڑائی اور لاشعوری طور پر گانے لگی۔

جینا اسی کا نام ہے۔

کئی گھنٹے کے انتظار کے بعد گاڑی آ گئی۔ فاروق اور شیلی سمیت کئی خاندان اس میں سوار ہو گئے۔آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے گاڑی رکی وہ لوگ سامان لے کر اندر پہنچ گئے۔ہوٹل بہت اچھا تھا۔ان کو دو کمرے ملے تھے۔ فاروق جوش سے بولا امو اب ہم یہیں رہیں گے جب تک ہمیں حکومت فلیٹ نہیں دیتی۔شیلی نے کمرے میں رکھے ہوئے چھوٹے سے صوفے پر بیٹھ کر ٹی۔وی کھولا اور فاروق سے پوچھا۔سوشل ورکر نے کچھ بتایا کب ہم کو فلیٹ ملے گا۔بڑی لمبی لائن ہے امو کچھ پتہ نہیں۔ہم تو سیلاب زدگان کی لسٹ میں ہیں مگر لوگوں کے اور بھی مسائل ہیں۔جو اس بات کے حقدار ہیں کہ ان کو سر چھپانے کا ٹھکانہ ملے۔ فاروق بولا۔شیلی اچانک ہنسنے لگی کیوں ہنس رہی ہو پیاری ماں فاروق بھی اچھے

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجیے

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

میں 75 برس پہلے امرتسر سے لاہور کے لیے روانہ ہوئی تھی اور اب تک لاہور نہیں پہنچی ہوں۔ اس مسافت نے مجھے کئی پڑاو بھی دیے، مگر میں کہیں نہیں رکی۔ رکتی بھی تو کہاں، کہیں ٹھکانہ نہیں تھا۔۔۔ چھاؤں ڈھونڈنے میں اس قدر تھکی کہ سردیوں کی دھوپ بھی نہ تاپ سکی اور جاڑے کے موسموں میں چرمراتی رہی۔ جوانی کا وقت تھا جب سرحد پار کر آئی تھی۔ گود میں ایک بچہ تھا جس کے باپ کو ایک کرپان چاٹ گئی تھی۔ اس وقت تک میں قافلے سے جڑی تھی اور متحد ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھی۔۔۔ میں کتابوں اور کاغذوں کی خوشبو سے بہت دور تھی مجھے بس اتنا بتایا گیا تھا کہ نظریے میں سبز اور اور جھنڈے میں سفید رنگ کوئی معنی رکھتا ہے۔ یہ دو رنگ امن اور خوشحالی اور رواداری کی علامت ہوتے ہیں۔۔۔ میں ان دو رنگوں کا پرچم ہاتھ میں لے کر زندگی بھر چلتی رہی تھی۔۔۔ مجھے جھنڈے پر اعتبار تھا، لیکن یہ بھول گئی تھی کہ جھنڈا تو بے جان چیز ہے، اعتبار کا ہنر تو جھنڈا تھامنے والوں میں ہونا چاہیے۔۔۔ میں دیکھتی رہی کہ جھنڈا خاص دنوں اور خاص عمارتوں پر خاص لوگ ہی لہراتے تھے، عام لوگ البتہ سینے پر سجائے رکھتے تھے وگرنہ ان پرچم بنی جھنڈیوں کو خاکروب جھاڑو سے اکٹھا کر کوڑے دان میں نہ بھر رہا ہوتا تھا۔

مجھے زندگی بھر کوئی گھر نہیں ملا۔ ہجرت نے مجھے صرف جدائی دی تھی اس ہجر نے میری کمر توڑ دی تھی۔۔۔ میں مزدور بن چکی تھی اور مملکت خداداد کے لیے ایک نیا مزدور اپنے بیٹے کی شکل میں تیار کر رہی تھی۔ شاید تعمیر ہماری عادت میں ہے۔

میں نے اپنی مسافرت کے مختلف پڑاو میں جمہور کو قومی لیڈر منتخب کرتے ہوئے اتنی بار دیکھا کہ یہ بچوں کا کھیل لگنے لگا، ہر بار غلط انتخاب ہو جاتا اور قوم دوبارہ غلطی سدھارنے میں لگ جاتی، اس نے بار بار اتنی زیادہ غلطیاں کیں کہ وردیوں والے سرحدوں پر اپنا کام چھوڑ کر شہروں کے دفتروں میں آن گھسے اور جمہور کا نظام چلانے کی ضد کرنے لگے، تھوڑا تھوڑا کھا کر اور زیادہ سے زیادہ چرنے کے بعد جب یہ کندھے والے ستارے واپس بیرکوں میں گیے تو پیچھے بوری بند بچے چھوڑ گیے۔

میں نے یہ سب دیکھ کر اپنے مزدور بیٹے کو جلدی سے مٹی کے طویلے میں چھپا دیا تھا۔

اس مملکت خداداد میں میرا نام ہر پانچ سال بعد ووٹر لسٹ پر چمکتا تھا وگرنہ آسمان پر قطبی ستارے کی طرح گمنام ہی رہتا تھا، میں نے اپنا نام مہاجروں اور ووٹروں کی لسٹ کے علاوہ کسی اور فہرست میں کبھی نہیں دیکھا، نہ کھانا ملنے والوں کی فہرست میں اور نہ گھر پانے والوں کی فہرست میں مجھے نعرے لگانے والے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اچھی خوراک اور ٹھنڈی بوتلیں دیا کرتے اور میں اور میرا بیٹا لیڈروں کی ہر بات پر تالیاں بجا بجا کر اپنی ہتھیلیاں سرخ کر لیا کرتے تھے۔ میں اب اکثر، انوکھے لفظ سننے لگی تھی لیکن مجھے ان کا مطلب معلوم نہیں تھا مجھ ان پڑھ کو کیا خبر تھی کہ این آر او، ٹین پرسنٹ اور ایک پیج پر وغیرہ کیا ہوتا ہے۔۔۔ لوگوں نے میرا مذاق اڑایا اور کہا یہ جدید پروجیکٹ ہیں کیا تمہیں نہیں پتہ؟

مجھے کیا پتہ؟

مجھے تو صرف نظریے کا پتہ ہے، جس نے مجھے آزادی دلائی ہے۔ لوگ ہنس پڑے، کراچی جا کر مزار قائد پر میری کم علمی کی شکایت کر دی۔ میں نے سنا ہے کہ شکایت کرنے والوں کو قائد نے ایک گھونسا رسید کیا تھا۔۔۔ میں خوش ہو گئی تھی، لیکن دریا کے کیچڑ کنارے ابھی تک بدبودار تھے۔

مملکت خداداد میں زبانوں کی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

میری زبان سرحد پار کی تھی اسے مسترد کر دیا گیا، اس زبان کے بولنے والے بے روزگار اور بے آسرا کر دیے گیے۔۔۔ طاقتوروں کو یہ ڈر بھی نہیں ہوا کہ اس طرح تو ان کے ووٹ کم ہو جائینگے، لیکن تعجب ہے میں نے اکثر دیکھا ہے اسمبلیوں میں ایسے لوگوں کے نمبر جانے کہاں سے پورے ہو جاتے ہیں؟

ایک دن اچانک میرا مزدور بیٹا کہیں گما دیا گیا، میرا دم نکل گیا ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیدم ہو گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں میری۔ ایک صبح وہ مجھے جھونپڑی کے باہر بوری بند ملا۔ میری پتلیاں لرز کر رک گئیں، بوڑھے ہاتھوں نے کانپتی پلکوں سے بوری اٹھالی۔ دفنانے کے لئے لیکن مجھے ابھی تک قبرستان نہیں ملا ہے۔

77 برس بعد بھی میں حد پار سے لاہور نہیں پہنچ سکی ہوں۔ اور اب تو عمر کے ساتھ ساتھ میری یادداشت بھی بہت کمزور ہو گئی ہے، مگر نجانے کیوں ایک نکتہ بار بار مجھے یاد رہتا ہے۔ میری ماں نے ایک بار وطن کا جھنڈا سیتے ہوئے مجھے کہا تھا:

''جھنڈے کے رنگوں سے امید لیتی رہنا''

شامتِ اعمال

یہ آپس کے جھگڑے یہ ظلم و تعدی
عذابِ الٰہی ہیں یہ سب مصائب
نجات ان سے پانے کی ہے ایک صورت
کرو اعمالِ بد سے ہوں سب لوگ تائب

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

آوازیں

ارم رحمٰن
(لاہور)

نوابوں اور رئیسوں کے گھر شادی بھی کسی میلے ٹھیلے سے کم نہیں ہوتی ایسی بھانت بھانت کی رسمیں اور مزے مزے کے پکوان اور حویلی ایسے سجائی جاتی ہے جیسے روشنیوں کا شہر اور زنان خانہ میں تیاریاں کسی محل کی ملکہ اور شہزادیوں کا راج ہو، کمخواب، جامہ وار مخمل اور نجانے کون کون سے قیمتی دیدہ زیب لباس، جگنو کی طرح چمکتی ہوئی لڑکیاں اور متمدن مہذب خواتین، باوقار مرد۔

گہما گہمی بھی اور ہنسی کی قلقاریاں کہیں میٹھے پان کی گلوریاں کہیں چاندی کے اوراق میں لپٹی گلقند، سارا گھر گلاب اور موتیوں کے پھولوں بھرا سجا، خوشبوؤں میں لپٹا ہوا، چہل پہل، حلوے مانڈے اور رنگ برنگے شربتوں سے مہمانوں کی تواضع کی تیاری کی جاتی ہے اور ایسی ہی تیاری نواب شکیل احمد کے گھر میں چل رہی تھی جو جدی پشتی رئیس تھے اور کمال خوبی سے اپنے پرکھوں کے کاروبار اور ساکھ کو سنبھال رکھا تھا آج ان کے بڑے بیٹے کی نکاح اور بارات کی تقریب تھی، پانچ سال پہلے بڑی بیٹی بیاہی تھی اب اکلوتے بیٹے جمیل احمد کی باری تھی اس کے بعد ایک چھوٹی نوعمر بیٹی رخسار تھی بارہویں کے امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی اور اب اپنے اکلوتے بھیا کی شادی کی تیاریوں میں خوشی خوشی مگن تھیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کے امتحانات کے ختم ہونے کے بعد ہی اس شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی، تقریب کی ساری تیاریاں مکمل تھیں، مہمان آنا شروع ہوگئے جن کے لیے حویلی کے بڑے دالان میں انتظام کیا گیا تھا نوکر چاکر بھاگ بھاگ کر حکم بجالا رہے تھے اور شادی کے موقعہ پر سب کو طرح طرح کے نئے اور قیمتی جوڑے بنوا کر دیئے تھے اب وہ ان تحفوں کو حق حلال کرنے کے لیے زیادہ ہی مستعدی سے خدمت میں لگے تھے۔

ویسے بھی خاندانی ملازم تھے مالک کے ابرو کی جنبش سمجھتے تھے اور ایک اشارے پہ جان دینے کو تیار، یہ تو پھر اکلوتے بیٹے کی شادی کی تقریب تھی ہنس مکھ جمیل احمد سب کا لاڈلہ، راج دلارا، بوڑھی مامائیں آتے جاتے بلائیں لے رہی تھیں اور جس کو دیکھو اماں بی، خالائیں پھوپھیاں صدقے واری جارہی تھیں، ماشاءاللہ سے تھے بھی بہت پیارے اللہ نظر بد سے بچائے اماں نے تیاری کے بعد دیکھا ماتھا چوما امام ضامن بازو پہ باندھا اور نجانے کتنے نوٹ سر پہ وار کر اماں خورشید کو دیئے جو سب سے بڑی ملازمہ تھیں، جنھوں نے بچپن سے دولہے کو پالا تھا ان کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور انھوں نے بھی شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو جمیل احمد نے بھی ان کے سامنے سر جھکا لیا اور کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اظہار محبت کر ڈالا، چھوٹی بہن رخسار بھی ساتھ ساتھ تھی چمکتی دمکتی پیازی رنگ کے کپڑوں میں نازک سی گڑیا، سب دالان میں جمع ہو چکے تھے مہمانوں کی آؤ بھگت ہوگئی، چائے شربت ناشتہ مٹھائی گلوری سب ہوگیا پھر دولہا پہنچا اور رسم سہرا بندی ہوئی سلامیاں دی گئیں اور لیجیے بلکل وقت پر ہر کام مکمل ہوگیا اب بارات کی روانگی کا وقت آ گیا، نواب شکیل احمد جیسا زیرک ہی وقت کی قدر جانتا تھا ایک بھی لمحہ انتظار کرنے اور کروانے کے قائل نہ تھے، بارات دھوم دھام سے نکلی، سجا سجایا سفید اجلا گھوڑا اس کی چمکتی کالی آنکھیں اور گردن پہ لہراتے لمبے بال اس پر خوبرو دولہے میاں سوار۔۔۔تھوڑی ہی دیر میں خیر سے دلہن کے گھر جا پہنچے، شکیل احمد کے بچپن کے دوست اور کاروباری شریک میاں نور محمد کی اکلوتی صاحبزادی حاجرہ کو شادی کا عندیہ دیا اور پلک جھپکتے میں دوستی رشتے داری میں تبدیل ہوگئی، بارات کا استقبال شان شایان طریقے سے ہوا، تواضع خاطر داری انتہائی معیاری، ان گنت پکوان کہ چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر جائے، انتظام۔انصرام اتنا بڑھیا کہ ہزار بندہ اس جگہ بیٹھا کم لگ رہا تھا اور کھانے کی میزیں اشتہا انگیز پکوانوں سے بھری، خاص وردی والے ویٹر بلائے تھے کہ اشارہ ہو اور مطلوب مہمان کے ہاتھ میں۔

مولوی صاحب کو احترام سے لایا گیا، رسم نکاح ہوئی تازہ چھوارے کی کشتیاں مہمانوں کے سامنے پیش کر دی گئیں اور بھی کئی طرح کے خشک میوے کا جو پستہ بادام بھی ساتھ رکھے تھے اگر سب مہمان مٹھیاں بھر بھر کے کھاتے تب بھی کم نہ پڑتے ایسی شادیاں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں، سارے مرحلوں کے بعد دلہن کو لایا گیا، کس قدر خوبصورت جوڑا زیب تن کیے قیمتی زیورات سے لدی پھندی اور بہت نفیس قیمتی کامدار دوپٹے کا گھونگھٹ نکالے، دولہے کے ساتھ بٹھایا گیا اور پھر ان کے صدقے اتارے گئے سالی تو تھی کوئی نہیں تو خالہ پھپھی ماموں چچا زاد بہنوں نے دودھ پلائی کی رسم نبھائی اور دولہے میاں نے بھی فراخدلی سے جیب خالی کر ڈالی، رخصتی کی تیاری ہوئی دلہن کے بوجھ سے زیادہ بھاری تو کپڑے اور زیور تھے جن کے بوجھ تلے دلہن خراماں خراماں چل رہی تھی انداز بھی اور بھاری سامان بھی ماں باپ ہلکا سا لپٹ کے روئے قرآن پاک کے سائے میں بارات دلہن کو رخصت کروا کے خیر خیریت سے گھر پہنچ گئے دولہا دلہن کی نظر اتاری گئی سب نے تحائف پیش کیے دونوں کا منہ میٹھا کروایا گیا، کئی طرح کی رسمیں ہوئیں پھر دلہن کو حجلہ عروسی میں پہنچایا گیا۔

تازہ پھولوں سے سجی سجائی موتیے کی خوشبو سے معطر فضا میں دلہن کا لہنگا پھیلا کر جہازی بیڈ پر بٹھا دیا گیا بستر کی صاف شفاف سلک کی سفید چادر میں سرخ گلاب کی طرح دلہن اپنی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ براجمان ہوگئی بہت پیارا منظر تھا، ان ساری رسموں میں رخسار ہر پل بھائی کے ساتھ تھی وہ ہر رسم میں بہت دلچسپی لے رہی تھی اور اس کا نام رخسار تھا لیکن اب وہ خوشی سے گلنار لگ رہی تھی، اور اس آخری رسم میں وہ بہت خوش تھی، رخسار اور بڑی بہن رابعہ نے دلہن تک پہنچنے کے لیے بھائی کو کمرے کی چوکھٹ پہ ہی روک لیا اور لگی نیگ مانگنے کے

''چہارسُو''

نام پر موٹی رقم ،اور یہاں بھی دولہے میاں سرخرو ہوئے , جب انھوں نے منہ بولی سالیوں کو اتنی رقم دی یہ تو پھر سگی بہنیں تھیں انھوں نے کہا ایک منٹ رکیے اور مجھے کمرے میں الماری تک جانے دیں الماری دروازے کے ساتھ ہی تھی الماری کھولی اور ہاتھ ڈال کر دو ڈبے نکالے ،۔''۔ہائے بھیا'' رخسار تو اپنا ڈبہ ہاتھ میں پکڑ کر بھائی سے لپٹ گئی ،''ارے پگلی کھول۔کے تو دیکھو'' بھائی نے لاڈ سے کہا دونوں ڈبوں میں بہنوں کے لیے سونے کے جڑاؤ کنگن جگمگا رہے تھے بہنیں خوشی سے نہال ہوگئیں ،اماں بی کو تو پہلے ہی سونے کا سیٹ بنا کر دیا تھا ،اللہ کا کرم سب کام خوشی خوشی سے نپٹ گئے ،سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے ، لیکن رخسار بھابھی کے پاس ہی بیٹھی رہی ایک ایک زیور گہنا دیکھتی اور سراہتی بھابھی صاحبہ بھی شرما شرما کر دوہری ہوئے جارہی تھیں ، چاند کی چودھویں رات اور چاند دو ہوں تو کیا ہی بات ،ایک آسمان پہ دوسرا پہلو میں ،بجیل میاں نے آخر رخسار کو شب بخیر کہا اور مسکرا کر باہر نکل گئے اور دروازہ بند ہوگیا ،رخسار کو بہت تجسس تھا کہ شادی کے بعد دولہا دلہن ایک کمرے میں رہتے ہیں ،آپی کی شادی کے وقت وہ صرف چودہ سال کی تھی بس رخصتی کے وقت یاد تھا ،اسے بعد کے معاملات کا بلکل علم نہیں ہوا۔۔۔اب چونکہ دلہن گھر آئی تھی اس لیے اسے عجیب سا احساس تھا۔

رخسار بڑی بہن کی شادی کے وقت کم عمر تھی اس لیے اماں بی نے کبھی بھی اسے بڑوں میں بیٹھنے نہیں دیا بڑی بہن یا کوئی خالہ پھپھو کی بیٹیاں آتیں تو سختی سے منع کر دیا جاتا تھا کہ چھوٹی بہن کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کی جائے بچیاں معصوم ہی اچھی لگتی ہیں , چھوٹی عمر کی پکی لڑکیاں انھیں پسند نہیں تھیں کہ جب وقت آئے گا تب خود ہی سب معلوم ہو جائے گا ،احتیاط اور دیکھ بھال میں اماں بی بہت کڑی تھیں مجال نہیں کہ کوئی بیٹی بیٹا پلٹ کے جواب دے خاص طور پر بیٹیاں ، ان کو زیادہ بولنے والی ،اور کھی کھی کر کے ہنسنے والی لڑکیاں بلکل پسند نہیں تھیں ، بہت اچھی تربیت کی تھی سلیقہ شعار اور تمیز دار , جہاں رشتے کیے وہاں بے چوں وچراں کر دی ،اور اماں بی خاندان اور جاننے والوں میں عمدہ اور بہترین تربیت کے حوالے سے جانی گئیں اور بیٹے کا رشتہ بھی ان کا ہی انتخاب تھا جس پر سب نے ہی انھیں خوب داد دی ،اب رخسار کو سختی سے کہہ دیا کہ بھائی کے کمرے میں بلکل نہیں جانا ،جب تک وہ خود نہ بلائیں ،رخسار اس وقت تو کپڑے تبدیل کر کے اماں بی کے کمرے میں لیٹ گئی مگر دل میں کھد بد لگی تھی۔۔۔مگر کیا۔۔۔اس کے معصوم ذہن میں کوئی خاکہ نہیں تھا ،نہ کچھ دیکھا نہ سنا صاف سلیٹ کی طرح اس کا دل اور دماغ تھا اس کے ذہن میں ایک ہی بات آرہی تھی کہ شادی کے بعد کیا دولہا اور دلہن ایک ہی کمرے میں اکیلے رہ سکتے ہیں ،اس سے آگے اس کی سمجھ بوجھ جواب دے جاتی ، عجیب وغریب خیالوں میں گم ،سونے کے لیٹی مگر مرغن غذا کھانے کی وجہ سے اس کو زیادہ ہی پیاس لگ رہی تھی پیاس کی شدت نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تو سوچا جا کر پانی پی آئے پھر جب اماں بی کے ہلکے ہلکے خرّاٹے سنائی دینے لگے تو وہ چپکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی بھائی کے کمرے کے باہر پہنچی ہی تھی کہ بھابھی کی جھرنوں جیسی ہنسی سنائی دی۔وہ ٹھٹکی اس کے قدم وہیں رک گئے ، بھائی کی آواز دھیمی سی سرگوشی کی طرح آرہی تھی پھر بھابھی کی ہنسی پھر بھابھی نے جواب میں کیا کہا ،سمجھ نہیں آیا لیکن بھائی کے زوردار قہقہے سے اندازہ ہوا کہ کچھ خاص مذاق ہوا ،وہ کچھ دیر وہیں کھڑی سنتی رہی ، کچھ عجیب سی آوازیں آنے لگیں ،کبھی چوڑیاں کھنکتیں اور کبھی بھابھی کی ہنسی کھنکتی ، بھائی کی آواز اور پھر ہنسی ،دس پندرہ منٹ وہ دروازے کے پاس کھڑی رہی اگرچہ کان نہیں لگائے لیکن پھر بھی کچھ قریب ہی تھی۔

آوازیں بہت دلفریب تھیں اور سننے میں دلچسپ ،رخسار محو تھی کچھ سمجھی کچھ نہیں سمجھی لیکن جو کچھ بھی سمجھی وہ خوشگوار ہی تھا وہ پھر پانی لینے بڑھی پانی پیا اور واپس اماں بی کے پاس جا لیٹی ،کب آنکھ لگی کب سوئی ،صبح اٹھی تو فورا" رات کی باتیں یاد آئیں وہ بھابھی سے ملنے بھاگی ،اماں نے بھانپ لیا زور سے بولیں ''رخسار خبردار بھائی کے کمرے میں نہیں جانا , چلو جاؤ باورچی خانے میں بہنوں کے ساتھ ناشتے کی تیاری کرو،''

''کیوں کل تو آپ نے کہا تھا صبح جلدی اٹھنا ناشتہ بھابھی کے گھر سے آئے گا'' رخسار نے منہ پھلائے ہوئے کہا

''ارے آئے گا ،مگر ہم بھی تو کچھ پیش کریں گے نا،''

''چل بٹیا جا کے کام دیکھ''

پیار پچکار کر کے رخسار کو ٹال دیا بھائی کے کمرے میں جانے سے روک لیا ،سمجھ تو وہ بھی گئے پھر بہن اور کزن کے بچوں کے ساتھ مگن ہوگئے ،اور پھر تیار ہو کر سب ناشتے کے دسترخوان پہ بیٹھے تب ہی دولہا دلہن کو دیکھا ،دلہن سمٹی سمٹائی ،ایک بیش قیمت جوڑا پہنے بلکل تر و تازہ کلی لگ رہی تھی اور اس کے چہرے کی چمک اس کی خوبصورت رات کی چغلی کھا رہی تھی ،ماشاءاللہ ،اماں بی نے دولہا دلہن کی بلائیں لیں ،صدقہ اتارا اور پھر اپنے ہاتھوں سے کھیر کھلائی ،دلہن کے والدین اور کچھ رشتے دار تھے ادھر شکیل احمد کا پورا خاندان ،دلہن والے خوب ناشتہ لائے اور دولہے کی طرف بھی خوب پکوان پیش ہوئے ناشتہ ہوا اور ساتھ بہت سی باتیں چلیں ،دلہن کے گھر والے اپنے گھر روانہ ہوئے تو دولہا دلہن پھر کمرے میں بند ہوگئے ، رخسار مسلسل بھائی بھابھی کی حرکات وسکنات ،اشاروں کنایوں پہ نظر رکھے ہوئے تھی۔

وہ اپنی عمر کے اس دور میں پہنچ گئی تھی جب ہر لڑکی کے دل میں کسی پیارے ہمسفر کو پانے کی تڑپ پیدہ ہونے لگتی ہے ، حسین جذبات , بنتے سنورنے ، کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کے خوبصورت امتزاج سے بھرے دلگداز خیالات ،ان خیالات میں گم رہنا فطرت کا تقاضا ہے ،ولیمہ اگلے دن تھا اس لیے کسی کو کوئی جلدی نہیں تھی دوپہر تین بجے پھر دوپہر کا کھانا ہوا تو دلہن ایک اور نئے جوڑے میں سجی ہوئی دولہا کے ساتھ آن بیٹھی ،دولہا نے ہلکا سا کچھ کہا تو دلہن کی ہنسی چھوٹ گئی ،ہنسی روکنے کو منہ پر تیز لال مہندی سے رچا ہاتھ رکھا تو چوڑیاں کھنکیں ۔اس وقت صرف رخسار نے اس بات کو محسوس کیا ، دلہن واقعی خوش

مزاج تھی ،سب مہمان تو کل رات چلے گئے تھے اپنے ہی گھر کے افراد تھے اتنی بڑی حویلی میں بیس پچیس افراد بھی ایک ساتھ ہوں تو پتہ نہیں چلتا تھا۔

موسم بہت خوشگوار تھا رخسار رات کا کھانا کھا کر دالان میں ٹہلنے کے لیے چلی آئی ،اس کے خیالوں میں بس بھابھی کی ہنسی ، چوڑیوں کی کھنک اور بھائی کی کانوں میں سرگوشی کرنا۔۔۔گھوم رہا تھا وہ اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اچانک ماں بی نے آواز دی " آجاؤ کل ٹہل لینا" ولیمہ کل دوپہر کا تھا اس لیے صبح سویرے ہی اٹھنا تھا ،رات کو جب سب سو گئے تو رخسار کا دل مچلنے لگا کہ پھر سے وہ دلچسپ اور دلفریب آوازیں سنے ،وہ دبے پاؤں اٹھی اور بھائی کے کمرے کے باہر جا کھڑی ہوئی اور پھر وہی عجیب سی آوازیں کبھی چہکنے کی کبھی کھلکھلانے کی اور خاص طور پر دلہن کے منہ سے عجیب سی آوازیں اور پھر بھائی کی ہنسی ،کل رات کی طرح خوشگوار اور زیادہ بلند کیونکہ اب کی بار رخسار نے کان دروازے سے لگا رکھے تھے، ایسی آوازیں آنے لگیں جنھیں سن کر اس کے سارے وجود میں گدگدی سی ہونے لگی نامانوس سی آوازیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں اور جو احساس ان کو سن کر اسے ہو رہا تھا وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، کچھ دیر تک دنیا مافیا سے بے خبر وہ دروازے سے کان لگائے جامد کھڑی رہی ایک دم اماں بی کی آواز بجلی کڑکنے کی مانند آئی ،وہ سٹپٹا گئی اس سے پہلے اماں اس کے سر پر پہنچتی وہ باورچی خانے میں جا گھسی " ارے تو یہاں اس وقت " اماں بی پانی پینے آئی تھی ,رخسار ہکلا کر بولی ،" جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو "" تو کب سے اس وقت پانی پینے لگی " چل جلدی چل سو جا" اور اماں بی کا ہاتھ تھامے وہ کمرے میں چلی گئی ، بھائی کے کمرے سے اب بھی ہنسی کی آوازیں آرہی تھی ،وہ سو تو گئی مگر دلہن شادی میں الجھا رہا، پھر دوپہر کا ولیمہ ہوا اور شادی آئی گئی ہوگئی ،دلہن نے گھرداری میں قدم رکھا اور دولہا نے کاروبار سنبھالا۔

چھ ماہ کے اندر اندر رخسار کا رشتہ آگیا رخسار جو پڑھنے کی شوقین تھی "ابھی تو اٹھارہ کی ہوئی ہے بی اے تو کرلے،" بڑی بہن راشدہ نے ٹہوکا دیا، " نہیں رشتہ بہت اچھا ہے اونچے گھر کا بہت اونچا خاندان ہے لوگ ترستے ہیں ان سے رشتے داری کے لیے "اماں بی جیسے پر تولے بیٹھی تھیں ،نواب شکیل احمد سے تو لڑکے کے باپ نے نیاز مندی سے کہا کہ میرے بیٹے کو فرزندی میں لے لیجیے تو نواب صاحب تو اسی وقت مان گئے ہم پلہ تھے اور ساکھ بھی اچھی ، پھر گھر کی عورتوں تک بات پہنچی تو بس رخسار کی بڑی بہن راشدہ نے اعتراض کیا کیونکہ اسے بھی پڑھنے کا شوق تھا مگر اس کی شادی بھی ایف اے کے بعد ہوگئی تھی ،رخسار تو پڑھائی میں اچھی تھی اور مزید پڑھنے کی خواہاں بھی:

"اچھا اماں ایک بار تو رخسار سے پوچھ لیں اس کی کونسی عمر نکلی جارہی ہے " راشدہ آخری وقت تک زور لگاتی رہی لیکن اماں کے پوچھنے سے پہلے ہی رخسار نے کہا آپی رہنے دیجیے اماں ابا کچھ سوچ کر ہی رشتہ کر رہے ہیں اماں تو چونک گئیں کیونکہ انھیں اس سے یہ امید نہیں تھی ، یہاں بھی سارے معاملات ہنسی خوشی طے پا گئے خوب لین دین تحفے تحائف نوکروں تک کے منہ موتیوں سے بھر دیے کیا کمی چھوڑی ,ایک سے بڑھ ایک قیمتی جوڑا اور جوڑے کے ساتھ ہم رنگ جڑاؤ گہنا ،شادی کی تیاریاں جیسے راجہ مہاراجہ دولہا بھی بارات دو گھوڑا بگھی پہ لے آیا ،دھوم مچ گئی سارے شہر میں کہ اب بھی ایسی روایتی سج دھج سے بارات جاتی ہے اور پھر دولہے کی شیروانی پہ سونے کے تار کی کڑھائی اور سونے کے بٹنوں سے مزین تھی, دلہن بھی سونے موتی سے لدھی ہوئی بھاری بھرکم لہنگا جس پر خالص موتی اور زمرد جڑے تھے، نازک سی رخسار دھیمی سی رفتار اور ایسا روپ سروپ کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے ،کوئی پری, حور, اپسرا زبردست اہتمام چاؤ چونچلے وہی رسمیں وہی نیگ ،راستہ رکائی ،دودھ پلائی وہی منظر بڑے سے کمرے میں ،بہترین سیج ،چاروں طرف پھولوں میں رچا بسا ماحول، نازک سی دلہنیا کے نازک سے ارمان ،دل کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی بھائی اور بھابھی کی شادی کی رات کمرے سے آنے والی آوازیں، اب اسے سوچ کے لگ رہا تھا جیسے وہ آوازیں نہیں مدھر راگنیاں تھیں ایسا ساز جو ابھی کچھ دیر میں اس کمرے میں گونجنے والا ہے من ہی من میں مسکائی ،جیسے ہی دروازہ بند ہوا تو کسی حد تک وہ شرمائی اور گھبرائی ،نظریں تو پہلے ہی جھکی تھی اب بھاری کامدار دوپٹے سے جھکی گردن مزید جھک گئی، ہتھیلی پر پسینہ آگیا اور لگا دل سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا موسم تو خنک تھا مگر اسے گرمی لگنے لگی اسکا دل چاہا کہ ٹھنڈا یخ پانی پی لے، جب دولہا اس کے پہلو میں بیٹھا، تو کچھ دیر وہ دولہے کے بولنے کی منتظر رہی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دولہا اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جارہا ہے لیکن یہ بولتا کیوں نہیں وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ " دولہا خاموش کیوں ہے , وہ سب باتیں کیوں نہیں کر رہا جسے سننے کے لیے وہ بیتاب تھی، جیسے بھائی بھابھی کے کمرے سے آتی تھیں"

کچھ دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد دولہا نے کچھ رسمی جملے بولے۔۔۔ پھر جو کچھ بھی ہوا اس نے سوچا نہیں تھا نہ ہی بھائی بھابھی کے کمرے سے کان لگا کر سنا تھا اسکا بدن ہی نہیں روح تک مسلی جا چکی تھی، وہ تکلیف اور دکھ سے کراہ رہی تھی، اس کی آنکھوں کے کنارے گرم آنسوؤں سے گیلے ہو رہے تھے, اس کے منہ سے نکلنے والی آوازیں کوئی سن نہ لے اس نے تیز سرخ مہندی سے رچا ہاتھ اپنے منہ پہ زور سے رکھ لیا۔

دھڑکن

کیا آپ جانتے ہیں کہ جب اسٹیتھو اسکوپ ایجاد نہیں ہوا تھا تو ڈاکٹر مریض کے دل کی دھڑکن سننے کے لیے اپنا سر مریض کے سینے سے لگا کر دھڑکن سنا کرتے تھے مگر پھر آئے دن مرد ڈاکٹرز کی بے احتیاطی سے پریشان ڈاکٹر رینی لینیک شبانہ روز محنت سے 1816ء میں اسٹیتھو اسکوپ جیسا باجا آلہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔۔۔!!

"فروغِ بزمِ امکاں"

مولانا عبدالمجید سالک

(۱۲۔ستمبر۱۸۹۴تا۲۷۔ستمبر۱۹۵۹ء)

چراغِ زندگی ہو گا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جییں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زُلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منوّر تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مُستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے دَور میں ڈالیں خِرد نے اُلجھنیں لاکھوں
جنوں کی مُشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے

نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوعِ مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شامِ غریباں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ڈوبنے کے بعد اُبھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پہ چمکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا
یہی سُرخی بنے گی زیبِ عُنواں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اَب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

○

ولی عالم شاہین

(کینیڈا)

حرف کا اپنی ہی زنجیر سے دم ٹوٹ گیا
اس قدر زورِ قلم تھا کہ قلم ٹوٹ گیا

ذہنِ قلاش کی افتاد ایودھیا ، کاشی
شور ہے سلسلۂ دیر و حرم ٹوٹ گیا

رہ گئی شعبدہ بازوں کی انا تک محفوظ
ہم نواؤں پہ ترے کوہِ الم ٹوٹ گیا

فاصلہ رکھا نہ کچھ اس کے پرستاروں نے
گھس کے سجدوں سے وہ پتھر کا صنم ٹوٹ گیا

جس سے ہم رشتہ رہی وحشتِ چشمِ نگراں
راستے کو وہ ملاتا ہوا خم ٹوٹ گیا

ضبط کی دیر سے جس پر تھی نظر حیرت کی
اک ستارہ وہ سرِ دیدۂ نم ٹوٹ گیا

ہم پہ آئی وہ گھڑی ایک بگولے کی طرح
آنکھ جھپکی بھی نہ تھی دل پہ ستم ٹوٹ گیا

آسماں گیر ہوا تھا کہ وہ سرکش ٹھہرا
سر کہ تھا اپنی ہی دہلیز پہ خم ٹوٹ گیا

تھا وہ افسردہ سی اک شمع کے رشتے کا فسوں
اک شبِ تار کا شاہین بھرم ٹوٹ گیا

○

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

جن کو آتا ہی نہیں لفظوں کا استعمال تک
ان کی نظروں میں ہیں چھوٹے غالبؔ و اقبالؔ تک

خوش گماں، خود ساختہ علامہ کچھ ایسے بھی ہیں
کٹ نہیں پائی برابر جن کی اپنی نال تک

آئینوں سے بھی وہی نظریں چرانے لگ گئے
اجنبی جن کو لگے خود اپنے خدو خال تک

یہ گرفتاری کے حربے اے شکاری بھول جا
لے کے اُڑنے لگ گئے ہیں اب پرندے جال تک

بام و در کی زیب و زینت ماں اک ایسی بیل ہے
پھول، پھل، پتے تو پتے، ہے دعا گو چھال تک

بات بڑھتے بڑھتے اب تو آبرو تک آ گئی
ہم یہ سمجھے تھے کہ یہ قصہ ہے جان و مال تک

جانتجھے یہ خوف کافی ہے کہ میری زد پہ ہے
میں کہاں کرنے لگا پیچھا ترا پا تال تک

خیرؔ آخر سیکھ لیں تم نے بھی دنیا داریاں
تم بھی کرنے لگ گئے بونوں کا استقبال تک

○

صابر ظفر
(کراچی)

گُل، ہوئے جاتے تھے کیا کیا، چمنِ سُرخ میں گم
مَیں بھی خلوت میں ہُوا پیرہَنِ سُرخ میں گم

سرخ یاقوت ہو جیسے کسی یاقوت کے پاس
اک تنِ سرخ تھا اک اور تنِ سُرخ میں گم

رنگ جمتا ہی نہ تھا اور کسی حیلے سے
خون تھوکا تو غزل تھی سخنِ سُرخ میں گم

دور جاتا ہوا ' زنجیر زنی کرتا ہوا
ہو گیا کوئی کسی انجمنِ سُرخ میں گم

جتنے عشّاق شہیدوں کے ابھی زندہ ہیں
ہونا چاہیں سبھی دار و رسنِ سُرخ میں گم

دل کسی اور طرف جانے کو تیّار نہ تھا
ہو گیا وہ بھی خطوطِ بدنِ سُرخ میں گم

سلوٹیں اور بھی تھیں، اور کشش رکھتی تھیں
بدلی کروٹ تو ہوا میں، شکنِ سُرخ میں گم

نکلو گے تیرہ شبی سے تو مجھے پاؤ گے
آفتابِ ازلی کے وطنِ سُرخ میں گم

کیا محبّت تھی عیاں بھی تھی نہاں بھی تھی ظفرؔ!
کیا زباں تھی کہ ہوئی اُس دہنِ سُرخ میں گم

○

ساگر ترپاٹھی

(ممبئی)

بکھرے ہوئے جذبات کا عنوان ہیں ہم بھی
تم ساتھ نہیں ہو تو پریشان ہیں ہم بھی!!

شمشیر وقف موت کے ان سوداگروں سے !
حیران اگر تم ہو پریشان ہیں ہم بھی!!

آنکھوں میں بسایا ہوا ہو خواب کوء تم!
سینے میں سجایا ہوا ارمان ہیں ہم بھی!!

دو چار ہی دن اور ہے دنیا کی کہانی!
دو چار ہی دن کے یہاں مہمان ہیں ہم بھی !!

بھولی ہوئی نایاب سی تم بھی ہو کوئی شئے!
کھویا ہوا اک قیمتی سامان ہیں ہم بھی!!

بیچین ہمارے لئے رہتے ہو اگر تم!
بیتاب تمہارے لئے ہر آن ہیں ہم بھی!!

پیچیدگی رشتوں ہمارے نہیں کوء!
تم جتنے سہل اتنے ہی آسان ہیں ہم بھی!!

امیدیں کء دل میں تمہارے ہیں فروزاں !
آنکھوں میں لئے سیکڑوں امکان ہیں ہم بھی!!

ہندو ہیں اگر آپ مسلماں کی نظر میں !!
ہندو کی نگاہوں میں مسلمان ہیں ہیں ہم بھی!!

ساگر ذرا افسانہ دل کھل کے سناؤ!
نادان اگر تم ہو تو نادان ہیں ہم بھی !!

○

قیصر نجفی

(کراچی)

حیراں نہ ہو کہ کوئی یہاں لب کشا نہیں
اس شہرِ بے نوا میں کوئی بولتا نہیں

اُن کے اگر نہیں ہے مظالم کی کوئی حد
یاروں کے صبر کی بھی کوئی انتہا نہیں

طوفانِ گردو باد میں ہوتا رہا نہاں
لیکن کبھی ہواؤں سے سورج بجھا نہیں

اپنے اندھیرے گھر پہ مجھے ناز کیوں نہ ہو
مانگے ہوئے چراغ سے روشن ہوا نہیں

قسمت سے ایک بار کِھلا تھا لہو ہُوا
پھر روشنی کا پھول چمن میں کِھلا نہیں

طغیانیوں سے کھیلنا آتا نہ ہو جسے
وہ ناخدا کسی بھی طرح ناخدا نہیں

میں ہمرکاب وقت تھا قیصؔر اسی لیے
یارانِ سُست گام کی خاطر رُکا نہیں

○

خالد اقبال یاسر
(اسلام آباد)

سپاہ شوق کی میداں میں سالاری بھی کرنا ہے
حضور شاہ اپنی وضع درباری بھی کرنا ہے

بچھا کر چار جانب ان گنت لاشیں نہتوں کی
انھی کے سوگ میں سر پیٹنا، زاری بھی کرنا ہے

وفا کی اس طرح تجدید کرنا ہے حسینوں نے
دلوں کو توڑ دینا اور دلداری بھی کرنا ہے

پلٹ کر آ پڑے چاہے خود اپنے جاں نثاروں پر
چہار آئینہ بکتر، تیغ دو دھاری بھی کرنا ہے

کہیں جرأت، کہیں پر مصلحت بھی کام آئے گی
کہیں شائستگی کے ساتھ عیاری بھی کرنا ہے

بھرم رکھنا ضروری ہے پرانی وضع داری کا
ضرورت آ پڑے تو لہجہ بازاری بھی کرنا ہے

اسی شاعر سے لکھوا کر جلوس شاہ پر یاسر
نیا سکہ اسی ٹکسال نے جاری بھی کرنا ہے

○

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

تیری اُلفت نے جو دیوانہ بنا رکھا ہے
دل کی دھڑکن نے بڑا شور مچا رکھا ہے

کیسے اظہارِ محبت کا سندیسہ بھجوں؟
اپنا ہر غم جو سندیسے میں چھپا رکھا ہے

کب وفا ہوں گے وہ وعدے جو کئے ہیں تم نے
ہم نے اُن وعدوں کو بس دل سے لگا رکھا ہے

اپنے خوابوں میں سجا رکھی ہے تیری صورت
اک تصور ہے جو سینے میں چھپا رکھا ہے

دل یہ کہتا ہے تُم اِک روز چلے آؤ گے
منتظر دل کو یہی راز بتا رکھا ہے

تیرے آنے سے جو ہو جائے گی رونق دل میں
یہی منظر ہے جو اس دل میں بسا رکھا ہے

اک حقیقت نے بدل دی مری دنیا ہی ریاضؔ
اس کے جلووں کے سوا زیست میں کیا رکھا ہے!

○

ڈاکٹر مسعود جعفری
(حیدرآباد، دکن)

تمہارے پیار کی چاہت میں اب بھی زندہ ہوں
اسی خبر کی اشاعت میں اب بھی زندہ ہوں

منافقوں کی سیاست میں اب بھی زندہ ہوں
ستم گروں کی ریاست میں اب بھی زندہ ہوں

کوئی دریچہ کھلا ہے نہ کوئی دروازہ
اندھیری شب کی عمارت میں اب بھی زندہ ہوں

زمانے بھر کی بلائیں بھی کیا بگاڑ سکیں
خدائے کل کی حفاظت میں اب بھی زندہ ہوں

بھٹک سکا نہ کبھی جادہ محبت سے
پیمبروں کی وراثت میں اب بھی زندہ ہوں

یہ اور بات کہ نفرت کا بول بالا ہے
محبتوں کی امانت میں اب بھی زندہ ہوں

مرے حریف مجھے دیکھتے ہیں اٹھ اٹھ کے
میں رہزنوں کی قیادت میں اب بھی زندہ ہوں

کوئی خراش مرے جسم پہ لگی ہی نہیں
میں قاتلوں کی حراست میں اب بھی زندہ ہوں

جو ہم کو کوستے رہتے ہیں جعفری ہر پل
انہی کے شہر عداوت میں اب بھی زندہ ہوں

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

شکوہ یہ بجا ہے کہ سرابوں میں رہے ہیں
تا عمر، مگر ہم بھی تو خوابوں میں رہے ہیں

کیوں تو نے حسِ سود وزیاں دے کے اُتارا
ہم زندہ رہے ہیں، پہ حسابوں میں رہے ہیں

پھر، قصرِ محبت کی تھی، تعمیر ناممکن
تجدید کو مصروف ، جوابوں میں رہے ہیں

ملبوسِ فقیری میں بھی، انداز ہے شاہی
ہم صحبتِ شاہوں میں، نوابوں میں رہے ہیں

مکتب سے محبت کے نکالے گئے اکثر۔۔۔
اقوال مگر اپنے، نصابوں میں رہے ہیں

ماضی کے حوالوں کے سوا، کچھ بھی نہیں پاس
مرجھائے ہوئے پھول، کتابوں میں رہے ہیں

ہم بھی تو ہیں ہم راہ، سروشؔ صفِ دشنام
ہم بھی تو جہاں بھر کے، خرابوں میں رہے ہیں

○

نیکی

تابش خانزادہ
(لاس انجلس)

عزیز بھائی کی زندگی کا سوال تھا۔ زخم سے خون کسی جھرنے کی طرح ضائع ہورہا تھا۔ ہسپتال پہنچتے ہی ان کی حالت بالکل ہی دگرگوں ہوگئی تھی۔ ایمرجنسی کے ڈاکٹر نے دس بوتلیں خون مانگا اور وہ بھی چند لمحوں کے الٹی میٹم پر۔ ڈاکٹر کے مطابق اگر زخمی کو فوری خون نہ ملا تو موت کا خدشہ تھا۔ ہم سب رشتے داروں نے خون کے لیے اپنے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ آٹھ آدمیوں میں سے دو آدمیوں کا خون عزیز بھائی سے میچ کرتا تھا اس لیے ان کا خون دینا پڑا۔ ڈاکٹر کے مطابق دو آدمیوں سے ایک وقت میں چند بوتلیں خون کی ہی لی جاسکتی تھیں۔ اس لیے اور ڈونر اکٹھے کرنے پڑے تھے۔ میں بھاگا اور ہر جاننے والے کو عزیز بھائی کی حالت بتا کر خون دینے کی درخواست کی تو خالو صمد نے عزیز بھائی کے لیے ایک بوتل خون کا عطیہ دیا۔

عزیز بھائی کی جان بچ گئی اور انہوں نے ہر اس شخص کا جس نے خون دیا تھا، فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔

خون دینے کے ایک ہفتے بعد ایک صبح میں گھر میں بیٹھا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ دروازے پر خالو صمد کھڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگے، میں نے تمہارے بھائی کو پچھلے ہفتے خون کی ایک بوتل دی تھی آج میں ذرا کمزوری محسوس کررہا ہوں اس لیے تم ذرا آج میری دکان کا خیال رکھو۔ میں جونہی قوی ہوتا ہوں دکان پر آتا ہوں۔ میں اسی وقت خالو کی دکان پر چلا گیا۔ خالو شام تک دکان پر نہ آئے۔ میں نے اپنے سکول کی پروا نہیں کی کہ خالو نے ہمارے برے وقت میں ساتھ دیا تھا۔ چند دن گزرے تو خالو کے گھر سے پھر بلاوا آیا۔ ظفر بھائی اس بار ان کے ہاں گئے تو معلوم ہوا کہ خالو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ خون کی ایک بوتل جو انہوں نے دو ہفتے پہلے عزیز بھائی کو دی تھی اس کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہیں اس لیے اگر آج ظفر بھائی خالو کی بجائے گودام سے جا کر ان کا مال دکان پر لے آئیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ ظفر بھائی کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ آخر خالو نے آڑے وقت میں ہماری بھی تو مدد کی تھی۔ وہ سارا دن ظفر بھائی خالو کا مال گودام سے نکلوا کر اُن کی دکان پر ڈھوتے رہے۔

ایک ہفتہ نہیں گزرا ہوگا کہ خالو نے ایک دفعہ پھر پیغام بھجوایا کہ کمزوری کی وجہ سے وہ دکان پر نہیں جاسکتے اس لیے ہم بھائیوں میں ایک آدھ جا کر دکان کھولے۔ وقت کے ساتھ ساتھ خالو کی کمزوری میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ ہم میں سے ہر بھائی، بھانجا یا پھر کوئی نہ کوئی خالو کی خدمت میں الہ دین کے جن کی طرح موجود رہنے لگے۔ اس کے باوجود بھی خالو نے ہر آنے جانے والے کو، ہر ملنے ملانے والے کو، گھر کے ہر فرد کو اور خاندان کے ہر بشر کے علاوہ اپنے گاہکوں کو اپنی کمزوری کا سبب بتانا شروع کر دیا۔ وہ بات کو کچھ یوں شروع کیا کرتے تھے۔ پہلے مخاطب سے پوچھتے کہ اس نے کبھی کسی کو خون دیا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد کچھ یوں گویا ہوتے، میں نے پچھلے دنوں اپنے بھانجے عزیز میاں کی جان بچائی۔ اگر میں خون کی ایک بوتل اسے عطیہ کے طور پر نہ دیتا تو یہ جواں سال لڑکا اپنی موت آپ مرجاتا۔ جب سے میں نے اسے خون دیا ہے، کمزوری ہے کہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ بیٹھے بیٹھے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ پھر وہ ہم میں سے کسی ایک کی طرف (جو وہاں موجود ہوتا) اشارہ کر کے کہتے کہ انہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں نے ان کے ساتھ کتنا بڑا احسان کیا۔ میں تو بس اللہ تعالیٰ سے اس احسان کا بدلہ چاہوں گا۔ یہ لوگ کسی کی کیا قدر کریں گے۔ کبھی اگر ذرا سا کام کے لیے کہو تو پچاسوں نخرے دکھاتے ہیں۔

خالو جب تک زندہ رہے ہم میں سے کوئی نہ کوئی ان کے کچوکے مسلسل سہتا رہتا۔ مرتے دم تک ہم نے خالو سے کچھ نہ کہا۔ ان کی ایک خون کی بوتل کا عطیہ ہمیں جتنا مہنگا پڑا اتنا مہنگا سودا ہم نے کسی سے کبھی نہیں کیا تھا۔ خالو کے اس رویے سے ہم نے ایک سبق ضرور سیکھا ہے کہ اگر ہم کسی سے نیکی کر کے بھلا نہیں سکتے تو بہتر یہ ہے کہ کسی سے نیکی بالکل ہی نہ کریں کہ یہ ہمارے لیے اس لیے بھی بڑی نیکی ہوگی۔ دوستو اگر آپ نے کسی پر نیکی کر کے اس کو تازندگی اپنی غلامی میں لے لیا ہے تو خدا کے واسطے اسے آزاد کر دیجئے کہ نیکی کر کے بھول جانا ہی اصل نیکی ہے۔

تشخیص

صبح کی سیر کے بعد، ڈاکٹروں کا ایک گروپ سڑک کنارے خوش گپیوں میں مشغول تھا کہ سامنے سے ایک شخص لنگڑاتا ہوا ان کی طرف بڑھنے لگا۔

ایک ڈاکٹر بولا: اسے arthritis ہے

دوسرا بولا: اسے plantar fasciitis ہے

تیسرا بولا: اسے ankle sprain ہے

چوتھا بولا: اسے lower motor neuron lesion ہے

پانچواں بولا: اسے hemiplegic scissor gait ہے

اس سے پہلے کہ چھٹا ڈاکٹر کچھ کہتا اور اپنی تشخیص بتاتا، وہ شخص ان کے پاس پہنچ گیا:

بھائی قریب کوئی موچی ہے؟ میری چپل ٹوٹ گئی ہے۔

گونگا

افتخار بلوچ
(کراچی)

مشین کی گُھر گُھر سے پاس سے گزرنے والوں پر وہ کڑی بیت جاتی تھی کہ وہ پھر اُدھر سے گزرنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا کرتے تھے مگر کیا کرتے! ساری فیکٹری کا دارومدار ہی اسی مشین کی کارکردگی پر تھا۔ میکانکی مہارت رکھنے والے عملے نے سرتوڑ کوششیں کی تھیں کہ اس مشین کی موٹر کا شور کم کیا جائے مگر بے سود! بہت مرتبہ مشین کو بند کر کے اس کے پرزے نکالے گئے اُن پر نت نئی قسم کا تیل ڈالا گیا گریس ڈالی گئی موٹر کی جگہ کو برابر کیا گیا غرض یہ کہ میکانکی عملے نے اپنی دسترس کا تمام علم عمل میں بدلا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہاں نقصان ہوا وہ یہ کہ انہیں اپنے ہی علم کی بنیادیں کھوکھلی محسوس ہونے لگیں! علم کبھی کھوکھلا محسوس نہیں ہونا چاہیے چاہے کتنا ہی سطحی کیوں نہ ہو۔ علم زندگی کا عرفان ہے اور زندگی بھی بھلا کھوکھلی محسوس ہو سکتی ہے!

مشین چلتی رہی فیکٹری بھی چلتی رہی سیٹھ پیسہ بناتا رہا اور لوگ بھی روزی ڈھونڈتے رہے! شور کم نہ ہوا نہ ہی میکانکی عملے کی کوششیں کم ہوئیں۔ جب یہ موٹر چلتی تھی تو اس میں نصب بہت سے پائپ ہلتے تھے جن میں سے کسی میں تیل، کسی میں پانی اور کسی میں سے ہوا گزرتی تھی۔ مشین کے بھیانک ارتعاش سے پائپوں کے جوڑوں میں رخنے پڑ جاتے۔ پانی اور تیل حسبِ توفیق فرش پر بکھر بکھر کر ایک غلیظ اور بدبودار قسم کے ماحول کو جنم دیتے رہتے۔ کوئی چھ ماہ کا وقت بیت گیا مگر میکانکی عملے کی تمام کوشش ضائع جاتی رہی۔ ایک دن تو سیٹھ بھی مشین کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور کسی اچھی کمپنی کے ماہر عملے کو معائنے کے لیے بلا لیا۔ انہوں نے آ کر صورتحال دیکھی اور ایک ضخیم رپورٹ تیار کر کے سیٹھ کو پیش کی۔ اس رپورٹ کا لب لباب یہ تھا

"موٹر کو بدلا جائے اور نئی موٹر نصب کی جائے۔ اس مقصد کے لیے ہماری کمپنی بہت بہتر خدمات فراہم کر سکتی ہے۔ مزید یہ کہ اس بات کی گارنٹی بھی دی جائے گی کہ مشین ایک معینہ مدت تک ایسے شور اور ارتعاش سے پرہیز کرے گی اور ناگہانی صورتحال میں انشورنس کی شرائط کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا"۔

جب یہ رپورٹ سیٹھ نے پڑھی تو اسے محسوس ہونے لگا کہ جب تک اس کمپنی کو اچھے خاصے مہنگے داموں یہ ٹھیکہ نہیں دیا جائے گا یہ لوگ رپورٹ میں بھی حقائق سے پردہ پوشی کریں گے۔ اسے اچانک غصہ آیا کہ "یہ کیسا کاروباری سلسلہ ہے یہ کیسی دنیا ہے! پھر اس کا غصہ ماند پڑنے لگا کیونکہ وہ خود بھی یہی کرتا رہا تھا اور یہی تو پیسہ بنانے کا ذریعہ تھا۔ ان گنت دولت کے بعد مزدوروں کو صرف اتنی تنخواہ دینا کہ اُن کا چولہا جل سکے اور اگر وہ ستم ظریفی قسمت سے بیمار ہوں تو قرض کے پیچھے ذلیل ہوتے پھریں اور جو قرض لیتا ہے وہ پھر مسلسل قرض لیتا ہے جس سے غیرت مردہ ہو جاتی ہے۔ مردہ غیرت والا تو جیسے بھی حالات ہوں کام کرے گا! ذلیل ہو گا بے عزت ہو گا مگر کام کرے گا اور اگر وہ مجبور بھی ہو تو کیا کہنے!"

یہ سوچ کر سیٹھ کو ہلکی سی شرم محسوس ہوئی مگر وہ پھر مطمئن ہو گیا کیونکہ اسے احساس ہوا کہ " آخر یہ بھی کم ہے کیا کہ اس کی فیکٹری میں اتنے لوگ کام کرتے ہیں اُن کے گھر کا چولہا جلتا ہے یہ الگ بات کہ جیسی حالت میں جلے!"

جیسی حالت میں جلے! چاہے اُس میں اُن کی سفید اور سیاہ آنکھوں کے خواب جل جائیں! چاہے ان میں کی جوانیاں جل جائیں! چاہے زندگی جل جائے!

زندگی چاہے جل ہی کیوں نہ جائے مگر جب تک وہ کام آ سکتی ہے اُس سے کام لینا چاہیے اور مشین ابھی اتنی بھی خوفناک حالت میں نہیں تھی کہ کام نہ آ سکتی۔ اگلی صبح سیٹھ نے اعلیٰ افسران کی میٹنگ میں حکم دیا کہ معمول کے مطابق مشین کے تمام پرزوں کی آواز، ارتعاش اور درجہ حرارت کا معائنہ کیا جائے اور مشین کو ہر حال میں چلتے رکھا جائے فیکٹری بند نہیں ہونی چاہیے اور اگر کچھ ایسا ہوا تو ہرجانہ تنخواہیں ہونگی! جب یہ حکم ان دو چار افسران کی سماعت تک پہنچا جو کچھ حریتِ دل رکھتے تھے وہ بھی خاموش ہو گئے اور سوچنے لگے کہ ''آخر ہم سے بولا کیوں نہیں جاتا! ہم کیوں یہ نہیں بتا سکتے کہ مشین کا وقتِ سکرات قریب ہے! ہائے خواہش نے کتنا بے ضمیر کر چھوڑا ہے! زندگی کے اس مقام پر ایسی اجرت کے ساتھ ہم خواہشات ہی تو پوری کر رہے ہیں ضروریات تو بہت کم پیسے میں بھی پوری کی جا سکتی ہیں!''

ان دو چار افسروں میں سے صرف اظہر علی ڈاہری نے یہ سوچا تھا کہ "خواہشات کا بے جا حصول مجھے بے ضمیر بنا گیا اور وہ جن کی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں!"۔

وقت گزرتا گیا اور مشین چلتی رہی۔ مشین کے پاس ہر وقت ایک آپریٹر کھڑا رہتا تھا جو ہر تھوڑی دیر بعد مشین کو مختلف زاویوں سے دیکھتا اور واپس اپنی جگہ پر آ جاتا۔ اُس آپریٹر جس کا نام زاہد تھا کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اُن آنکھوں میں بھی ایک مسلسل گھر گھر ایک مسلسل شور اور ایک بے ہنگم ارتعاش محسوس ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ ارتعاش یہ گھر گھر اور یہ شور خاموش تھا بہت خاموش۔ خاموش چیزیں جتنی پرسکون نظر آتی ہیں اتنی خطرناک ہوا کرتی ہیں جیسے میری خاموش محبت! جیسے دامان کی خاموش شام! جیسے میری جان تمہاری خاموش آنکھیں جو زندگی کے شور سے بھرپور ہیں جن سے چھلک اٹھنے والے آنسو بھی مجسم معصومیت ہیں اور آنسو تو ہوتے ہی معصومیت ہیں! ایک وقت کی معصومیت بھی ہے جس کے آنسو انسان ہیں جو خاموش ہیں مگر ظالم ہیں ایک شور سے بھرپور ہیں!

زاہد کی سرخ آنکھوں میں شور شاید کسی ماتم کا شور ہو یا میکانکی عملے کی بے بسی پر اٹھنے والے قہقہوں کا شور! کچھ ایسا لگتا تھا مگر کوئی جانتا نہیں تھا کیونکہ نہ اُس نے کبھی کسی سے بات کی تھی نہ اُس سے کسی نے پوچھا تھا۔ مشین کے بھیانک شور میں بھی اُس کی خاموشی اتنی طاقتور تھی کہ جب کبھی دورانِ معائنہ اعلیٰ افسران نے اُس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی تو باقی لوگ بول پڑے تھے کہ یہ کچھ نہیں

بولتا اور افسران بھی سادہ لوحی سے آگے چل دیے تھے! کسی نے یہ نہ سوچا تھا کہ شاید خاموشی کچھ جانتی ہو اور وہ لفظوں کے بغیر سہی مگر اشاروں سے بولنا چاہتی ہو کچھ بتانا چاہتی ہو!

جب بھی ایسا ہوتا تھا زاہد کو غصہ آتا تھا مگر وہ کیا کرتا اُسے اندازہ تھا کہ خاموشی کچھ نہیں ہے اس کے کوئی دام نہیں اور خاص کر مجھ جیسی بے بس گہری خاموشی سے یوں بھی نظر چرالی جاتی ہے کیونکہ وہ فضول محسوس ہوتی ہے! مگر اگلے ہی لمحے اُسے سکون محسوس ہونے لگتا کیونکہ یہ احساس بھی بدرجہ اتم زاہد میں موجود تھا کہ پوری فیکٹری میں وہی واحد آدمی ہے جس کے بل بوتے پر یہ مشین چل رہی ہے یہ میکانکی عملہ تو بے بس ہے یہ افسران تو بے بس ہیں! اس سوچ کے ساتھ ہی ایک گہرا تمسخر اُس کے رگ وپے میں بے بسی کو چیرتا ہوا گزر جاتا وہ بے بسی جو اُسے اپنی خاموشی سے متعلق محسوس ہوا کرتی تھی!

ایک رات مشین چلتے چلتے بند ہوگئی۔ ڈیوٹی پر موجود لوگ اونگھ رہے تھے مگر زاہد جاگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں مشین کے پرزوں پر دوڑنے لگیں اور وہ "ہاہے ہوآ ای" کرنے لگا۔ چند لمحوں تک کسی کو خبر نہ ہوئی مگر پھر لوگ جاگ اٹھے۔ میکانکی اور برقی عملے کے لوگ مشین کی طرف بھاگے اور جب وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ زاہد کچھ پائپوں کو ہتھیلی سے مار رہا ہے۔ یہ تیل کے پائپ تھے جن میں موجود تیل درجہ حرارت کم ہونے کی وجہ سے جم چکا تھا جس کے باعث مشین کام چھوڑ چکی تھی۔ زاہد کے بالوں میں گرد جمی ہوئی تھی اور اس کی تیز نگاہیں مشین کے پرزوں پر گھوم رہی تھیں۔ یہ نگاہیں اتنی تیز تھیں کہ محسوس ہوتا تھا زاہد اپنی آنکھوں سے ہی فیکٹری کو چلا دے گا! مشین بند ہوئی تھی تو جیسے زاہد بھی اس کے ساتھ بند ہوگیا تھا۔ اُسے مشین سے ہرگز محبت نہیں تھی کیونکہ اس مشین کے وجود میں اس کا اپنا وجود دب چکا تھا۔ زاہد کو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کچھ بھی نہیں مگر اُس کا ایک دھڑکتا ہوا دل کبھی اس بات پر راضی نہ ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی محسوس نہ ہو۔ اُسے مشین سے آزادی بھی چاہیے تھی مگر وہ قید بھی بہت تھا۔ ایسی قید سے آزادی بھی نہیں ملتی جیسے محبت نارسا ہوجائے جسے انسان چھوڑ بھی نہ سکے اور جی بھی نہ سکے!

میکانکی عملہ کام میں مصروف ہوگیا تھوڑے ہی لمحات کے بعد اُن میں سے ایک آدمی نے زاہد کو کندھے سے ہلایا۔ اس سے پہلے کہ زاہد سے سوال کیا جاتا زاہد کے ہونٹ ہلے "ہاہے ہوآ ای آں!" اور ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے آواز کے سائے ابھرے۔ اتنے گھمبیر سائے کہ ہلانے والا ڈر گیا اور ایسے اشارے اُس نے زاہد کے جوان ہاتھوں سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھے کہ جن میں شدید بیزاری، بے اعتباری اور بغاوت عیاں تھی۔ زاہد کی شرابور پیشانی سے پسینے کی چند بوندیں یوں ٹپکیں کہ جنہیں وہ کھیاں سمجھا اور اُس نے بڑے زور سے ان مکھیوں کو ہٹانے کے لیے ہاتھ چلایا مگر اُس کی نظریں سامنے موجود شخص پر جمی رہی تھیں جن میں غصہ اور اضطراب عیاں تھا۔ زاہد کا کندھا ہلانے والے آدمی نے زاہد کا کندھا تھپکا اور پیچھے ہٹ گیا۔ زاہد دوبارہ مشین کے پرزے دیکھنے لگا اور میکانکی عملے کے لوگ بھی کام میں مصروف رہے۔ کوئی تین گھنٹے کی محنت کے بعد مشین چل پڑی کچھ دیر تو لوگ کھڑے دیکھتے رہے اور پھر چل دیے مگر زاہد وہیں کھڑا رہا خاموش اور بے چین!

میکانکی عملے کے لوگ جب واپس اپنے دفتر پہنچے تو زاہد کو ٹٹولنے والا آدمی اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا کہ:

"زاہد کو کام کے وقت چھیڑنا مناسب نہیں ایسے لگتا ہے جیسے ابھی کافر سمجھ کر ہم پر ٹوٹ پڑے گا"

"ہاں صحیح بات ہے یہ جو کر رہا ہوا سے کرنے دیا جائے ایسے لوگ من چاہی آزادی سے محرومی کا ازالہ کیا کرتے ہیں" دوسرے نے پرفکر انداز میں کہا۔

"میں نے دیکھا ہے اسے یہ اکثر ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بھی یہیں کھڑا رہتا ہے کیا اسے اضافی پیسے ملتے ہیں"

زاہد کو ٹٹولنے والے کی اب تک حیرانی قائم تھی۔۔۔

"ہاں پیسے تو ملتے ہیں مگر اتنے پھر بھی نہیں ملتے کہ جس سے کم ترین درجے کی خواہش ہی پوری کر لی جائے اور ایک بات سنا دوں اور وہ یہ ہے کہ سب سے کم درجے کی خواہش بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی سکون سے جی جائے" دوسرے نے ہاتھ میں اوزار تھام کر فلسفیانہ انداز میں کہا۔۔

"مگر یہ اتنا کام کیوں کرتا ہے؟ کیا اس فیکٹری سے باہر اس کے لیے زندگی کی سبھی رعنائیاں ختم ہوچکی ہیں" سائنٹیفک فلسفی سے پھر سوال ہوا۔۔۔

"زندگی کی رعنائیاں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں! اگر باہر کچھ نہیں ہے تو جناب یہاں کیا ہے۔ یہ تیل، پانی کے بدنما دھبے اور مسلسل گھر گھر! اس خرابے میں تو زندگی کا حُسن ڈھونڈنے کے لیے انتہائی اعلیٰ ظرف ہونا پڑے گا اتنا اعلیٰ ظرف تو شاید کوئی نہ گزرا ہو۔ باقی جہاں تک زاہد کا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ موٹر اور یہ جگہ اس کے لیے فرار ہے! باہر کی وسعت میں اس کی ذات قدیم محرومی کے باعث ترک کر دی گئی ہے اُس کے پاس اپنی ذات کو ثابت کرنے لیے خاموش وجود کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وجود تو جناب بولتا ہوا بھی ہوتو نہیں سنا جاتا آج کل پھر خاموش وجود کو کون سنے وہ تو ایسے سمجھیں جیسے ہے ہی نہیں! اور یہ جگہ یہاں کم از کم اُس کا ایک رعب قائم ہے اور آپ اسی رعب کے باعث تو ڈرے تھے اور وہ بھی ایسے کہ اب تک تجسس اور حیرانی نہیں گئی۔ مگر مجھے یقین ہے یہ رعب انتہا درجے کی بیزاری کی وجہ سے ہے۔ زاہد اس جگہ سے اتنا بیزار ہے کہ اب ایک برتری اُسے حاصل ہوچکی ہے۔ وہ بغاوت کے ذریعے کام کا ماہر بنا ہے اور ایسا اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ بغاوت اس کے اندر ہی پھیلتی پھولتی رہی ہے جسے کبھی باہر آنے کا دروازہ نہیں ملا کیونکہ دروازہ ہے ہی نہیں! اس کے اندر یہ موٹر اپنے شور اور اپنی تمام تر غلاظت کے ساتھ قید ہے جس کی ہر خرابی کو وہ ایسے دیکھتا ہے جیسے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ اسی وجہ سے تو ہماری بے عزتی ہوتی ہے اور زاہد خود بھی اس مشین میں قید ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے اپنی بیزاری کی مان کر اس قید سے چھٹکارا حاصل کر بھی لیا تو باہر ویرانی اور قاتل قسم کی اجنبیت کے ہاتھوں مر جائے گا۔ وہ جینا چاہتا ہے مگر اُسے احساس ہے جینے کے لیے آواز درکار ہے

خاموشی صرف فطرت کی اچھی لگتی ہے! ایسا میں نے اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھا اور ٹوٹی ہوئی آوازوں میں سنا جو بہت کم اس کے لبوں سے نکلتی ہیں اور ایسے نکلتی ہیں جیسے تاریخ کے تمام بے گناہ مقتول اپنے انتقام کا تقاضا کر رہے ہوں اور ان تقاضا کرنے والوں میں قابیل سرِ فہرست ہو!'' آخر کار اس سائنٹفک فلسفی نے سرد آہ بھری اور کہا:

''بھلا سوچو تو گونگے کا نام رکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے بتا تو وہ سکتا نہیں اور لوگوں کے لیے تو اُس کی بس اتنی شناخت ہی کافی ہے کہ وہ گونگا ہے''۔

پھر خاموشی چھا گئی کئی دنوں تک میکانکی عملے کے دفتر میں زاہد سے متعلق کوئی بات نہ ہوئی یہ سائنٹیفک فلسفی بھی اپنی دنیا میں گم ہو گیا۔ اسے تو گم ہونا ہی تھا اس کے پاس کون سے جواب تھے اس کے پاس تو توجیہات تھیں اور وہ بھلا جواب کیسے ہو سکتی ہیں!

اگلی صبح مشین کا یہ تین گھنٹے کا رک جانا سیٹھ کی پریشانی بن گیا اور سیٹھ صاحب کی پریشانی افسرانِ اعلیٰ کا دردِ سر بن گئی مگر زاہد تک کوئی اثر نہ گیا وہ اسی گھر گھر میں قید رہا!

ایک زوردار قسم کی میٹنگ ہوئی جس میں تجاویز سے زیادہ غصہ تھا اور حل ڈھونڈنے سے زیادہ وہ باتیں تھیں کہ جن سے بذات خود حل ڈھونڈنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے! بلآخر فیصلہ ہوا کہ فیکٹری میں ایسے ماہر انجینئر صاحبان کو بھرتی کیا جائے جو ایسی مشینوں کے معاملات سے انتہائی واقف ہوں۔ جنہیں علم ہو کہ کیسے امتناعی محافظت کے اصول وضوابط کو ایسی مشینوں پر لاگو کیا جاتا ہے جو کسی بھی وقت دغا دے سکتی ہیں۔ سیٹھ صاحب نے اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ نئے بھرتی ہونے والے انجینئر صاحبان ایسے ہوں جن کے پاس میکانکی، برقی، آلاتی غرض یہ کہ ہر قسم کا علم و ہنر موجود ہو۔ مزید یہ کہ ایسے انجینئر صاحبان کے لیے زیادہ مراعات اور بہتر تنخواہوں کا اعادہ بھی کیا گیا۔ چند دن بعد معیار پر پورے اترنے والے پانچ انجینئر صاحبان کو بھرتی کر لیا گیا۔ نئے بھرتی ہونے والے افسران واقعتاً انتہائی قابل ثابت ہوئے۔ اُن کی محنت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں فیکٹری کی تقریباً تمام مشینوں میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی مگر زاہد کی مشین کی گھر گھر اور زاہد بذاتِ خود جوں کے توں رہے۔ اس مشین نے اُن تمام انجینئر صاحبان کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی۔ ان نئے افسران کی مزید کچھ عرصے میں باقی لوگوں سے واقفیت بڑھ گئی اور ایک بے تکلفی سی پیدا ہو گئی۔ یہی معاشرتی زندگی کا اصول ہے کہ قیام اگر پرانا ہو جائے تو واقفیت بڑھتی ہے اور واقفیت کے امتیازی دائرے اگر مٹ جائیں تو بے تکلفی پیدا ہو جاتی ہے!

ایک دن معمول کے مطابق کام ہو رہا تھا کہ میکانکی عملے کے مینیجر اظہر علی ڈاہری نے ایک انجینئر عمر ارشد کو بلایا۔ عمر ارشد کی حسِ مزاح اور قابلیت دونوں ہی دیدنی تھیں۔ اظہر علی ڈاہری اپنی کرسی میں جیسے دفن ہو چکا ہو جب عمر ارشد اُس کے دفتر آیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد دونوں مشین کے معائنے کے لیے چلے گئے جہاں زاہد آنکھیں پھاڑ کر مشین کے پرزوں اور پائپوں کو دیکھ رہا تھا۔

اظہر علی ڈاہری نے سنجیدہ لہجے میں عمر ارشد سے پوچھا کہ:

''تمہیں اندازہ ہے کہ یہ مشین کیا کام کرتی ہے؟''

''یہ گرم تیل کو پریشر سے دھکیلتی ہے جو مختلف پائپوں سے ہوتا ہوا فیکٹری کی باقی مشینوں تک پہنچتا ہے سر!'' عمر ارشد نے سنجیدہ خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''بالکل ٹھیک کہا! مگر اس کا ارتعاش، شور اور اس کی خرابی تمہاری سمجھ سے کیوں دور ہے؟'' اظہر علی ڈاہری نے بھرپور متانت سے سوال کیا۔

''سر! ہم اس پر کام کر رہے ہیں مگر ایک تجویز ہے!'' عمر ارشد نے لبوں پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ سے کہا۔

''ہاں ہاں بولو! دیکھو جو بات اچھی ہو وہ ضرور بتانی چاہیے!'' اظہر علی ڈاہری کی متانت شفقت میں بدل گئی جس سے عمر ارشد کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔

''سر! مشین کا مسئلہ اس کی موٹر کی وجہ سے ہے اور موٹر رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اس کی جگہ ایک نلکا لگا دیتے ہیں جسے یہ زاہد چلاتا رہے گا!''

یہ فقرے جیسے ہی مکمل ہوا عمر ارشد کی مسکراہٹ ایک قہقہہ بن کر لبوں کے افق سے برس پڑی۔

''عمر! یہ مذاق ہے؟ یہ مذاق کا وقت ہے؟ سنجیدہ رہو!'' اظہر علی ڈاہری نے تیوری بدلتے ہوئے کہا۔

اچانک عمر ارشد کی آنکھیں سپاٹ ہوئیں اور ہنسی ختم ہو گئی۔ اُس نے کہا کہ:

''سر! کیا پچھلے وقتوں میں غلاموں نے دیو ہیکل جہازوں کے چپو نہیں چلائے! امریکا کی نوآبادیت اسی طرح تو ہوئی تھی۔!''

اظہر علی ڈاہری نے پھر بار شعلہ نگاہوں سے عمر ارشد کو دیکھا اور دونوں چلتے بنے۔

زاہد نے دونوں کو جاتے دیکھ کر ایک بیزار اشارہ کیا وہ اس تمام وقت میں دونوں کو دیکھنے میں مشغول رہا تھا۔ اُس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔

جب بھی کوئی افسر مشین کے نزدیک آتا زاہد کو حقارت محسوس ہونے لگتی تھی۔ وہ ایسی نگاہوں سے دیکھتا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اُن کا زاہد کی حکومت میں کیا کام ہے آخر جو ہر تھوڑی دیر بعد وہ آجاتے ہیں! وہ بڑبڑانے کی کوشش کرتا وحشیانہ اشارے کرتا مگر بے سود اشارے! جب لوگ چلے جاتے تو وہ پھر مشین کی طرف متوجہ ہوتا جیسے کہہ رہا ہو:

''دیکھو! آخر میں نے جنوں کی سرحد کے پار اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدم اتار ہی دیے! دیکھو! مجھ میں تہذیب ابھر چکی! دیکھو! خاموشی کی تہذیب، نارسائی کی تہذیب! دیکھو تہذیبوں کا ملاپ دیکھو کہ میں جس میں کھو چکا ہوں آخر انسان بھی تو کھو گیا ہے!''

چند دن اور گزرے کہ اظہر علی ڈاہری کے شاطرانہ دماغ میں ایک

تجربہ کرنے کی سوچ ابھری۔ کچھ وقت تک تو وہ اپنے خیال کے عمیق ریگزاروں میں قیس بنا پھرتا رہا مگر پھر اُس نے میٹنگ منعقد کروالی۔ حسبِ توقع اظہر علی ڈاہری کو تجربے کی اجازت مل گئی۔

اگلی صبح ہی وہ انجینئر صاحبان کی ایک ٹیم کو لے کر مشین سے کھیلنے لگا۔ سب سے پہلے مشین کے درجہ حرارت کو زیادہ کیا گیا پھر کم کر دیا گیا۔ جب سوئچ پر ایک انجینئر کی انگلیاں مشین کے درجہ حرارت سے شرارت کرنے لگیں تو زاہد بھاگا اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر بلند کیے پھر چھوڑ دے۔ منہ ایک طرف کو موڑنے کے بعد اُس نے:

"ہاہے ہی ہوآں ای آ"

کیا اور خاموش ہو گیا۔ اسی اثنا میں مصروف عملے کے لوگوں نے ایک مرتبہ زاہد کو دیکھا اور پھر غیر متوجہ ہو گئے۔

درجہ حرارت کے بعد موٹر کی رفتار کی طرف توجہ مبذول کی گئی مگر اب کی بار زاہد کے چہرے پر کوئی تاثر نہ پیدا ہوا نہ حیرانی نہ حقارت نہ وحشت نہ تہذیب! شاید وہ قبول کر چکا تھا کہ اُس کی حکومت میں رخنہ ڈال دیا گیا ہے!

کچھ دیر موٹر کو تبدیل شدہ رفتار پر چلتے ہوئے گہرے مشاہدے اور علمی و عملی تجزیے سے پرکھا گیا۔ مشین کے ارتعاش اور شور میں ایک کمی سی محسوس ہو رہی تھی اور اظہر علی ڈاہری کے چہرے پر بھی ایک اطمینان کی لکیر عیاں ہو رہی تھی۔

مگر زاہد ایک طرف ہاتھ پیچھے باندھے خاموش کھڑا فرش گھورنے میں محو تھا جیسے ہر طرف سے گھیرے میں آیا ہوا سپہ سالار آخری دفعہ میدان جنگ کو دیکھ کر دل ہی دل میں ہار قبول کر لیتا ہے مگر پھر بھی ایک زوردار نعرے سے اپنے آخری سپاہیوں کو جنگ میں دھکیل دیتا ہے!

زاہد کی آنکھیں بھی یہی بتا رہی تھیں کہ

"چلو خیر! ہم نہ سہی تو تم سہی!"

کچھ دیر رکنے کے بعد ماہرین دفاتر کی جانب چلے گئے مگر زاہد وہیں رہا۔ تبدیلی کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ اُس نے گریزاں ہاتھ سے ایک پائپ کو چھوا اور پھر اِس انداز سے پائپ پر ہاتھ مارا جیسے کوئی باپ پہلی دفعہ اکھاڑے میں اترنے والے اپنے پہلوان بیٹے کو تھپکی دیتا ہے۔

سارا دن مشین چلتی رہی اور زاہد گھورتا رہا۔ اگلا آدھا دن بھی مشین بالکل ٹھیک چلی مگر پھر ایک زوردار دھما کہ ہوا۔

جب لوگ پہنچے تو دیکھا کہ مشین کی موٹر پھٹ چکی تھی لوہے کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے۔ ایک ٹکڑا زاہد کے پیٹ میں گھس چکا تھا۔ زاہد کے منہ سے نکلنے والا خون فرش پر ایسے پھیل رہا تھا جیسے اُس میں خاموش شکوہ ہو بہت ہی خاموش اور گہری شکایت ہو کوئی بہت ہی محروم بددعا ہو!

جیسے ایک خاموش چیخ ہو جو اپنی موت کی وجہ رفتار کو ٹھہرا رہی ہو۔ رفتار شاید زمانے کی ہو یا مشین کی یا پھر اپنی بے بسی کی رفتار ہو جس کی تاب وہ لہو نہ لا سکتا ہو۔ مگر جو بھی تھا زاہد اب خاموشی کے اس مقام پر تھا جہاں سے کلام ناممکن ہے۔

" آاے ای ہاہے ہوآں"

بھی ناممکن ہے!

بقیہ : ڈمی

جسے والدین کا خواب کہنا مناسب ہے۔ والدین نے اپنے خواب کو اپنی مرضی سے سجایا سنوارا۔۔ مجھے کیا کھانا ہے کیا پہننا ہے، کیا پڑھنا ہے، کیا سوچنا ہے، کیا دیکھنا ہے، کس سے ملنا ہے اور کس سے نہیں۔۔۔ سب کچھ تو میرے والدین نے طے کیا تھا، گویا کہ میں ڈمی نہیں روبوٹ ہوں۔ گویا کہ پیدا ہی نہیں ہوئی، اور اب شوہر اور شوہر کے بعد۔۔۔؟ یہ خیال آتے ہی اس کے دماغ نے اکسایا دل نے دماغ کا ساتھ دیا اور یہ بغاوت آمادہ ہوئی، یکا یک اس کی سوچ بدل گئی اور اس نے فیصلہ کیا میں آج ریسٹورینٹ نہیں جاؤں گی۔ صبور کا دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹے۔۔۔ میرا دل صبح سے شام تک نہ جانے کتنی بار ٹوٹتا ہے۔۔۔

عینو نے بیوٹی بکس بند کیا آئینہ کے سامنے سے ہٹی۔۔ سیدھے خوابگاہ میں گئی' تکیہ دور پھینکا۔ اور چادر تان کے سوگئی۔۔۔

تھوڑی دیر بعد صبور ڈھونڈتا صدائیں دیتا خوابگاہ میں آیا عینو کو دراز دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔۔۔ چادر کھینچ کر عینو کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔۔۔

"بدتمیز! یہ کیا ڈراما ہے؟"

اس کے رخسار پہ ایک طمانچہ رسید کر دیا۔۔۔ عینو کا دماغ جھنجھنا اٹھا،

اس نے چیختے ہوئے کہا۔۔ مارو گے؟؟ مجھے نہیں مار سکتے۔۔۔ میں جیتی جاگتی انسان نہیں ہوں، میں 'ڈمی' ہوں۔

بیوقوف! تو مجھے مارتا ہے!؟"

عینو ہذیانی کیفیت میں ہنستی ہوئی بولی

'میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں۔۔۔ میں عندلیب۔۔۔ میں عندلیب گلشن ناآفریدہ۔۔۔

اٹھی، زوروں سے اپنا سر دیوار سے ٹکرا دی۔

صبور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

ڈمی

جبیں نازاں
(دہلی)

8/ستمبر کی شام ہے۔برسات کا موسم رخصت ہونے والا ہے۔ موسم سرما کی آمد ہے۔یوں تو ستمبر خزاں کا موسم کہلاتا ہے۔لیکن مجھے یہ موسم، بہار کے موسم سے زیادہ حسین لگتا ہے۔عینو ڈرائنگ روم میں بیٹھی کھڑکی سے نظر آرہے باہر کے مناظر دیکھ کر سوچ رہی تھی۔تبھی اس کا شوہر ڈرائنگ میں داخل ہوا۔'ہیپی میرج ڈے ٹو یو' کہتے ہوئے اس کے سامنے ایک گفٹ پیکٹ رکھ دی۔

شادی کی پہلی سالگرہ عینو کو بالکل یاد نہیں، عینو ذرا جھجکی اس بھول اور غفلت پہ، پھر کہا

"یوم ثقافت کی قائل نہیں ہوں میں"

شوہر صبور عینو کے بغل میں بیٹھا۔عینو گفٹ پیکٹ کھولنے لگی۔صبور نے موبائل پینٹ کی بائیں جیب سے نکالا اور موبائل اپ ڈیٹ کرنے لگا۔

عینو نے پیکٹ کھولی۔دیکھا بنگلہ دیشی کارٹن بنارسی ساڑھی ہے۔عینو کا موڈ آف ہوگیا۔اسے بازگشت سنائی دینے لگی۔اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔

"ماں! مجھے برگنڈی رنگ بالکل پسند نہیں، آپ کو کون سا رنگ پسند ہے؟"

"جس وقت جو رنگ آنکھوں کو بھا جائے"

ماں شبنم نے اپنی پسند بتا کر کسی ایک رنگ کو محبوب نہ بنانے کی تلقین کر ڈالی۔

"یہ بھی کوئی رنگ ہوا؟ کوئی پسند ہوئی؟۔آپ اپنے پسند کے کپڑے پہنتی ہی کب ہیں؟ ڈیڈ نے جو رنگ لا کر آپ کے سر پہ پٹک دیا۔۔اسے آپ نے آنکھوں سے لگا لیا۔اور تن پر لپیٹ لیا۔

"ماں! آپ عورت نہیں 'ڈمی' ہو اور پاپا شاپ کیپر (جسے آپ مالک و مختار کہتی نہیں تھکتیں)

عینو نے پیکٹ ویسے ہی بند کی صوفے سے اٹھی، موبائل سینٹر میز پہ تقریباً پھینکتے ہوئے رکھا

اس کی نظروں کے سامنے ماضی کا منظر آ کر ٹھہر گیا۔

ماں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی، نہ جانے کون سا دن تھا شام کا وقت تھا، دائیں زانو پہ اپنا بایاں زانو چڑھاتی ہوئی بولی تھی

"ماں! سچ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔جب آپ کو دیکھتی ہوں"

"یار! یہ کوئی زندگی ہے"

ماں کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر جھولتی ہوئی بولی

لفظ 'یار' سن کر ماں ناراض ہوئیں

"عینو یہ کیا بدتمیزی ہے؟ جاہل طبقوں کی زباں استعمال کر رہی ہو ماں کے لیے۔وہ نیچ طبقہ بازاری زبان استعمال کرنا اپنی روشن خیالی سمجھتا ہے۔اور خود کو فیشن پرست کہتا نہیں تھکتا ہماری تہذیب میں لڑکیوں کو یہ زباں زیب نہیں دیتی۔"

عینو ماں کی ناراضی پہ خجل ہونے کی بجائے بھڑک گئی۔

تڑاک کھڑی ہوئی ایک مکا دیوار پہ مارتے ہوئے کہا۔۔

میں آپ کی معاشرے میں فٹ نہیں ہو سکتی ماں؟ جہاں زباں بھی صنفی خانوں میں تقسیم کر دی گئی ہو۔

مجھے 'ڈمی' نہیں بننا۔۔۔وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ڈرائنگ روم میں گئی لیب ٹاپ لے کر بیٹھ گئی۔وڈیو گیم 'پب جی' کھیلنے لگی۔کالج کے دوست وویک، شبھم اور انکیتا کے ساتھ۔۔۔

"عینو!" صبور نے صدا دی عینو یادوں کی دنیا سے باہر نکلی سامنے کلاک پر نظر ڈالی 4 بج چکے ہیں۔۔چائے کا وقت ہوگیا۔آج قلچہ (ایک قسم کا بسکٹ) اور چائے پہ ٹرخانا مناسب نہیں۔ایک تو مجھے شادی کی تاریخ یاد نہیں رہی۔ تیسری لاپروائی یہ دقیانوس برداشت نہیں کر سکتا۔مبارکباد نہ دینا دوسرا قصور تھا۔یار مجھے یہ شوہر بیوی کے چونچلے اچھے نہیں لگتے۔۔۔اسے جو پسند ہے وہ کرے۔۔۔ مجھے اپنی مرضی سے جینے دو یار! خود سے باتیں کرتی ہوئی باورچی خانے میں آئی۔

ہمیں کچھ خاص بنانا پڑے گا۔نہ صرف چائے کے لیے گھر کا روایتی کوئی خاص پکوان، بلکہ ڈنر بھی کچھ خاص۔۔۔لیکن بناؤں کیا؟ وہ کھڑی سوچ رہی تھی۔تبھی صبور نزدیک کھڑا ہوا۔

'کیا کر رہی ہو؟'

'سوچ رہی ہوں کیا بناؤں؟'

چھوڑو! رہنے دو فٹافٹ تیار ہو جاؤ! آج ڈزنی لینڈ گھوم آتے ہیں۔۔ کیب کا آرڈر دے چکا ہوں۔دس منٹ میں آجائے گا۔ڈنر کسی ریسٹورنٹ میں کر لیں گے۔کیا ہر وقت کچن میں گھسی رہتی ہو۔

کھانا بنانے کی الجھن دور ہوئی۔وہ کچن سے بیڈ روم میں آ کر بیٹھی۔ سوچنے لگی کیا پہنوں؟ جب سے شادی ہوئی، میں نے جینس اور ٹاپ پہننا بالکل چھوڑ دیا۔آج وہی پہنوں گی۔وہ اٹھی اور وارڈ روب کی جانب بڑھی۔۔۔تبھی صبور نے کہا۔۔۔عینی آج سنہرے رنگ کا وہ سینٹون اسٹیٹ پاجامہ پہننا اور بلیک لانگ کرتی (جمپر)۔۔۔اچھا لگتا ہے تم پر۔۔۔

عینو نے اپنی پسند ترک کی اور صبور کی پسند کو ترجیح دی، یہ سوچتی ہوئی شوہر اور بیوی کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے۔جہاں بیوی کو اپنی پسند ناپسند تیاگ کر جینا پڑتا ہے۔اس صبور کے بچے کو سنہرے اور بلیک کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ کاش اسے پتہ ہوتا کہ بیویوں کے سنہرے خواب کی تعبیر بلیک ہوا کرتی ہے۔۔۔

''چہارسُو''

اب ان رنگوں سے الجھن ہونے لگی ہے مجھے۔۔۔وہ مجھے خواب کے تعبیر آمیز رنگ میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔شرارتاً۔۔۔

آج آخری بار پہن رہی ہوں یہ رنگ آج کے بعد کہہ کر دیکھے صبور، لنگور۔۔۔

وہ احتجاجاً پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔۔۔

صبور عینو کے ردِعمل کو سمجھنے سے قاصر تھا۔کہ میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو عینو کا رویہ ایک دم بدل گیا۔۔۔تعریف ہی تو کی تھی۔

صبور اس کے پیچھے پیچھے آیا۔۔۔تمھیں جو پسند ہو پہنو۔۔۔

عینو چیخ پڑی۔۔۔

مجھے پاگل کردو گے؟ اپنی پسند اپنا فیصلہ مجھ پر مسلط کیوں کرتے ہو؟؟ میں نے جب فیصلہ کرلیا کہ وہی پہنوگی جو تم نے حکم دیا ہے۔ابھی ایک حکم کی تعمیل نہیں ہوئی کہ دوسرا حکم۔۔۔"

یار ہم عورتوں کی تقدیر ایسی کیوں بنائی؟ عینو گھر کی چھت دیکھتی ہوئی خدا سے شکوہ سنج تھی۔۔۔یار تو نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا؟ اگر پیدا ہی کیا تو ایسے دقیانوسی معاشرے میں کیوں پیدا کیا؟ پہلے والدین کی مرضی مجھ پہ چلتی رہی، پھر معاشرے کے روایت کی حکمرانی۔۔۔اب یہ شوہر بنام آقا و مولا کی۔۔۔

عینو اسٹول (تپائی نما) پہ اس طرح بیٹھی کہ جیسے نہ جانے کتنے کام کرنے کے بعد تھک چکی ہو۔۔۔

صبور نے صدا دی۔

'یار جلدی کرو! تمھیں تیار ہونے میں ویسے بھی اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے۔'

غصہ سے بھری بیٹھی عینو ضبط کا گھونٹ پیتی ہوئی اپنی نمناک آنکھیں اسٹول (مفلر نما دوپٹہ) میں خشک کی، اٹھی وارڈ روب کے تیسرے خانے سے کپڑوں کی تہہ سے صبور کی پسند کے کپڑے کھینچ کر نکالا۔۔اس رنگ سے اب وحشت سی ہونے لگی ہے مجھے، ہر طبقے کی لڑکیاں اور عورتیں بس اس رنگ پہ مرمٹی ہیں۔جسے دیکھو بس گولڈن اور بلیک رنگ میں ملبوس۔۔۔دنیا میں جیسے کوئی اور رنگ ہے ہی نہیں۔سنہرا پاجامہ اور بلیک کرتی (جمپر)، یہ فیشن ڈیزائنر میرے سامنے آجائے تو تکا بوٹی کرڈالوں اس کے۔۔۔ہمارے خواب کی یہ درگت جو پیروں پہ ڈال دیا گیا۔۔اور "سیاہ تعبیر" کو سینے اور گلے سے چپکا دیا گیا۔۔۔کم بخت سادہ لوح فیشن کی دلدادہ عورتیں اس گھناؤنے مذاق کو کہاں سمجھ پارہی ہیں؟ کب تک بھولی بنی رہیں گی؟؟ اور خود پہ ظلم برداشت کرتی رہیں گی ہنس ہنس کر؟؟؟ خواتین فلاح و بہبود کی تنظیم بھی "عقل کی کوری" ہے۔

عینو کپڑا تھامے حمام گئی اور غسل کرنے لگی۔۔۔غسل کرتی ہوئی سوچے جارہی تھی، یار یہ کوئی زندگی ہے؟ اپنی مرضی سے نہ کھاسکتے ہیں نہ پہن سکتے ہیں، نہ سوسکتے ہیں نہ جاگ سکتے ہیں۔۔۔عینو جسم پہ dove صابن لگارہی تھی۔

کم بخت صبور مروجہ اشیا کا شوق رکھتا ہے۔کیا اچھا ہے کیا برا اسے مطلب ہی نہیں۔dove صابن کی بو مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔اس قدر چکنائی کہ اسے ختم کرنے کے لیے دمگ کی بجائے چانگ پانی بہانا ہوتا ہے، پانی کا ضیاع مجھے نہایت گراں گزرتا ہے، صابن تو بس دو ہی ہیں انٹرنیشنل' لکس'(lux) یا پھر..pears لکس صابن کے اشتہار جب بچپن میں ٹیلی ویژن پہ پرینکا چوپڑا، کٹرینہ کیف کو کرتی ہوئی دیکھتی۔۔تو سوچتی لکس صابن ہی انھیں خوبصورت بناتا ہے، کیوں نہ میں بھی' لکس' لگا کر 'مادھوری ڈیکشت، اور مدھو بالا جیسی خوب صورت بن جاؤں؟ اور پھر ڈیڈ سے لکس صابن کی فرمائش کرڈالی تھی، ڈیڈ کھلکھلا کر ہنسے تھے۔بیٹا تو ابھی چھوٹی ہے جب بڑی ہوجائے گی' لکس' ہی لاؤں گا تیرے لیے۔۔لیکن تو 'مدھو پاڈوکون' کیوں نہیں بننا چاہتی؟ مدھو بالا کیوں؟؟

کیوں کہ مدھو بالا "انار کی کلی ہے ڈیڈ!"

ڈیڈ نے مجھے گود اٹھالیا تھا اور پیار کرتے ہوئے ماں کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔۔۔

"دیکھو! میری بیٹا کی پسند۔۔۔"

ماں نے جواب دیا تھا۔

" کیوں کہ یہ آپ کی بیٹی ہے میری نہیں۔۔۔"

اب اپنی نادانی کو یاد کرتی ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔اس کے ہونٹ پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔اس سے پہلے کہ مسکراہٹ ہنسی کی شکل لیتی اسے فوراً خیال آیا کہ اگر کوئی مجھے اس کیفیت میں دیکھ لے پاگل تصور کرے گا، کہ میں اپنے آپ کیوں ہنس رہی ہوں، مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کی۔۔۔ارے دھت میں غسل خانے میں ہوں، یہاں تو مجھے میرے کاندھے کے فرشتے بھی نہیں دیکھ سکتے، چلو ہنس لو تھوڑا۔۔۔عورت کے ہنسنے اور رونے کے لیے سب سے اچھی جگہ یہی ہے۔ عینو نے جیسے ہی یہ بات سوچی اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی، اور سنجیدگی طاری ہوگئی۔

لیکن ڈیڈ مما کے لیے لکس نہیں pears صابن لایا کرتے تھے۔

پیرس کی خوشبو آہ۔۔۔اس کی چکنائی ایسی کہ جسم پہ چپکتی ہی نہیں۔۔۔لیکن جسم میں صابن لگاتے ہوئے نہ جانے کتنی بار ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔لڑکیوں کے خواب کی مانند یہ خصوصیت صرف pears میں موجود ہے۔ کمپنی نے خصوصی طور پہ عورتوں کی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا ہے شاید۔

عینو حمام سے نکلی تو لیہ سر پہ لپیٹتی ہوئی، قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔"بیوٹی بکس" نکالا، اس میں سے باڈی لوشن نکالتے ہوئے خود کو غور سے آئینہ میں دیکھا۔واقعی میں مما جیسی ہوں آنکھیں، ناک، ہونٹ، چہرہ سب کچھ تو مما جیسے ہیں۔۔مما کی زیرا کس کا پی تھی تو ڈیڈ اور دیگر لوگ کہا کرتے ہیں، یعنی کہ مما کا دوسرا جنم۔(ہندو دھرم کے مطابق)۔۔۔میں نہیں، میں تو ڈیڈ کی خواہش (جسے ہوس کی اولاد بھی کہا جاسکتا ہے) مما کی ضرورت کی شکل میں موجود ہوں۔

باقی صفحہ ۷۲ پر ملاحظہ کیجیے

الف

عطاء الرحمان خاکی
(کراچی)

وہ چاہتا تو روشنی میں بھی گفتگو کرسکتا تھا۔لیکن اس کا نام الف تھا اور وہ صرف اندھیرے میں ہی گفتگو کرتا تھا اور جب اس نے پہلی دفعہ گفتگو کی تو اس کی باتیں کسی طوفان کی مانند تھیں ،جن میں دھما کہ خیز اشاروں اور ہر لفظ میں پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کی مانند جنگلی کرختگی اور عجلت بھی شامل تھی۔اس کی آنکھیں،سردیوں کی ہڈیوں میں اتر جانے والی ہوا میں جلتے ہوئے کسی کوئلے کی باقیات یا سگریٹ کی دھیمی آنچ پر سلگتے ہوئے دھوئیں کی مانند تھیں۔جبکہ اس کیمنہ سے اگلتے ہوئے الفاظ تیز رفتار اور درشت تھے اور پٹاخوں کی مانند زوردار آواز سے گونجتے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے اور دھواں چھوڑتے معدوم ہوجاتے۔ہمیں بعد میں علم ہوا کہ اس کے اندر اور اس کے باہر ہر چیز آگ اور گندھک کی لپیٹ میں تھی۔

ہم اس سے محبت کرتے تھے، بلکہ محبت کا لفظ درست نمائندگی نہیں کررہا۔ہم باقاعدہ اس سے عشق کرتے تھے لیکن اس کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔وہ ایک ولی کی مانند تھا،جس کا کوئی مرید نہ تھا یا بغیر معجزے کا ایک مسیح یا شائد ایک شرلاک جس کا واٹسن وقت کی دھند میں بہہ گیا ہو۔اس طرح کا المیہ ناگزیر طور پر پرکشش اور گھناونی دلکشی کا حامل ہوتا ہے۔وہ ہمارے اسکول کی عمارت کے عقب میں دور تک نظر آنے والے گھنے جنگل کی شروعات میں لکڑی کے بنے ایک کھوکے میں رہتا تھا۔اس کی پہلی یادداشت ہمارے ذہن میں ایسے سنکی شخص کی ہے جو الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی کتاب میں گم ہے۔لیکن اس کو بناء کتاب کے دیکھنا کسی پرندے کو پروں کے بغیر دیکھنے جیسا تھا۔بہت بعد میں جا کر اس نے ان تمام کتابوں،خاص طور پر روسی ناولوں سے بھی انکار کیا جنہیں وہ کئی بار پڑھ چکا تھا۔اب وہ ان صفحات اور ان پر لکھے الفاظ سے نفرت کرتا تھا اور شدید غصے کی حالت میں کتابوں اور خاص طور پر ناولوں کے اوراق کو جلد سے جدا کر کے دیوار پر چسپاں کر دیتا تھا۔

وہ شیشے کی بوتل اور خاص طور پر سیاہ گھوڑے والی محلول کی بوتل سے عشق کرتا تھا، جیسے وہ اس کے لیے امرت ہو اور پانی سے اس طرح پرہیز کرتا تھا جیسے وہ سنکھیا ہو۔ہم شام میں اکثر ٹیوشن کے بعد اس کے لکڑی کے کیبن کا چکر لگاتے۔ وہ اپنے لکڑی کے اس کھوکے کو پیار سے فردوسِ بریں کہتا تھا۔لیکن درست معنوں میں وہ محض ایک مختصر سا لکڑی کا کیبن تھا۔جس میں ہم بمشکل سمٹ سکڑ کر بیٹھ جاتے اور اس کے بعد بکھرے ہوئے کیبن میں انڈے سے پھوٹے نومولود بچوں کی مانند گردنیں اٹھا کر اس فکری غذا کا انتظار کرنے لگتے، جسے اس نے چند لمحوں بعد ہماری کہانیاں سننے کے بعد ہمارے معدوں میں اتارنی ہوتی تھی۔ملاقات کی شروعات معمولی گفتگو سے شروع ہوتی، سنائی جانے والی مضحک کہانیوں اور پہیلیوں سے ہوتی ہوئی بالاخر ان لوگوں تک آ پہنچتی جن سے ہم حال ہی میں ملاقات کر چکے تھے، جیسے بس میں برابر والی سیٹ پر ٹیک لگائے اونگھتا ہوا بوڑھا شخص جس کے منہ سے نکلتے خراٹے مزاحیہ معلوم ہوتے یا ماں باپ اور بہن بھائی کے درمیان ہونے والی معصوم لڑائیوں کا حال یا ساحل سمندر کے قریب اڑنے والی پرندوں کی اقسام اور ان کے رنگوں کو گفتگو بنایا جاتا۔

باتیں سنتے وقت الف کا پورا جسم ایک کان میں تبدیل ہوجاتا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں گتھان کی مانند جڑ جاتیں اور چہرہ شدید ارتکاز میں مبتلا خاموشی سے سنتا اور دیکھتا رہتا۔جبکہ ہم سب آپس میں کہانیوں کا تبادلہ جاری رکھتے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

لیکن جب الف کوئی کہانی سناتا تو ہم سب خاموش ہوجاتے۔

وہ عموماً نسل کشی کے جنگی اور سیاسی قصوں سے اس خاموش فضاء کو بھر دیتا۔بنگال قحط،افغان روس جنگ اور غزہ اس کے محبوب موضوعات تھے۔وہ اپنے خطے ہی نہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی جنگ جاری تھی۔اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ جیسے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور اکثر جب اس کی کہانیاں طویل ہوجاتیں اور ہماری دلچسپی کم ہونے لگتی تو وہ کسی ماہر تیر انداز کی مانند سوال کا تیر ہماری جانب اچھال دیتا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ پہلے گرائے جانے والے ایٹم بم کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ ستر میل دور ایک نابینا لڑکی نے اس کو دیکھنے کا دعویٰ کیا؟''

ہم خاموشی سے اس کا چہرے تکنے لگتے اور ہماری دلچسپی واپس لوٹ آتی۔

الف جانتا تھا، وہ جنگ کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔

وہ کہتا کہ ٹینک کے ذریعے داغے جانے والا میزائل ایک ایسا خلا پیدا کرتا ہے۔جس کے اندر ہزاروں بچوں کی چیخیں اور لاکھوں ماؤں کی کوکھ سما سکتی ہے یا یورینیم کی گولیاں چار ارب سالوں تک کس طرح تابکاری رہیں گی، اور یہ کہ ایک ہی گولی اتنی زہریلی ثابت ہوسکتی ہے جس سے پورا گھر زہر آلود ہوسکے اور وہ کہتا تھا کہ جب مائیں اپنے بچوں کو تلاش کرنے نکلتی ہیں تو ان کو وہ نہیں ملتے۔بہنوں کو بھی اپنا بھائی کبھی نہیں ملتا اور وہ اس کی پرانی واستعمال شدہ قمیض کو پہن کر خودکشی کر لیتی ہیں اور ایک نوخیز لڑکی محض اس لیے بیوگی کی چادر اوڑھ لیتی ہے کہ اس کا خاوند کہیں وقت کی دھند میں گم ہو چکا ہوتا ہے۔لیکن اس سے بھی برا یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی عورت بھی حتمی طور پر نہیں بتا سکتی کہ ان کے عزیز زندہ ہیں یا مرگ ان کو نگل گئی۔اگر ان سے یہ سوال کیا جائے تو وہ خاموش ہوجاتی ہیں۔جب الف اپنی بات مکمل کر چکا۔تب ہم نے وہیں بیٹھے ایسی عورتوں کا تصور کیا، جو اپنے عزیزوں کو جنگ آلود سڑکوں پر جھلسی ہوئی کھال کے ساتھ چیختی چلاتی تلاش کر رہی ہیں اور ان کی آنکھیں آگ کو ناقابل برداشت جان کر پانی کی مانند پگھل کر رخساروں پر بہہ

رہی ہیں اور ترقی پذیر دنیا کے کم عمر لڑکے دھوپ میں ننگے اور بے نام پڑے ہیں جن کے چہرے کے قریب پرانے انداز کی رائفلیں بھی ہیں اور سرخ چیونٹیاں ان کے جسموں پر رینگ رہی ہیں، ان کے جسم اور روح کو چیر رہی ہیں اور ان کو عفریتوں میں تبدیل کر رہی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا بچوں کی فوج کو کس طرح تربیت دی جاتی تھی، لیکن اس نے ہمیں تربیت کی جزئیات کبھی نہیں بتائیں۔

لیکن وہ اکثر بے خیالی میں بڑبڑاتا۔

''اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے''

''ہم اب یہ نہیں ہونے دیں گے''

اور ہم خاموشی سے وہ سب سنتے رہتے۔ کیونکہ ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کو کیسے بدلا جاسکتا ہے۔ ہم یہ تو جان چکے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ غلط ہو رہا ہے۔ لیکن اس کو کیسے روکا جاسکتا ہے یا ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ اس بات کا شعور ہمارے اندر نہیں تھا۔ تب اس نے ہمیں بتایا کہ یہ سب ایک زنجیر سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا ادراک ہی دراصل شعور ہے اور یہ کہ زنجیر کا ایک سرا تمہارے پاؤں میں اور دوسرا سرا آسمان والے کے ہاتھ میں ہو تو ٹھیک ہے لیکن اگر زنجیر کا دوسرا سرا تمہارے جیسے ہی کسی انسان کے ہاتھ میں ہے تو تمہیں اس زنجیر کو توڑ دینا چاہیے۔ تب ہم نے اپنے آس پاس موجود لوگوں کا مشاہدہ کیا اور جانا کہ وہ اپنی زنجیروں کے ساتھ خوش ہیں اور اس سے فرق نہیں پڑتا کہ زنجیریں پھر ٹوٹیں یا نہیں۔

آخر کار ایک وقت آیا کہ ہم نے اپنی کہانیاں سنانا چھوڑ دیں اور صرف اس کی کہانیاں سننے لگے۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ وہ کون تھا لیکن ہم میں سے کسی کو بھی یاد نہیں تھا کہ اصل میں وہ کیا تھا؟۔ وہ ایک صحافی تھا یا دانشور، ایک ادیب تھا یا شاعر، ادراک تھا یا محض ایک عام انسان۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ بات دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا۔ ہم بس یہ جانتے تھے کہ دنیا کا ہر انسان دراصل وہ خود تھا۔ جنگ زدہ علاقے میں جو ماں اپنے بچے کو تلاش کر رہی تھی دراصل وہ ماں بھی وہ خود تھا اور وہ بچہ بھی اور نوجوان بچوں کی فوج کا ہر فرد بھی اور وہ اندھی لڑکی بھی جس نے نابینا ہونے کے باوجود اس تباہ کن روشنی کا مشاہدہ کیا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ دھیرے دھیرے اس نے کہانیاں سنانا کم کر دیں۔ ہمارے درمیان خاموشی کا وقفہ طویل سے طویل ہونے لگا۔ یہ ایک اشارہ تھا۔ اشارہ کہ اس کے اندر کی آگ اور توڑ پھوڑ باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر چکی ہے یا پھر شائد اسے احساس ہو گیا ہے کہ وہ اس بحرِ خارزار میں ڈولتا محض ایک ذرہ ہی تو ہے یا شائد وہ مایوس ہو چکا تھا۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن اب جب بھی اسے کسی جنگ کی خبر ملتی تو وہ یوں گُم لاتا تھا جیسے ایک کونج اپنے ساتھی کے مرنے پر کرلاتی ہے۔ ایسے دنوں میں ہم اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔ جیسے کسی کی موت کا پرسہ دینے آئے ہوں۔ ایسے دنوں میں سیاہ گھوڑے والے محلول کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی اور حل نہیں ہے اور ہر طرف بس خاموشی ہوتی اور وہ ایک کونے میں سمٹا ہوا آسمان میں نجانے کیا تلاش کرتا رہتا۔

اس نے ہمیں سکھایا تھا کہ صرف قلم اور روشنائی ہی ایسی الوہی طاقت ہے جو ہزاروں گولیوں کا رخ تبدیل کر کے ان کو گلاب میں تبدیل کر سکتی ہے اور جس کا پھول سرخ کی بجائے سفید ہوتا ہے اور پھر ایک دن جب ہم سب اس کے پاس مغموم بیٹھے تھے وہ کھڑا ہوا۔ عقب میں نظر آتے کتابوں کے ڈھیر کے سامنے جو ایک مینار معلوم ہوتا تھا۔ اس کے درمیان الف کا وجود ایک ایسے زیوس کی مانند معلوم ہوتا تھا جس کے ہاتھ میں عصاء کی بجائے ایک قلم تھا۔ وہ قلم اس نے ہمیں عطا کر دیا جس کے لیے ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ہم نہیں ہوئے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہماری ذمہ داریاں اب بڑھ جائیں گی۔ ہم صحیح معنوں میں نہیں جانتے تھے کہ قلم کو کیسے استعمال کرنا ہے۔ ہم میں سے ایک نے اس کو نیزے کی طرح تھاما اور الف نے درشت لہجے میں اس سے کہا۔

''تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلے قلم پکڑنا سیکھو۔''

اس واقعے کے بعد ہماری ملاقاتوں میں توقف آ گیا۔ اب ہم جاتے تو اس کا گھونسلہ خالی پڑا ہوتا۔ شائد پرندہ گھونسلا چھوڑ چکا تھا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ پھر ہم ایک دن گئے تو وہ ایک ٹرنک میں اپنا سامان رکھ رہا تھا۔ ہمیں وہ پہلے سے زیادہ مغموم اور کمزور دکھائی دیا۔ اس نے ایک نظر ہم لوگوں پر ڈالی اور واپس سامان سمیٹنے لگا۔ اس نے جاتے جاتے اپنی تمام کتابیں ہمیں لاپرواہی سے بخش دیں اور کہنے لگا کہ وہ جلد واپس آئے گا۔ ہم اسے پگڈنڈی پر دھیرے دھیرے معدوم ہوتے دیکھتے رہے اور پھر وہ جب نظر آنا بند ہو گیا تو ہم اپنے گھروں کو آ گئے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ہماری یادداشت کی سطح سے الف مٹنے لگا۔ اس کے بعد گھونسلے کو میونسپلٹی والوں نے ناجائز ٹھہرا کر توڑ دیا اور اس کا سامان کارندوں نے آپس میں بانٹ لیا اور جنگل سمٹتے سمٹتے اتنا رہ گیا کہ مٹھی کو دوربین کی مانند ایک آنکھ پر رکھ کر دیکھو تو وہ مٹھی میں سما جاتا۔ اس کے بعد ان گنت سورج غروب ہو کر واپس طلوع ہوئے۔ کتنی مزید جنگیں ہوئی یہ بھی یاد نہیں۔ قلم بھی کچھ لکھنے کی تلاش میں بوڑھا ہو گیا اور کہانیاں کیونکہ آوارہ ہوتی ہیں اس لیے وہ بھی ایک ایک کر کے ہمیں چھوڑ گئیں۔ لیکن ان کے خاموشی سے چلے جانے کا ادراک ہمیں بہت بعد میں ہوا۔

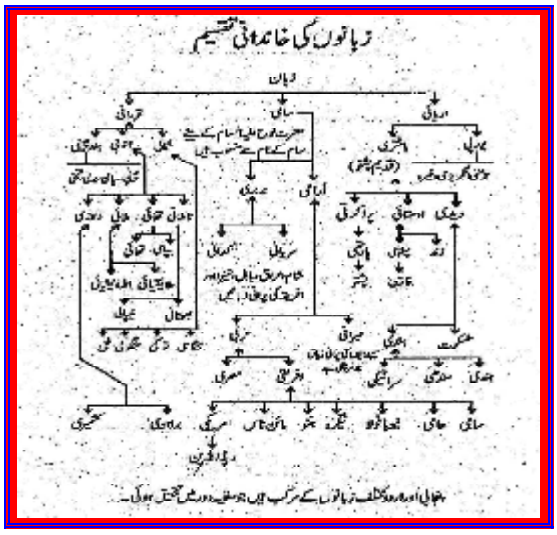

صیّاد کا معاہدہ

رمّانہ تبسم
(پٹنہ)

گھر کی قرقی ضبطی کے بعد اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ ہاتھ میں ہتھکڑی اور کمر میں موٹا رسا کسی بڑے مجرم کی طرح پولیس اسے حفاظتی بندوبست میں لے کر روانہ ہوگئی۔ گرفتاری کے بعد پولیس نے اسے کوارائزنٹ ریمانڈ پر لیا۔ اس سے لمبی پوچھ تاچھ کے لیے دوسری ریاستوں کی پولیس کو بھی بلایا گیا تھا۔ اس کی نام نہاد متنازعہ کی ویڈیو اور شر انگیز آڈیو کی تصدیق بھی کرنی تھی اور یہ بھی پتا لگانا تھا کہ اس کے پیچھے اور کون کون لوگ شامل ہیں۔ اس کے خلاف مذہب کی بنیاد پر انتشار پھیلانے کے الزام عائد کئے گئے تھے۔ اسے چلان کر سنٹرل جیل بھیج دیا اور معاملہ کورٹ میں چلا گیا۔

آج کورٹ میں اس کی پیشی تھی۔ معلوم نہیں کورٹ اسے باعزت بری کرتی ہے یا مجرم قرار دیتی ہے۔ وہاں موجود اس کے عزیز و اقارب بے بس نگاہوں سے اسے کٹہرے میں کھڑا دیکھ رہے تھے اور اس کے سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ کٹہرے میں خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دعاؤں کا ورد تھا اور اپنے رب کائنات سے بے گناہی کی فریاد کر رہا تھا کہ اپنے ملک سے غداری اور اپنے ہی شہر میں فساد پھیلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جس ملک کو آزاد کرانے میں مجاہدین نے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں، جیل گئے، سزائے موت سے ہمکنار ہوئے، اسی سرزمین پر فساد برپا کر وہ اپنے بزرگوں کے خواب کو شرمندہ کیسے کر سکتا تھا۔

وہ ان دنوں ملک بھر میں ہونے والے احتجاج سے فکرمند ضرور تھا۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی تھیں کہ جس ملک کو امن و امان کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ گندے ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھوں درہم برہم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے خوشی تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے 73 سال بعد آج عورتوں میں بھی بیداری آئی ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ اپنے شیر خوار بچے کو سینے سے لگائے سخت سردی اور بارش میں ملک کے آئین کو بچانے کے لیے تاناشاہ حکومت کے خلاف آزادی کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔ اسے یہ بات عجیب لگی تھی کہ اپنے ہی ملک میں شہریت ثابت کرنے کے لیے انھیں دستاویز دکھانا پڑے گا۔

وہ بھی کئی روز سے احتجاج میں شامل ہو رہا تھا اور آج مظاہرہ سے واپس آ کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب بابا صاحب نے اتنا خوبصورت آئین بنایا پھر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کیوں.....؟ کیوں اقلیت کو ہر بار قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے؟ سی اے اے، این آر سی اور این پی آر ایکٹ میں ہندو، سکھ، بودھ، پارسی اور عیسائی کو شہریت دی جائے گی۔ ایک خاص فرقے کو اپنی شہرت ثابت کرنی پڑے گی۔ شہریت ثابت نہیں ہونے پر ڈٹینشن کیمپ.....

نہیں.....ہم دستاویز نہیں دکھائیں گے.....اس نے فیصلہ کیا۔

ہمارے دستاویز دیکھنا ہے تو وہ گلی اور محلے سے ثبوت حاصل کریں جس کی دھول میں چلنا سیکھا، کتنی بار گرے سنبھلیں اور پھر پروان چڑھے۔ آم، املی اور برگد کی گھنیری چھاؤں میں اکثر گرمی کی دوپہر گزری.....سوچتے سوچتے اس پر غنودگی طاری ہونے لگی.....تبھی اچانک باہر سے جئے شری رام کی آواز آنے لگی۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو بلوائیوں کا سیلاب نعرے لگاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ خون کی پیاسی تلواریں جسم سے سرا لگ کر رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں طرف سے مذہبی نعرے فضا میں گونجنے لگے۔ گھروں اور عبادت گاہوں کو نذر آتش کر رہے تھے اور نفرت کی آندھی تیز ہونے لگی۔ چنگاری شعلہ بنتی جا رہی تھی۔ شعلے ایک کے بعد دوسرے گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ فسادی منہ پر رومال باندھے گولیاں داغ رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے لاشوں کی فصل اگ آئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ دل برداشتہ ہو گیا اور فورس کو موقع واردات پر بھیجنے کے لیے کئی اعلا عہدہ دران کے نمبر ڈائل کرنے لگا لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا بلکہ جو پولیس پہلے سے وہاں موجود تھی وہ دنگائیوں کے ساتھ مل کر پتھر اور گولیاں برسا رہی تھیں، آنسو گیس چھوڑ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رحمت اور موہن کے گھروں کو نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ وہ بے بس کھڑکی کی اوٹ سے سب دیکھ رہا تھا۔ کچھ لوگ چھونپڑی سے نکل کر جان بچانے کے لیے اونچی عمارتوں کی طرف بھاگ رہے تھے لیکن دنگائی انھیں پکڑ کر جلتی جھونپڑی میں جھونک دے رہے تھے۔ اس کے گھر کو بھی چنگاریوں نے آہستہ آہستہ پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ پل بھر میں اس کے کمرے کی میز اور کتابوں کے راکھ کی ڈھیر بن چکی تھیں۔ جب ہر طرف سے فسادیوں نے گھیرنا شروع کر دیا تو وہ جان بچانے کے لیے چہرے پر رومال باندھ کر چھت کی طرف بھاگا۔ چار دنوں کے فساد اور لوٹ مار میں کتنے نوجوان، بچے، بوڑھے زخموں کی تاب نہ لا کر دم توڑ چکے تھے۔ عورتوں اور نوعمر لڑکیوں کی عزت تار تار ہو گئی تھی۔ کتنی مانگیں اجڑ گئیں۔ ماں کے شکم میں پلنے والے بچوں کو نیزے کی نوک پر اٹھا لیا گیا اور جھولے میں سو رہے معصوم کی پیاری کلکاری ایک ہی وار میں بند کر دی گئی۔ کتنے لوگوں کے گھر تباہ ہو گئے۔ کتنی دکانیں جلا دی گئیں اور لوٹ لی گئیں۔ ہر موڑ پر جلی اور کچھ ادھ جلی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ لاشیں اِدھر اُدھر نالیں میں گری پڑی تھیں۔ مقدس کتابوں کی جلدیں جلی ہوئی تھیں، مسجد کے اندر پیش امام کا سر جسم سے الگ تھا۔ ہر طرف قیامت کا سماں تھا۔ کچھ لوگ زخمی حال میں پڑے کراہ رہے تھے۔ انھیں ہسپتال پہنچانے کے بجائے پولیس ان کی حب وطنی کا امتحان لے رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور پولیس کے چنگل سے انھیں بچا کر اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے لگا۔ ہسپتال میں ہر طرف چیخیں سنائی دے رہی تھیں.....ڈاکٹر جنہیں بھگوان کا روپ کہا جاتا ہے آرام سے بیٹھ کر موبائل چلا رہے تھے۔ اپنوں کی زندگی بچانے کے لیے لوگ ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہے تھے.....کافی آرزو منت کے بعد ڈاکٹر

نے زخمیوں کا علاج کرنا شروع کیا۔کچھ کی زندگی تو بچ گئی لیکن زندگی بھر کے لیے اپاہج بن کر رہ گئے اور جو فساد میں صحیح سلامت بچ گئے تھے مگر اپنے عزیزوں کے گمشدہ ہونے کے غم میں مسلسل ان کی تلاش میں اِدھراُدھر بھٹک رہے تھے۔

کان میں تیل ڈال کر سو رہی مرکزی حکومت نے چار روز کے بعد اعلان کیا کہ کسی بھی فسایوں کو بخشا نہیں جائے گا اور ان کا آڈیو وائرل کر دیا۔آڈیو وائرل تمام چہرے میں اس کا چہرہ بھی شامل تھا۔جو رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔جب یہ بات اسے معلوم ہوئی تو اس کی آنکھوں میں پریشانیوں کے بادل چھانے لگے اور اپنے روشن مستقبل کو بچانے کے لیے انڈر گراؤنڈ ہو گیا۔اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس اس کے گھر کا چکر کاٹنے لگی اور اس کی تلاش میں شہر کا چپہ چپہ چھان مارا۔جب وہ نہیں ملا تو پولیس نے اس کے گھر کو فرق کر اس کے والدین کو حراست میں لے لیا۔جب یہ سب باتیں اسے معلوم ہوئیں تو وہ بے بس ہو گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

''آرڈر' آرڈر!''جج کی آواز پر وہ چونک پڑا۔

''مسٹر شارب! آپ پر شہر میں امن وامان ختم کرنے کا الزام وارد ہوا ہے اور ساتھ ہی ملک سے غداری کرنے کا الزام بھی عائد ہے،آپ اپنا جرم قبول کرتے ہیں۔''جج کی بات سنکر وہ بے حس وحرکت کھڑا رہا۔

''مسٹر شارب اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔''

جج کی باتیں سن کر اس کے ہونٹوں پر تیکھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کچھ نہیں کہنا ہے۔''

''کچھ نہیں.....''جج نے اسے چونک کر دیکھا۔

''آپ نے پہلے ہی طے کر لیا ہے کہ کیا فیصلہ کرنا ہے،تو میں صفائی کیا پیش کروں؟''

''کیا بکواس ہے۔''جج نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

معاف کیجئے گا جج صاحب!اگر پولیس قانون نافذ کرنے میں ناکام ہوتی ہے تو جمہوریت کی ناکامی ہے،پولیس کے لیے قانون بنانا جمہوریت میں سب سے مقدس کام ہے لیکن انھوں نے اسے مسمار کر دیا۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

عدالت میں جو لوگ بیٹھے ہیں ان میں وہ سیّاد بھی ہے.....جس کے دام میں عدلیہ گرفتار ہے.....فیصلہ تو سیّاد کر چکا۔آپ کو صرف سنانا ہے.....ایسے میں میری صفائی کیا معنی رکھتی ہے؟''

''جج کے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔

''جج صاحب!عدالت میں زیر غور ہزاروں معاملات ایسے ہیں جنہیں سرد خانوں میں ڈال دیا گیا ہے،کئی سالوں سے کیسوں کی تاریخ پر تاریخ پڑ رہی ہے۔۔۔اور کچھ کی تو شاید فائل تک نہیں کھلی تا کہ قصوروار قانون کے شکنجے میں آنے سے تا دیر بچے رہیں۔۔۔لیکن سیاست کی گھناؤنی چال دیکھیں۔۔۔ اقلیت کے کیسوں کی کوئی تاریخ نہیں۔۔۔راتوں رات ڈیل کر انھیں دفعہ 302 کے تحت عدالت مجرم قرار دیتی ہے۔۔۔اور قندیل میں اتنا بھی تیل نہیں چھوڑتی کہ اس کی لو کو تیز کیا جا سکے۔۔۔اور یہ انصاف کی دیوی۔۔۔''اس نے میز پر رکھی مورتی کی طرف حقارت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔جس کی آنکھ میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور ہاتھ میں ترازو جھول رہا تھا۔

''یہ بدرنگ ہو چکی ہے۔اس کا پلڑا ایک طرف ہی جھکا رہتا ہے۔۔۔بند آنکھوں سے بھی اسے زعفرانی رنگ دکھائی دیتا ہے۔۔۔اس دیوی کے سامنے کتنے بے گناہ سولی پر چڑھ گئے لیکن پھر بھی اس کی روح نہیں کانپی۔۔۔ اور نہ اس کی آنکھ پر سے کالی پٹی اتری۔۔۔بلکہ اس بات کا ثبوت دیتی چلی گئی کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔اور گناہ میں ملوث مجرم باعزت بری ہو گئے کیوں کہ انھیں حاکمان وقت کا تحفظ حاصل ہے اور جو بے قصور ہیں انھیں بیڑیاں پہنائی جا رہی ہیں۔۔۔اور آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

جج پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔

''اور جج صاحب.....!''اس کے چہرے پر زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ یہاں سے سبکدوش ہوں گے تو پارلیامنٹ کے ممبر نامزد ہوں گے جیسا کہ سیّاد کا آپ سے معاہدہ ہے۔''

''کیا بکواس ہے،عدالت کی بے عزتی کر رہا ہے۔''مجمع سے کوئی چلّایا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔سیّاد کا ایک گروہ زور زور سے چلّا رہا تھا۔

''اسے باہر نکالو۔ہم اسے ٹھنڈا کر دینگے۔''

جج کی زبان گنگ تھی۔اس کے چہرے پر خوف اور شرمندگی کے ملے جلے آثار تھے۔

جج نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے قلم پکڑا اور سر جھکا کر فائل پر کچھ لکھنے لگا۔

وہ کٹہرے میں سینہ تان کر کھڑا تھا۔اس کا چہرہ پرسکون تھا۔وہ جانتا تھا جج کیا لکھ رہا ہے۔

ناشتہ

قدیم فرانسیسی معاشرہ میں بیویاں شوہروں کو صبح ناشتہ میں ایک خاص قسم کا زہر دیتی تھی جس کا اثر ایک خاص مدت کے بعد نظر آنا شروع ہوتا اور جب مرد شام مقررہ وقت میں واپس گھر آ جاتا تو بیوی زہر کا تریاق شوہر کو دے دیتی جس سے منٹوں میں زہر کا اثر زائل ہو جاتا تھا۔عورتوں کی اس ترکیب سے مردوں میں ایک عقیدہ راسخ ہو گیا تھا کہ گھر سے زیادہ دیر باہر رہنے سے شیطانی طاقتیں انسان کو گھیر لیتی ہیں۔

''بدن کی آبیاری''

احمد سوز
(ممبئی)

میں اپنی کاشتکاری کررہاہوں
بدن کی آبیاری کر رہا ہوں
ذرا بھر جانے دو پیمانۂ دل
ابھی تک انکساری کر رہا ہوں
نہیں معلوم مجھکو کیا ہواہے
جو بیٹھے آہ و زاری کر رہا ہوں
زمانہ آج میزائیل کا ہے
مگر میں سنگباری کر رہا ہوں
ابھی میں زندگی میں منہمک ہوں
ابھی میں خود سے یاری کررہا ہوں
کبھی یونہی کہیں آوارہ گردی
جنوں کی پاسداری کر رہا ہوں
میں جادوگرہوں شایدسوزصاحب
غزل میں سحر کاری کر رہا ہوں

○

گلزیب زیبا
(لندن)

ہم نے سوچا بھی نہ تھابدلیں ٹھکانہ ہرگز
اپنے پیاروں کونہ تھا چھوڑ کے جانا ہرگز
ایک مدت سے نہ پھرحال پلٹ کرپوچھا
جوہمیں کہہ کے گئے تھے نہ بھلانا ہرگز
ان سے ملنا تو یہ پیغام بھی دینا قاصد
بن پڑھے ہی نہ مرے خط کوجلانا ہرگز!
انکی محفل میں اگر جاؤ تو انکی سننا
ہم پہ کیا بیت رہی ہے، نہ بتانا ہرگز
یہ بھی کیابات کہ جانے کے لئے آتے ہو
اب مرے خواب میں آ‎ؤتونہ جانا ہرگز
تیری آہٹ پہ مجھےان کا گماں ہوتا ہے
آئے صیاد کھ!نہ یوں پھرسےستاناہرگز!
تم اگرپاس نہ ہو،آئینہ دیکھوں کیونکر؟
زیب دیتا ہی نہیں سجنا سجانا ہرگز!

○

رئیس صدیقی
(دہلی)

فلسفہ یہ عشق کا سُنتے ہیں اچھا کچھ نہیں
ہر قدم دشواریاں ہیں اور دیکھا کچھ نہیں
میں نے چاہا داستانِ غم غزل میں ہو رقم
آبروئے عشق رکھنی تھی ،تو لکھا کچھ نہیں
ہر قدم ،اس کی محبت میں رہے گا گامزن
زندگی کس موڑ پہ جائے گی،سوچا کچھ نہیں
ہم محبت کے سپاہی تھے، فقط اس واسطے
نفرتوں کے درمیاں بھی،ہم نے دیکھا کچھ نہیں
یہ حقیقت ہے، حقیقت پر کروں کیا تبصرہ
'موج ہے دریا میں،اور بیرونِ دریا کچھ نہیں'
یہ زمیں اقبال کی اور شعر کہنا ہے رئیس
اِک بڑے فنکار کے آگے، یہ چھوٹا کچھ نہیں

○

تبسم انوار

(کینیڈا)

تمہارے ستم سے مرے جا رہے ہیں
مقدر پہ تہمت دھرے جا رہے ہیں

یہ اعجاز ہے ان کی نظرِ کرم کا
خزاں کے بھی موسم ہرے جا رہے ہیں

مناؤں میں کیا جشنِ صحت مسیحا
فقط تن کے گھاؤ بھرے جا رہے ہیں

تری بزم کا شوق بھی خوف بھی ہے
کہ جا تو رہے ہیں۔۔۔ڈرے جا رہے ہیں

قیامت سے یہ کوئی کم تو نہیں ہے
میں نزدیک اور وہ پرے جا رہے ہیں

ملمع چڑھایا تھا جن پر تبسم
کسوٹی پہ وہ بھی کھرے جا رہے ہیں

○

مرید باقر انصاری

(بہاولپور)

ہوس کی آگ میں جلتے بشر پہ لعنت ہو
نہیں ہے جس میں حیا اُس نظر پہ لعنت ہو

ترے پڑوس میں کتنے غریب بھوکے مرے
امیرِ شہر ترے مال و زر پہ لعنت ہو

ترس رہے ہیں کئی لوگ جھونپڑی کیلیے
ترے محل ترے شیشے کے گھر پہ لعنت ہو

کہ جس کے در سے سوالی ہی خالی لوٹ آئے
فقط وہ نام کے حاتم کے در پہ لعنت ہو

جہاں غریب کی سُنتا نہ ہو صدا کوئی
منافقوں کے وہ سارے نگر پہ لعنت ہو

جہاں غلامی چلی آ رہی ہو نسلوں سے
تو ایسی زیست پہ ایسی گُزر پہ لعنت ہو

کسی کی بیٹی کی عزت کو جو کچل ڈالے
ہر ایسے شخص کی گندی نظر پہ لعنت ہو

وہ جن کے واسطے انصاف بیچ دے منصف
سبھی حرام کے لعل و گہر پہ لعنت ہو

کہ جس کا کام ہو تکلیف دینا لوگوں کو
فقط وہ نام کے مُسلم بشر پہ لعنت ہو

جو دھوکا دے کے کماتا ہو رزق اے باقر
تو ایسے شخص پہ اُس کے ہُنر پہ لعنت ہو

○

فرحانہ عنبر

(لاہور)

ہمارے درمیاں جو فاصلہ ہے
اذیت کا عجب سا مرحلہ ہے

مجھے اہلِ سخن سے نسبتیں ہیں
مرا کاغذ قلم سے سلسلہ ہے

کوئی منزل نہ کوئی راہ اس میں
محبت دائرہ در دائرہ ہے

اٹھائے پھر رہے ہیں بوجھ تیرا
اے کشتِ جاں ہمارا حوصلہ ہے

مرے چہرے پہ سب پڑھنے لگے ہیں
محبت کا جو دل کو عارضہ ہے

کوئی شکوہ نہیں اہلِ جہاں سے
ہماری ذات ہی اک مسئلہ ہے

وہ میرے سامنے بیٹھے ہیں عنبر
یہ کوئی معجزہ یا حادثہ ہے

○

سبیلہ انعام صدیقی

(کراچی)

دل ہے تُمھارے ہجر مِیں ناشاد اِس طَرح　　دیکھا گیا نہ کوئی بھی برباد اِس طَرح
گذری ہوں راہِ ہجر سے یوں مُسکرا کے مَیں　　آشفتہ کوئی دیکھا ہے دلشاد اِس طَرح؟
دنیا کے سامنے بَنی تصویر , دے کے کچھ　　کرتا ہے آج آدمی امداد اِس طَرح
نظروں کی رَہ سے دل مِیں جو دلبر اُتر گیا　　پڑتی ہے ایک خواب کی بنیاد اِس طَرح
بِن پیار تِشنگی ہُوئی دل کی زمین پر　　بِن آب ریگ زار ہُو آباد اِس طَرح
مَیں خود کو دیکھ لیتی ہوں شعروں مِیں نظم مِیں　　کہتی ہوں اپنے دل کی مَیں رُوداد اِس طَرح
خود پر کبھیِ تَو نقدو نَظر ہونی چاہیئے　　کرتا ہے کیا کبھی کوئی نقّاد اِس طَرح؟
خودسونپ کرس بیلہ اُسے اپنے سارے خواب　　رکھتے ہیں دل کو فکر سے آزاد اِس طَرح

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیار پور)

جدھر بھی دیکھیے ظلمت ہے کیا کیا جائے　　یہ روشنی سے عداوت ہے کیا کیا جائے
جو سارے شہر کو بدنام کرنے والا ہے　　اسی کی شہر میں عزت ہے کیا کیا جائے
کوئی فسانہ جو ہوتا تو کوئی سن لیتا　　مرے لبوں پہ حقیقت ہے کیا کیا جائے
یہ لوگ اتنے سیاسی ہوئے ہیں کیا کہیے　　یہاں ادب میں سیاست ہے کیا کیا جائے
خدا کے نام پر کہرام ہے جدھر دیکھو　　برائے نام عبادت ہے کیا کیا جائے
ہمارے شہر میں جس کام پر ہے پابندی　　سبھی کو اسکی اجازت ہے کیا کیا جائے

○

شہاب الدین شہاب

(کراچی)

یہ کیا ہوا ہے کہ سب شعلگی بجھی ہوئی ہے　　بہت دنوں سے طبیعت مری بجھی ہوئی ہے
وہ رنگ ہو، کوئی خوشبو ہو یا کوئی چہرہ　　ہے دل اداس تو ہر دلکشی بجھی ہوئی ہے
اب اس مکان میں رہتا نہیں کوئی شاید　　تبھی تو گھر کی ہر اک روشنی بجھی ہوئی ہے
یہ سرد مہر طبیعت، بجھا بجھا لہجہ　　ہر اک خمار، ہر اک سرخوشی بجھی ہوئی ہے
چھپا رہا ہے وہ اپنے ہی فیصلوں کے دکھ　　میں جانتا ہوں کہ اسکی ہنسی بجھی ہوئی ہے
جلائے رکھتی تھی پہلو جو ایک آتشِ ہجر　　عجیب وقت ہے وہ آگ بھی بجھی ہوئی ہے
بجھے ہوئے ہیں ستارے، اور آسمان پہ چاند　　چمک رہا ہے مگر چاندنی بجھی ہوئی ہے
بجھا ہوا ہے بہت دن سے کوئی شورِ فغاں　　بہت دنوں سے کوئی خامشی بجھی ہوئی ہے

○

نوید ظفر کیانی

(اسلام آباد)

بستیوں پہ اب تو غُرّانے لگا دریائے سرخ
ملگجے پانی کے بھی ہونے لگے پیرائے سرخ

کتنے قریوں میں گئے بادل نمو کی رُت لئے
جب مری تقدیر میں آئے تو بن کر آئے سرخ

ہجر کی پت جھڑ بھی ملنی ہے اُسی سے کل کلاں
آج بکّے میں کسی نے پھول تو بھجوائے سرخ

میرے لہجے میں فشارِ خون بھی اُس نے بھرا
میری باتیں سن کے جس کا چہرہ ہوتا جائے سرخ

ہم تہی دستوں کے ساغر بھی کبھی گلگوں کرے
رقص کرتی پھر رہی ہے ہر طرف مینائے سرخ

ٹہنیوں کے ہاتھ میں کیوں زرد پتوں کے علم
سبز موسم پر لگے تھے کس قدر سرمائے سرخ

روشنی کی منتظر نظروں کو کب معلوم تھا
ایسے چکاچوند ہو گا دیدۂ بینائے سرخ

وہ کہ جس کے نام کا مالک بھی کوئی اور ہے
اُس کے دامن پر نچھاور میرے سب گلہائے سرخ

ڈُوبتا ہے کوئی سورج یا نکلتا ہے ظفرؔ
اِک معمے نے افق کو پیرہن پہنائے سرخ

○

شاہ حسین نہری

(لندن)

وہ جھوٹ بول کے بھی شان سے نکھر جائے
تو آج یوں ہو کہ سچ کو بھی سمجھ آئے

ہیں نورزادے جواَب، یہ بھی گویا کہتے ہیں
خدا خود آکے لڑے اور ہمیں بچا جائے

چلا تو چھاؤں ستاروں کی چاندنی بھی تھی
یہ بات تب کی تھی، کون اب بھلا مجھے پائے

تنا ہے سر پہ مرے آسماں، کڑی ہے دھوپ
بگولے ریت کے طوفان ہیں میرے ہمسائے

جلا رکھا مجھے احساسِ زندہ نے اے شاہؔ!
نہ اور کوئی بھی بچتا جو ہوتا میری جائے

○

شہزاد بیگ

(فیصل آباد)

نہ مجھ کو اس کا نہ اپنا پتہ بتایا گیا
خبر نہیں ہے مجھے کس لیے بنایا گیا

میں خاک چھانتا رہتا ہوں اس زمانے کی
مرا خمیر اسی سے تو ہے اٹھایا گیا

کبھی کبھی مجھے یہ بھی خبر نہیں ہوتی
وہ کون لوگ ہیں جن میں مجھے بلایا گیا

یہاں پہ حفظ مراتب کو کون پوچھتا ہے
جو جس جگہ کا نہیں تھا وہاں بٹھایا گیا

یہ کوئی اور ہے جس سے ملا رہے ہو مجھے
وہ کوئی اور ہی تھا جو مجھے دکھایا گیا

میں آخری نہیں شہزاد اس زمانے میں
بہت سے اور ہیں جن کو یہاں بھلایا گیا

○

فرخندہ شمیم

(راولپنڈی)

ازل سے نکتہ وروں کو ہے جستجوئے ابد — ذرا سا خاک میں جھانکیں، یہی ہے بوئے ابد
یہ کاروان تماشا، بچھاتے پھرتے جمال — وہ قافلہ ہے حقیقی، چلا جو سوئے ابد
ازل سے ایسی بلا خیزیاں زمین پہ ہیں — کہاں ہے یاد کسی کو، کہاں کا جوئے ابد
گلی میں اب کہ ازل کو کہیں پناہ نہیں — بچا ہے ایک ہی کوچہ، وہ ایک کوئے ابد
زمین اپنے گناہوں پہ اس طرح ہے ڈٹی — کہ لامکاں سے مکاں تک اٹا ہے روئے ابد

○

احمد نثار

(اسلام آباد)

ہوا کے روبرو جوہر ہمارے — کھڑے ہیں عزم ہی ڈٹ کر ہمارے
محبت کی چڑھی ہے آب ان پر — ملائم ہیں بہت خنجر ہمارے
ہمیں اڑنے کو کہتا ہے شکاری — کتر کر آج سارے پر ہمارے
اگر پائے گئے جو ہم بھی وحشی — لہو میں ڈوبیں گے منظر ہمارے
چلے آنا کبھی فرصت ملے تو — بسا اک شہر ہے اندر ہمارے
بہتر ہوگئے جب رن میں حاوی — ہیں تب سے گھات میں لشکر، ہمارے
عدو کے ہاتھ کے پتھر تھے تشنہ — لہو پینے کو آئے سر ہمارے
جہاں پر جاگتی ہے سوئی قسمت — مقدر میں وہ لکھ دے در ہمارے
اترنے کے لیے ہیں اب بھی کوشاں — نثار احمد یہ بارِ سر ہمارے

○

مادھو کوشک

(چندی گڑھ)

آج کے ماحول میں خنجر برے لگتے ہیں — ہاتھ لوگوں کے لہو سے تر برے لگتے نہیں
درد میں ڈوبے ہوئے منظر برے لگتے نہیں — اب کسی کو بھی برے رہبر برے لگتے نہیں
آستیں کے سانپ کی اوقات کیا ہے آج کل — آستینوں میں چھپے اجگر برے لگتے نہیں
بات کا مطلب صحیح ہو تو ادھوری بات کے — کسمساتے ٹوٹتے اکثر برے لگتے نہیں
حادثوں کی دھوپ نے برداشت کر پائے تو کیا — دیکھنے میں کانچ کے بھی گھر برے لگتے نہیں
پھر ہمیں اپنی نگاہوں پر بھروسہ کیوں نہیں — ان پرندوں کو بھی اپنے پر برے لگتے نہیں

○

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار
(میاں)

قسط ۹

''بھائی جان، اے بھائی جان، آج اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا۔۔۔؟''
(دلدارشاہ نے بڑے بھائی کو نیند سے جگاتے ہوئے جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا)
''کے بھگدڑ مچرو، کے مسیپت آ ڑو۔۔۔؟'' (جبارشاہ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے، دوبارہ منہ پر کھیس تان لیا)
''ابّا میاں نے ایک نہیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ شرفا کو بات چیت کے دوران اردوئے معلّٰی بولنی چاہیے نہ کہ میواتی مگر آپ کو سمجھ نہیں آتا۔۔۔!''
''کسمت پھوٹرو، کرم پھوٹرو۔۔۔!''
''اب کیا ہوا۔۔۔ پورے علاقے میں۔۔۔ واہ، واہ۔۔۔ ہو رہی ہے۔۔۔اور کیا چاہتے ہو۔۔۔؟''
''نمکھ حرام، بے کار ماڑنس۔۔۔!''
''کون۔۔۔؟''
''تیرا باپ۔۔۔اور کون۔۔۔؟''
''آپ کا میرا باپ۔۔۔الگ ہے کیا۔۔۔؟''
''ابے میرے تاؤ۔۔۔عقل سے کام لے۔۔۔میواتی بولوں گا تو تجھے اردوئے معلّٰی ستانے لگے گی''
''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔۔۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔۔۔!''
''ہماری زبان میں کہتے ہیں۔۔۔ کسمت کو کھیل، سائیں کا سو کھیل۔۔۔!''
''مطلب۔۔۔؟''
''''مطلب یہ کہ۔۔۔ پیسہ، پیسہ۔۔۔ٹکہ، ٹکہ۔۔۔ جوڑ کے جمع جتھا بنایا تھا۔۔۔اُس۔۔۔نے۔۔۔ایک ہی ہلّے میں ایسے لٹا دیا۔۔۔جیسے باپ کا مال ہو۔۔۔اس سے بڑا دھوکہ۔۔۔اس سے بڑی چار سو بیسی۔۔۔اور۔۔۔کیا ہوگی۔۔۔!''
''اتنی سی بات پہ لال پیلے ہو رہے ہو بھائی۔۔۔؟''
''تیرے لیے ہوگی اتنی سی بات۔۔۔ ہماری تو دنیا لُٹ گئی۔۔۔عمر بھر کی کمائی۔۔۔ایک ہی رات میں لٹا کر۔۔۔راجہ بھوج سے۔۔۔گنگو تیلی بنا کے رکھ دیا۔۔۔!''
''دل چھوٹا کیوں کرتے ہو بھائی۔۔۔لکشمی خود چل کر آئی ہے۔۔۔ اور۔۔۔بے حساب آئی ہے۔۔۔!''
''سچ کہہ رہا ہے تُو۔۔۔؟''
''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔۔۔ پڑھے لکھے کو فارسی کیا۔۔۔خود چل کر دیکھ لو۔۔۔!'' (زوارشاہ چھوٹے بھائی دلدارشاہ کے پیچھے، سدھائے ہوئے جانور کی مانند چل پڑا)
پہلا جھٹکا، زوارشاہ کو مہمان خانے کے سامنے لوگوں کا جمِ غفیر دیکھ کر لگا۔۔۔دوسرا جھٹکا تب لگا۔۔۔جب مجمع میں موجود ہر مرد و زن آگے بڑھ کر زوار شاہ کے ہاتھ چومنے میں پہل کرنے کا خواہش مند تھا۔ابھی زوارشاہ سکتے کی حالت میں تازہ صورتِ حال سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ مہمان خانہ سے نمودار ہوتے جبارشاہ نے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیا:
''بڑے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے بے گانہ ہو جائے۔۔۔!''
''ارے غصہ بعد میں نکالنا۔۔۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ۔۔۔(مجمع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) یہ کیا سوانگ ہے۔۔۔؟''
''سوانگ نہیں۔۔۔حقیقت ہے۔۔۔حقیقت۔۔۔!''
''میرا مطلب ہے۔۔۔یہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔۔۔؟''
''دم کرانے۔۔۔دیدار کرنے۔۔۔تعویذ لینے۔۔۔ہاتھ چومنے۔۔۔!''
''مگر۔۔۔کس سے۔۔۔؟''
''بڑے شاہ صاحب۔۔۔ مدینے والے۔۔۔ اور ۔۔۔ کس سے۔۔۔؟''
''مطلب۔۔۔اب۔۔۔مہا۔۔۔!''
''کیا غضب کرتے ہو بھائی (زوارشاہ کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جبارشاہ نے بھائی کو جملہ مکمل کرنے سے روکا)

☆

''آپ لوگوں کی باتیں ختم ہوں گی کہ نہیں۔۔۔مہمان ناشتہ پر انتظار کر رہے ہیں۔۔۔!''
''انتظار۔۔۔ہمارا۔۔۔؟''
''جی آپ کا (زوارشاہ نے دونوں بھائیوں کی حیرت دور کرتے ہوئے، جملے کو چبانے کی کوشش کی تو دونوں بلکہ تینوں بھائی حلیہ درست کرتے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوئے)
مہمان خانہ کی فضا میواتی ناشتے کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی۔دیسی گھی کے پراٹھے، بتھوا کے پراٹھے، باجرے کی روٹی، ہرے چنے کا ساگ، سرسوں کا ساگ، مولی کی بھاجی، دہی، ربڑی اور مہری (جو اور چھاج کا دلیہ) بطور خاص مہمانوں کی تواضع کے لیے تیار کیے گئے تھے۔

ناشتہ کی خوشبو اور گرم، گرم بھاپیں، قریب قریب سبھی مہمانوں کی اشتہا کو مہمیز دے رہے تھے۔ مہمانوں کے چہروں کی رنگت اور بدلتے پہلو اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ مہمان۔۔۔ بڑے شاہ صاحب مدینے والے کی جانب سے اجازت کے منتظر ہیں۔۔۔ کوئی نہیں جانتا، تاخیر کا سبب کیا ہے۔۔۔ بڑے شاہ صاحب مدینے والے جبّار شاہ کی جانب ہاتھ کے اشارے سے کچھ دریافت کرتے ہیں۔۔۔ قبل اس کے جبار شاہ جواب کے لیے منہ کھولے۔۔۔ تین ملازمین مہمان خانے میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں پانی کا لوٹا، دوسرے کے ہاتھ میں سلپچی جبکہ تیسرے ملازم کے ہاتھ میں بیسن کی تریل نمایاں نظر آ رہی تھی۔ پہلے بیسن کے تھال والے ملازم نے مولانا الطاف حسین حالی کے روبرو تھال بڑھایا تو مولانا نے آداب عرض کرتے ہوئے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں بیسن میں مَس کی جس کے فوری بعد سلپچی والے ملازم نے سلپچی آگے کی اور لوٹے والے ملازم نے پانی انڈیلنا شروع کیا۔ باری باری تمام مہمانوں کے ہاتھ دھلوانے کے بعد جونہی تینوں ملازمین منظر سے غائب ہوئے شاہ صاحب مدینے والوے نے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے۔۔۔ ناشتہ تناول فرمانے کی درخواست کی۔۔۔!

''آہا۔۔۔ہا۔۔۔ہا۔۔۔ لطف آ گیا۔۔۔ لسّی ۔۔۔ تو ۔۔۔ بارہا۔۔۔ پینے کا اتفاق ہوا۔۔۔ مگر۔۔۔ ایسا منفرد ذائقہ۔۔۔ سوندھا پن۔۔۔ اور خوشبو۔۔۔ عمر بھر نہیں چکھی۔۔۔'' (سفیر بلگرامی کی داد پر حالی صاحب نے گرہ لگائی)

''اشتیاق بڑھانے سے بہتر ہے۔۔۔ قریب رکھا سکورا۔۔۔ ادھر بڑھایئے۔۔۔!''

''دو گھونٹ ہمیں بھی چکھایئے۔۔۔ ہم بھی تو دیکھیں۔۔۔ میوات کی لسّی میں ایسی کیا بات ہے۔۔۔ جو۔۔۔ دلّی۔۔۔ اور۔۔۔ لکھنؤ کی لسّی میں نہیں۔۔۔''

''دو گھونٹ کیوں۔۔۔ کم از کم۔۔۔ دو گلاس پیجیئے گا۔۔۔ تب جا کے۔۔۔ طلب مٹے گی۔۔۔!''

(سفیر بلگرامی نے حالی صاحب کی جانب۔۔۔ ادب سے سکورا بڑھایا تو حالی صاحب گویا ہوئے)

''ارے۔۔۔ چی۔۔۔ چی۔۔۔ یہ کیا غضب کیا۔۔۔ میری چھاتی میں۔۔۔ پہلے ہی سفرا بہت ہے۔۔۔ اور۔۔۔ وہ۔۔۔ کم بخت۔۔۔ سنگدل بھی کم نہیں۔۔۔ مجال ہے۔۔۔ جو ذرا سی۔۔۔ رُو، رعایت کر دے۔۔۔!''

''کون۔۔۔؟'' (شاہ صاحب مدینے والے نے حالی صاحب کے مبہم بیان پر دریافت کیا)

''اماں وہی۔۔۔ اکمل الحکما قاضی فصیح الدین شمسی، صابری، پانی پتی فاضل طب دہلی۔۔۔ اور کون۔۔۔؟''

''قاضی صاحب تو بڑے نامی، گرامی حکیم ہیں۔۔۔ اللہ نے شفا بھی بڑی رکھی ہے اُن کے ہاتھ میں۔۔۔!''

''اوروں کے لیے ہوگا حکیم۔۔۔ ہمارے لیے تو۔۔۔ جلّاد سے کسی طور کم نہیں۔۔۔!''

''آپ تو۔۔۔ ہم نوالہ، ہم پیالہ دوست۔۔۔ بلکہ یارِ غار ہیں (انور دہلوی نے گرہ لگائی تو حالی صاحب چنک کر بولے)

''کاہے کا نوالہ۔۔۔ اور کاہے کا پیالہ۔۔۔ صبح اُٹھو۔۔۔ تو۔۔۔ خاکسیر پھانک لو۔۔۔ ناشتے کے بعد۔۔۔ لعوقسپستاں چاٹ لو۔۔۔ دوپہر کو جوارش کمیونی زہر مار کر لو۔۔۔ اور۔۔۔ رات کو معجون ملیّن گنگ کے سو جاؤ۔۔۔ انسان۔۔۔ نہ ہوا۔۔۔ دوائی گٹکنے کی مشین ہو گئی۔۔۔ خیر چھوڑیئے (شاہ صاحب مدینے والے کو مخاطب کرتے ہوئے) آپ ہمیں اس لسّی کی بابت کچھ بتلایئے۔۔۔ کن اجزائے ترکیبی سے بنائی جاتی ہے یہ لسّی۔۔۔؟''

(شاہ صاحب مدینے والے نے خود جواب دینے کے بجائے اپنے مقابل خشخشی داڑھی والے صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے)

''بتلایئے حضور۔۔۔!''

''جی، جی۔۔۔!'' (شاید وہ صاحب اس امر کے لیے تیار نہ تھے)

''حضور ۔۔۔ یہ لسّی نہیں۔۔۔ جَو۔۔۔ اور۔۔۔ چھاچھ کا دلیہ ہے۔۔۔ یہ میوات میں ہمارے بزرگوں کے زمانے کی سوغات ہے۔۔۔ جَو کو بالو ریت میں بھون کر۔۔۔ ہاون دستے میں کوٹتے ہیں اُس کے بعد تازہ چھاچھ میں ملا کر رِڑکتے ہیں۔۔۔ جب لسّی کا برتن جھاگ وجھاگ ہو جائے تب مٹّی کے سکورے میں ڈال کر۔۔۔ خود بھی پیتے۔۔۔ اور۔۔۔ مہمان کو بھی پلاتے ہیں۔۔۔!''

''بہت خوب۔۔۔ کیا امتزاج ہے۔۔۔ جَو اور چھاچھ کا۔۔۔ (مظہر دہلوی نے جَو اور چھاچھ کا قصیدہ پڑھا تو نساخ صاحب خاموش نہ رہ سکے اور شاہ صاحب مدینے والے کے مقابل بیٹھے صاحب کو مخاطب کر کے بولے)

''حضور ۔۔۔! ایک لسّی ۔۔۔ معاف کیجیے گا۔۔۔ دلیہ پر کیا موقوف۔۔۔ گذشتہ رات سے اب تک۔۔۔ جو۔۔۔ جو۔۔۔ ذائقہ چکھا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ تناول کیا۔۔۔ حافظے پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔۔۔ بڑے مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا مثلاً اجمیر کا مشاعرہ۔۔۔ سنبھل کا مشاعرہ۔۔۔ جے پور کا مشاعرہ۔۔۔ بھوپال کا مشاعرہ۔۔۔ حیدر آباد کا مشاعرہ۔۔۔ بیکانیر کا مشاعرہ۔۔۔ غرض ہر مشاعرے میں۔۔۔ انواع و اقسام کے۔۔۔ ایک سے بڑھ کر۔۔۔ ایک کھانے ۔۔۔ ملے۔۔۔ مگر ۔۔۔ جو انفرادیت۔۔۔ سادگی۔۔۔ اور۔۔۔ انسانی نفسیات سے ہم آہنگی۔۔۔ میوات کے کھانوں میں پائی۔۔۔ وہ۔۔۔ پہلے دیکھا۔۔۔ سنا۔۔۔ نہ۔۔۔ چکھا۔۔۔!''

''اگر آپ لوگ کچھ وقت میوات کے لیے وقف کر سکیں۔۔۔ تو۔۔۔ ہمارے لیے۔۔۔ اعزاز۔۔۔ اور۔۔۔ فخر کی بات ہو گی۔۔۔ ہندوستان کی قدیم تہذیبوں میں۔۔۔ اگر۔۔۔ مبالغہ نہ سمجھا جائے۔۔۔ تو۔۔۔ میوات۔۔۔ اوّل

نمبر پر آتا ہے۔۔۔!''

''یہ بات آپ کس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔۔۔(ہریش چندر سانے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے شاہ صاحب کے مقابل بیٹھے بزرگ کو مخاطب کیا)

''اجی حضور۔۔۔! آپ بنیاد کی بات کرتے ہیں۔۔۔ میں تو۔۔۔ دعویٰ کر رہا ہوں۔۔۔دعویٰ۔۔۔!''

''دعویٰ تو ٹھوس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔۔۔''(حالی صاحب، نپے تلے انداز میں گویا ہوئے)

''ہندوستان میں پانچ ہزار سے زیادہ رجواڑے اور ریاستیں ہیں (مقابل بیٹھے صاحب نے اپنا استدلال جاری رکھا) بڑے بڑے راجے، مہاراجے۔۔۔ اور۔۔۔ نواب۔۔۔ گذرے ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ میوات کے سنگرام سنگھ اوّل جو رانا سانگا یا مہارانا سانگا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مغل مورخ البدایونی نے مہاراجا سانگا کو پرتھوی راج چوہان کے ساتھ جوڑتے ہوئے تمام راجپوتوں میں سب سے بہادر، راجا بتلایا ہے۔ البدایونی کے خیال میں مہاراجا سانگا نے اپنے دور میں بہ یک وقت راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش، اتر پردیش کے کچھ علاقوں کو چتوڑ کے دارالحکومت میں نہایت دلیری اور دانش مندی سے اپنی ریاست میں شامل کیا۔

اپنے طویل دورِ حکومت میں مہاراجا سانگا نے پڑوسی مسلم سلطنتوں کے خلاف مسلسل کامیابیاں بٹوریں۔ دہلی کے لودھی خاندان کو راجا سانگا نے جس طرح ناکوں چنے چبوائے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

بابر نے جب پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودھی کو شکست سے دوچار کر کے قتل کر دیا تب رانا سانگا نے، ایک لاکھ راجپوتوں کی فوج بنا کر آگرہ پر چڑھائی کی۔ رانا سانگا کے ساتھ پرتھوی راج کچھواہا کی فوج بھی اس جنگ میں شامل ہو گئی جس کے نتیجے میں بابر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس شکست کے بعد بابر اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اُس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا مگر اپنے ساتھیوں کے اصرار پر بابر نے اس جنگ کو جہاد قرار دے کر، جام و سبو توڑ دیئے اور تمام شراب کنوئیں میں بہا کر خدا کی رضا حاصل کرتے ہوئے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد، انسانی کھوپڑیوں کا مینار کھڑا کر دیا۔ بعد از جنگ بابر نے راجا سانگا کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر رانا سانگا کا قریبی ساتھی سلہادی، رانا سانگا سے دغا کر کے ہم سے نہ آن ملتا تو جنگ کا نتیجہ اس سے مختلف بھی ہو سکتا تھا۔

اس مقام پر آ کر آپ دریافت فرما سکتے ہیں کہ رانا صاحب کی جرأت اور بہادری سے اہلِ میوات کی عاجزی، انکساری اور زمین سے جڑی معاشرت کا تعلق کس طرح بنتا ہے (منہ کے دہانے کے دونوں سروں کو صاف کرتے ہوئے) تو حضور والا۔۔۔! وہ ایک پہلو تھا میوات کی تہذیب و تمدن کا۔۔۔! دوسرا اہم پہلو ہے۔۔۔ بھگتی تحریک ہے۔۔۔ بھگتی تحریک کے آثار و شواہد چھٹی صدی عیسوی میں جنوبی بھارت یعنی تامل ناڈو اور کرناٹک کے علاقوں میں دریافت ہوئے ہیں۔ یہ کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک نہیں تھی۔ اس کا تمام تر دارومدار۔۔۔ معاشرے میں موجود طرح طرح کے جبر مثلاً مذہبی تاناشاہی۔۔۔ ذات برداری کی نحوت۔۔۔ یا۔۔۔ شخصی اجارہ داری۔۔۔ اس تحریک سے وابستہ لوگ مذہب کے بجائے محبت، رواداری۔۔۔ اور۔۔۔ برابری کا پرچار کرتے تھے۔۔۔!

بارہوی صدی عیسوی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک اس تحریک کا ہندوستان میں بہت شور۔۔۔ غلغلہ۔۔۔ اور۔۔۔ عروج رہا۔۔۔ مقامی۔۔۔ اور ۔۔۔ علاقائی۔۔۔ تعصب، تنگ نظری۔۔۔ کے ساتھ۔۔۔ مذہب اسلام۔۔۔ تیزی سے بھارت میں پھیل رہا تھا۔۔۔ اہلِ اسلام۔۔۔ ایک خدا۔۔۔ ایک رسول۔۔۔ اور۔۔۔ ایک کتاب کے ماننے والے تھے۔۔۔ مندروں اور اُن میں موجود۔۔۔ دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں۔۔۔ اُن کے نزدیک۔۔۔ خدا کی وحدانیت سے انکار کے مترادف تھا۔۔۔ جہاں، جہاں مسلمان اکثریت میں ہوتے۔۔۔ وہاں، وہاں۔۔۔ مندر اور اُن میں رکھی مورتیوں کے تلف کرنے کی خبریں بھی عام تھیں۔۔۔ ایسی صورت میں۔۔۔ بھائی چارے کی فضا کو برقرار رکھنے کی غرض سے بھگتی تحریک تیزی سے مقبول ہونے لگی۔۔۔ بھگتی تحریک کے تقریباً سبھی بھگت۔۔۔ اللہ۔۔۔ ایشور۔۔۔ اور۔۔۔ بھگوان۔۔۔ کو۔۔۔ ایک ہستی گردان کر اُسی کی عبادت کی تلقین کرتے۔۔۔ بھگتوں کے بقول۔۔۔ ایشور۔۔۔ اللہ۔۔۔ اور۔۔۔ بھگوان کو۔۔۔ یاد کرنے کے لیے اینٹ گارے کی عمارتوں۔۔۔ چونے پتھر کی مورتیوں کی قطعاً ضرورت نہیں۔۔۔ جب چاہو۔۔۔ جہاں چاہو۔۔۔ سچے من سے۔۔۔ اپنے رب کو یاد کر لو۔۔۔

بہت سے مبلغ۔۔۔ مفسر۔۔۔ اور۔۔۔ دانشوران۔۔۔ کے۔۔۔ خیال میں۔۔۔ بھگتی تحریک جاگیرداری نظام۔۔۔ اور۔۔۔ راجپوت و برہمن کے بڑائی۔۔۔ و۔۔۔ اونچائی۔۔۔ کے خود ساختہ تصور کے ردِعمل میں پھلی پھولی۔۔۔! جب ان طاقتور حلقوں کو اپنی اجارہ داری خطرے میں نظر آئی۔۔۔ تو انہوں نے۔۔۔ اس تحریک میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی۔۔۔ جس کے بعد۔۔۔ بھگتی تحریک دو نظریوں میں بٹ گئی۔۔۔ اوّل سگونا۔۔۔ دوئم نرگونا۔۔۔ سگونا۔۔۔ اُن۔۔۔ کوی۔۔۔ سنت۔۔۔ اور۔۔۔ صوفیوں پر مشتمل تھی۔۔۔ جو بھگتی تحریک کو اپنے تخلیقی وجدان۔۔۔ یعنی۔۔۔ کویتا۔۔۔ دوہے۔۔۔ بھجن۔۔۔ وغیرہ کے ذریعہ آگے بڑھانا چاہتے تھے۔۔۔ جیسے۔۔۔ تلسی داس۔۔۔ مہتا نہا۔۔۔ سورداس۔۔۔ اور۔۔۔ میرابائی۔۔۔

سگونا نظریات کے حامل صوفی۔۔۔ سنت۔۔۔ اور۔۔۔ کوی۔۔۔ برہمنوں۔۔۔ اور ذات برداری کے نظام کے حق میں تھے۔۔۔ وہ مذہبی عقائد کو سادہ لفظوں میں بیان کرتے ہوئے بندے اور خدا کے تعلق تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔۔۔ جبکہ۔۔۔ نرگونا نظریات کے۔۔۔ کوی۔۔۔ صوفی۔۔۔ اور۔۔۔ سنت گورو نانک۔۔۔ اور۔۔۔ کبیر داس۔۔۔ وغیرہ نے۔۔۔ راجپوتوں۔۔۔ اور۔۔۔ برہمنوں۔۔۔ کی۔۔۔ اجارہ داری کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔۔۔ اُن کے خیال میں۔۔۔ خدا۔۔۔ اور۔۔۔ بندے۔۔۔ کا تعلق ذاتی

نوعیت کا ہے۔۔۔اور۔۔۔اسے کسی بھی نام سے پکارا جاسکتا ہے۔۔۔!

بھگتی تحریک نے سات نکات پر مشتمل آئین بھی تشکیل دیا تھا:

۱۔ کسی بھی قسم کے ذاتیات اور بڑے پن کو رد کرنا

۲۔ موت اور زندگی کے بارے ہر آدمی کی رائے اور اُس کا پرچار جو خدا سے مشروط ہو۔

۳۔ غیر مشروط طور پر خدا کے آگے جھکنا اور رہنمائی کے لیے گرو کو اہمیت دینا

۴۔ عالمی بھائی چارے پر عمل کرنا

۵۔ رسوم و روایات اور اندھی تقلید سے پرہیز کرنا

۶۔ ذات برادری کے نظام کو قطعی طور پر رد کرنا

۷۔ تمام دعائیہ کلام کو اپنی زبان مطلب عام آدمی کی زبان میں عقیدت و احترام سے پڑھنا۔

بھگتی تحریک کم و بیش ایک ہزار سال پر محیط ایسی تحریک ہے۔۔۔جس نے۔۔۔انسانوں کے درمیان۔۔۔محبت۔۔۔اخوت۔۔۔ بھائی چارہ۔۔۔ اور۔۔۔ برابری کی بنیاد پر ہندوستان بھر کے کونے۔۔۔ کونے میں۔۔۔ ہزارہا۔۔۔لکھوکا۔۔۔کروڑہا۔۔۔لوگوں کو۔۔۔ ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔۔۔مگر۔۔۔سنت۔۔۔کبیر داس۔۔۔ بابا گرونانک۔۔۔میرابائی۔۔۔ رامانوجا۔۔۔سنت دیانیشور۔۔۔سنت رامانندا۔۔۔ ولبھ اچاریہ۔۔۔ چیتا یہ مہاپربھو۔۔۔سنت دادو۔۔۔سنت ایکناتھ۔۔۔سنت ٹکارام۔۔۔سمرا ٹھ گرو رام داس۔۔۔اُن شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے۔۔۔اپنی تمام عمر۔۔۔اس تحریک کے لیے وقف کر کے۔۔۔ انسان کو۔۔۔ اُس کی عظمت کا احساس دلاکر۔۔۔ ہندی معاشرے میں۔۔۔محبت۔۔۔اور۔۔۔رواداری کی۔۔۔وہ۔۔۔ نیو رکھی۔۔۔ جس کو نبھانے۔۔۔ اور۔۔۔ اپنانے میں۔۔۔ اہل میوات۔۔۔آج بھی۔۔۔فخر کرتے ہیں۔۔۔اور۔۔۔آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔۔۔بقول میرابائی:

ہے ری میں تو پریم دیوانی، میرا درد نہ جانے کوئی
سولی اوپر سیج ہماری ، کس بدھ سونا ہوئے
گگن منڈل پر سیج پیائی ، کس بدِھ ملنا ہوئے
گھائیل کی گتی گھائیل جانے، کی جن لاگی ہوئے
جو ہری کی گتی جوہری جانے، کہ جن لاگی ہوئے
درد کی ماری بن ، بن ڈولوں ، ویدملیونہیں کوئے
میرا کی پربھو پیڑ مٹے ، جب وید مساں ولیا ہوئے

اور دیکھیے سورداس جی کیا کہتے ہیں:

مِیں دیوگن سہی سکے، نیرن پوچھے بات
دیکھبو تو تا کی گیتہہ، رتی کھٹھن جات

یعنی چاہے پانی مچھلی کی بات بھی نہیں پوچھتا، پھر بھی مچھلی تو پانی کا ویوگ نہیں سہہ سکتی۔

تلسی داس جی کا رنگ بھی نرالا ہے:

دُرجن درپن سمسدا کر دے کھوئی گور
سکھ گتی اور ہے، وی مکھ بھیئے پراور

مطلب: درجن شیشے کے برابر تو ہیں مگر جب سامنے ہوتے ہیں تو اور ہوتے ہیں اور پیٹھ پیچھے اور۔۔۔!

کبیر داس جی کا بھی اپنا رنگ ہے:

بیٹا جائی کا ہوا، کہا بجاوے تھال
آون جاون ہے رہا جیونکڑی کلنال

کبیر جی کے کہنے کا مطلب ہے کہ بیٹا پیدا ہونے پر تالی بجا کر اتنی خوشی کیوں ظاہر کرتا ہے۔انسان تو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

''جس مدلل طریق پر آپ نے میوات کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی اہمیت کو بیان فرمایا۔۔۔اُس کی روشنی میں راجپوت قوم۔۔۔بالخصوص رانا سانگا کی بہادری۔۔۔اور۔۔۔بھگتی تحریک کی تاریخ سے آگاہی کے بعد۔۔۔بادشاہ اکبر کے دینِ الٰہی کی نسبت بھی اظہار خیال ضروری تھا۔۔۔!'' (سخن دہلوی نے پہلو بدلتے ہوئے، اپنی رائے کا اظہار کیا)

''حضور والا۔۔۔! حضرت صاحب کی موجودگی میں (حالی صاحب کی جانب اشارہ) میں خود کو قطعی اس کا اہل نہیں سمجھتا۔۔۔!''

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

(غالباً حالی صاحب ذہنی طور پر آمادۂ گفتگو تھے)

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کی خرافات کے ساتھ لفظ دین کا استعمال صریحاً زیادتی ہے۔۔۔اکبر ایک جاہ پرست انسان تھا۔۔۔ اور۔۔۔اپنے شوق حکمرانی کو طول دینے کے لیے۔۔۔طرح طرح کی نوٹنکی اور سوانگ رچا کرتا تھا۔۔۔اگر آپ اُس کے وزیروں اور مشیروں پر نظر دوڑائیں جو تاریخ میں نورتن کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔۔۔راجا مان سنگھ۔۔۔راجا بیربل۔۔۔راجا ٹوڈرمل۔۔۔عبدالرحیم خانِ خاناں۔۔۔ابوالفضل فیضی۔۔۔ ابوالفضل علامی۔۔۔ملّا دو پیازہ۔۔۔میاں تان سین۔۔۔فقیر عزیز الدین کوکتاش۔۔۔ بلاشبہ مذکورہ بالا تمام شخصیات اپنے اپنے میدان کے شہہ سوار مانے جاتے ہیں۔۔۔مگر۔۔۔ان کے اوصافِ حسنہ۔۔۔اور۔۔۔فنی کمالات سے کسی کو مفر نہیں۔۔۔اس ہمہ رنگی پر غور فرمانے سے اکبر کا شوقِ حکمرانی ۔۔۔بلکہ۔۔۔ہوسِ اقتدار۔۔۔عیاں ہو جاتی ہے۔۔۔اس پہ طرّہ یہ کہ آپ جناب نے طبیعت بھی خوشامدانہ پائی تھی۔۔۔ ہر دو خوبیوں کا نہ صرف وزیروں ۔۔۔مشیروں۔۔۔بلکہ۔۔۔علمائے سُونے۔۔۔خوب خوب فائدہ اٹھایا۔۔۔!

بلاشبہ اکبر بنیادی طور پر ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔ بھارت کی بیس فیصد مسلمان آبادی کے برتے پر۔۔۔اپنے اقتدار کو طول نہ دے سکتا تھا۔۔۔دیگر مذاہب کے لوگوں کو۔۔۔ریجھانا۔۔۔لبھانا۔۔۔

اور۔۔۔شیشے میں اتار رکھنا۔۔۔اُس کی ضرورت بھی تھی۔۔۔اور۔۔۔اُس کی مجبوری بھی۔۔۔جیسے جیسے وسیع المشربی کے غبارے میں ہوا بھرتی گئی۔۔۔ویسے ویسے۔۔۔ مفاد پرست ٹولہ۔۔۔ اکبر کو اپنے اشاروں پر نچانے لگا۔۔۔ اور۔۔۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اکبر نے پوجا پاٹھ شروع کرنے کے ساتھ بہت سے اسلامی عقائد اور شعائر پر پابندی عائد کر دی۔۔۔''

کچھ عرصہ تک۔۔۔علمائے حق نے ہوا کا رُخ بدلنے کا انتظار کیا۔۔۔ مگر۔۔۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔۔۔تو۔۔۔ ہندوستان بھر سے جیّد علما۔۔۔دانشور۔۔۔اہلِ علم۔۔۔اور۔۔۔اہل قلم۔۔۔حضرت مجدد الف ثانی کی قیادت میں۔۔۔اکبر کے اس فتنے کا سر کچلنے کے لیے۔۔۔سر پر کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے۔۔۔

حضرت مجدد الف ثانی کی ولولہ انگیز قیادت۔۔۔اور۔۔۔عوام کے جوشِ عقیدت کے آگے۔۔۔ نہ صرف اکبر نے گھٹنے ٹیک دیے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ اسلام کی جانب مراجعت بھی کر لی۔۔۔

دم آخر اکبر کے لبوں پر ایک ہی ورد تھا۔۔۔

"لاالٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ"

☆

آیئے، آیئے۔۔۔اس وقت آپ کی آمد کو دخل در معقولات سے ہرگز تشبیہہ نہیں دی جا سکتی۔۔۔! (حالی صاحب نے سلیچی، لوٹا، بیسن کی تریل اور سفید جھاڑن لیے چاروں ملازمین کا استقبال کیا)

پہلے کی طرح اس بار بھی ایک ملازم نے بیسن کی تریل، ایک ایک کر کے مہمانوں کی جانب بڑھائی، مہمانوں نے پہلے کی طرح بیسن کو چھو کے جونہی ہاتھ آگے کیے، پانی والا ملازم آ گیا، پانی والے کے بعد ہاتھ خشک کرانے کے لیے جھاڑن لیے ایک ملازم بھی خدمت پر مامور تھا۔ چاروں ملازمین کی خدمت سے استفادہ کرتے ہوئے ہر مہمان نے خدمت پر مامور ملازمین کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے ہاتھ کی مدد سے آداب کہنا ضروری جانا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد خاص دان، اُگال دان اور پیگ دان مہمانوں کے آگے ایستادہ کیے گئے۔ مستعد ارو چوکنے ملازمین کے ساتھ شاہ برادران بھی آگے بڑھ کر مہمانوں کی خدمت میں خاص دان، اُگال دان اور پیگ دان احترام سے پیش کر رہے تھے۔ کچھ مہمان خاص دان کا ڈھکن احتیاط سے اٹھا کر اپنی پسند کی گلوری سلیقے سے منہ میں رکھ کر آداب عرض کرتے اور خاص دان آگے بڑھا دیتے۔

خاص دان، گلوری، اُگال دان اور پیگ دان کی گہما گہمی کے دوران ہی منقّش حقّے لائے گئے۔ فرشی نَے سے آراستہ حقّوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے، لے جانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایک ملازم باری، باری حقّے کی نَے مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتا، گر مہمان کو طلب ہوتی تو وہ کچھ دیر شوق فرمانے کے بعد حقّے کی نَے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھانے کی تاکید کرتے گر طلب نہ ہوتی تو ملازم کے نَے پیش کرنے سے قبل ہی آداب عرض کرتے ہوئے آگے بڑھانے کا اشارہ کرتے۔

☆

''گستاخی تصور نہ کی جائے تو ایک سہو کی جانب آپ جناب کی توجہ دلانا چاہتے ہیں۔۔۔'' (حالی صاحب کی جناب مؤدب انداز میں روئے سخن کر کے سید مقصود علی المعروف سخی لکھنوی گویا ہوئے)

''بہ سر و چشم فرمایئے۔۔۔کسی تکلف کی قطعاً ضرورت نہیں۔۔۔!''

(حالی صاحب کی جانب سے حوصلہ پا کر سخی لکھنوی گویا ہوئے)

''حضرت والا۔۔۔! آپ نے مشاعروں کے مراکز کی نشان دہی میں دلّی، لکھنؤ، امروہا، مراد آباد اور رام پور وغیرہ کا ذکر مصلحتاً نہیں فرمایا۔۔۔یا۔۔۔!''

''اماں، یہ حوالے کی گفتگو ہرگز نہیں ہے۔۔۔ وگرنہ۔۔۔ ایک عمر چاہیے اس بیاں کے لیے۔۔۔ ویسے آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے۔۔۔قصہ کچھ یوں ہے۔۔۔کہ۔۔۔دو شیخی خورے میاں بیوی۔۔۔ ایک دوسرے کو مرعوب کرنے میں ہر صورت بازی مارنا چاہتے تھے۔۔۔ بیوی بولی میرے نانا کے اتنے طویل کھیت تھے کہ بچہ چلتے چلتے جوان ہو جاتا تھا۔۔۔ اب میاں کو تو اس کا جواب دینا لازم تھا۔۔۔ بولا۔۔۔ میرے دادا کے پاس اتنا لمبا بانس تھا۔۔۔ جب جی چاہتا بادلوں کو ہلا کر بارش برسا لیتے۔۔۔ بیوی لاجواب ہو کر بولی۔۔۔ اتنا لمبا بانس تمہارے دادا رکھتے کہاں تھے۔۔۔شوہر نے بے ساختہ جواب دیا۔۔۔تمہارے نانا کے کھیت میں۔۔۔

''حضور کچھ روشنی رات کے مشاعرے پر بھی ڈالیے (ظہیر دہلوی نے حالی صاحب کی رائے جاننا چاہی)

''ہر طرح، ہر لحاظ اور ہر طریق پر یہ ایک بھرپور مشاعرہ تھا۔۔۔!''

آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔۔۔مگر۔۔۔ ہمارے ذہن میں۔۔۔کل رات سے ایک سوال مسلسل گردش کر رہا ہے۔۔۔؟''

(حضرت ظہیر دہلوی کا روئے سخن اپنی جانب دیکھ کر شاہ صاحب مدینے والے گویا ہوئے)

''جی۔۔۔جی۔۔۔ارشاد۔۔۔!''

''میوات کی سوغات میوات میں دستیاب نہ ہو گی تو کیا مدینے میں ہو گی۔ البتہ یہ طرح طرح بلکہ غضب غضب کی گلوریاں اور حقّوں میں زعفرانی تمباکو۔۔۔اماں یہ تو فقط دہلی یا لکھنؤ کی سوغات ہیں جبکہ آپ۔۔۔!'' (ظہیر دہلوی نے مصلحتاً کلام نامکمل رہنے دیا)

''حضرت، کیا عرض کریں۔۔۔! یہ سب نواب مسکن دہلوی کی عطا ہے وگرنہ بندہ ناچیز کس لائق ہے۔۔۔!''

''نواب مسکن دہلوی۔۔۔چتلی قبر والے۔۔۔؟'' (جناب انور دہلوی کے دریافت کرنے پر شاہ صاحب مدینے والے گویا ہوئے)

''جی حضور۔۔۔ سہی فرمایا۔۔۔چتلی قبر والے۔۔۔نواب صاحب کی صحبت بجائے خود سعادت سے کم نہیں۔۔۔ اور۔۔۔ نواب صاحب قبلہ کی

دوست داری اور دوست نوازی تو یوں بھی دلّی بھر میں مثالی تصور کی جاتی ہے۔
(بیشک، بیشک۔۔۔ایک ساتھ کئی آوازیں)

''شاہ صاحب قبلہ۔۔۔ جہاں آپ کی زبانی نواب مسکن دہلوی سے آپ جناب کی قربت اور نیاز مندی ہمارے لیے باعثِ رشک ہے وہیں ایک سوال بھی ہمارے ذہن میں کلبلانے لگا ہے۔۔۔؟''

''جی جی ارشاد، بصد شوق ارشاد۔۔۔!'' (شاہ صاحب مدینے والے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمہ تن گوش ہوئے)

''نواب مسکن دہلوی سے آپ کا گہرا اُنس اور نواب صاحب کی داغ دہلوی صاحب سے دانت کاٹے کی روٹی۔۔۔اس کے باوجود، داغ صاحب کی رات کے مشاعرے میں عدم شرکت چہ معنی دارد۔۔۔؟''

''حضرت۔۔۔! آپ کی تشویش۔۔۔ برحق بھی ہے۔۔۔اور۔۔۔ برمحل بھی۔۔۔(شاہ صاحب مدینے والے، رات کے مشاعرے کے ناظم جناب انور دہلوی کی جناب روئے سخن کر کے گویا ہوئے)

قصہ کچھ یوں ہے کہ نواب مسکن دہلوی صاحب کی اکلوتی بیٹی حسن آرا کا بیاہ۔۔۔ریاست گولیار کے فرزند نواب مرزا تیمور بیگ سے اس ماہ کی سترہ کو طے پایا ہے لہٰذا اُن کی معذرت واجب اور مبنی بر حقیقت ہے۔۔۔اب آتا ہوں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کی جانب کہ حضرت داغ تشریف کیوں نہ لا سکے۔۔۔؟''

''آپ کے خیال میں کیوں نہ لا سکے۔۔۔'' (ایک سے زائد شعرائے کرام نے بہ یک آواز دریافت کیا)

''بہتر یہی ہے کہ ہم براہِ راست حضرت داغ کا جواب آپ کے گوش گزار کریں۔۔۔ اُن کی تازہ ترین غزل سماعت فرما لیجیے جو بطورِ خاص داغ صاحب نے رات کے مشاعرے کے لیے عطا کی تھی۔''

''اماں کیا فرما رہے ہیں۔۔۔! تازہ غزل۔۔۔داغ صاحب کی۔۔۔ کیا کہنے۔۔۔واللہ۔۔۔دیر نہ کیجیے (حضرت سفیر بلگرامی کا اشتیاق دیدنی تھا)

مجھ سا نہ دے زمانے کو پروردگار دل
آشفتہ دل فریفتہ دل بے قرار دل
ہر بار مانگتی ہیں نیا چشم یار دل
اک دل کے کس طرح سے بناؤں ہزار دل
مشہور ہو گئی ہے زیارت شہید کی
خوں کشتہ آرزو کا بنا ہے مزار دل
یہ صید گاہ عشق ہے ٹھہرایئے نگاہ
صیاد مضطرب سے نہ ہوگا شکار دل
طوفان نوح بھی ہو تو مل جائے خاک میں
اللہ رے غبار ترا پر غبار دل
پوچھا جو اس نے طالب روز جزا ہے کون
نکلا مری زبان سے بے اختیار دل
کرتے ہو عہد وصل تو اتنا رہے خیال
پیمان سے زیادہ ہے ناپائیدار دل
تاثیر عشق یہ ہے ترے عہد حسن میں
مٹی کا بھی بنائیں تو ہو بے قرار دل
اس کی تلاش ہے کہ نظر آئے آرزو
ظالم نے روز چاک کئے ہیں ہزار دل
عالم ہوا تمام رہا اس کو شوق حور
برسائے آسمان سے پروردگار دل
پہلے پہل کی چاہ کا کیجیے نہ امتحاں
آنا تو سیکھ لے ابھی دو چار بار دل
نکلے مری بغل سے وہ ایسے تڑپ کے ساتھ
یاد آ گیا مجھے وہیں بے اختیار دل
اے عندلیب تجھ کو لگے کب ہوائے عشق
کلیوں کی طرح تجھ میں نہ پھوٹے ہزار دل
عاشق ہوئے وہ جیسے عدو پر یہ حال ہے
رکھ کہہ کے ہاتھ دیکھتے ہیں بار بار دل
اس نے کہا ہے صبر پڑے گا رقیب کا
لے اور بے قرار ہوا بے قرار دل
بیتاب ہو کے بزم سے اس کی اٹھا دیا
غافل میں ہوں مگر ہے بہت ہشیار دل
مشہور ہیں سکندر و جم کی نشانیاں
اے داغ چھوڑ جائیں گے ہم یادگار دل

واہ، واہ۔۔۔سبحان اللہ۔۔۔خیال بھی اچھوتا۔۔۔بندش بھی لاجواب (ایک ساتھ، بہت سی آوازیں)

''اماں خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ اس موضوع یعنی ''دل'' کے موضوع پر اس سے عمدہ غزل، آج تک ہماری نظر سے نہیں گزری۔۔۔آپ حضرات کی نظر سے گزری ہو۔۔۔تو۔۔۔ضرور نشان دہی فرمایئے۔۔۔!(سخی لکھنوی کی آواز میں آواز ملا کر تمام شعراء نے داغ صاحب کی غزل کو اوج اُولیٰ پر بٹھا دیا)

''بات جہاں تک غزل کی یکتائی کی ہے، اس میں قطعی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔۔۔جستجو یہ ہے واردات دل کب اور کہاں وقوع پذیر ہوئی۔۔۔؟''
(مولانا الطاف حسین حال کی رائے سے قریب تمام شعراء کُلّی طور پر اتفاق رکھتے تھے البتہ! بال مکند صاحب اپنی جداگانہ رائے کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکے)

''ضروری تو نہیں ہر شعر یا غزل کے لیے، شاعر کوئی نہ کوئی معرکۂ عشق سَر کرے۔۔۔تخیل بھی کوئی چیز ہوتی ہے جناب۔۔۔!''

''ہوتی ہے۔۔۔ضرور ہوتی ہے، ہونی بھی چاہیے، اس کے بغیر شعر کہنا۔۔۔گھاس کاٹنے کے مترادف ہے۔۔۔مگر۔۔۔جو لوگ داغ صاحب سے

آشنائی کے دعوی دار ہیں۔۔۔اُن کے لیے۔۔۔آپ کی دلیل سے اتفاق۔۔۔نہ صرف مشکل۔۔۔بلکہ۔۔۔قطعی طور پر ناممکن ہے۔۔۔!؟(مرزا حاتم علی بیگ کی رائے ایک طرح سے داغ صاحب کی نسبت۔۔۔سند کا درجہ رکھتی تھی جس سے تمام شرکائے کرام نے بہ یک زبان سر کی جنبش اور ''بے شک'' کہہ کر اتفاق کیا)

''آپ حضرات کی رائے سے اختلاف کرنا تو کسی طور ممکن نہ ہے۔۔۔ البتہ!۔۔۔مکند صاحب کی تشفی۔۔۔کسی نہ کسی طور ہونا ہی چاہیے۔۔۔!'' (حالی صاحب کی رائے پر اتفاق کے اظہار میں تمام شعراء کرام نے یک زبان ''بے شک'' کہہ کر مہر تصدیق ثبت کر دی)

''اجازت ہو تو یہ فریضہ خاکسار بلا کسی عوضوانے کے، سرانجام دینے کو تیار ہے۔۔۔!'' (اجازت ہے ہم آواز ہو کر)

''دل'' ہمارے جسم میں اعضائے رئیسہ کی حیثیت رکھتا ہے (نساخ صاحب نے روئے سخن بال مکند صاحب کی جانب کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا) کبھی کم، کبھی زیادہ، ہر ذی روح۔۔۔دل کے ہاتھوں کبھی شکار ہوتا تو کبھی شکار کرتا ہے۔۔۔یہ ایسی کیفیت ہے۔۔۔جو۔۔۔شاعر کے تخیل کو تابدار کرتی ہے۔۔۔سوال جہاں تک حضرت داغ کی شخصیت وفن کا ہے۔۔۔تو۔۔۔جن حالات کا سامنا داغ صاحب کو کرنا پڑا اُس کے ردِعمل میں۔۔۔داغ صاحب کی جگہ اگر ہم یا آپ ہوتے۔۔۔تو۔۔۔شاید اُن سے زیادہ دل کے اسیر ہوتے۔۔۔داغ صاحب کی زندگی کھلی کتاب کی مانند ہے جس کے غالب ابواب حسن وعشق کی رنگینی سے اٹے پڑے ہیں۔۔۔مگر۔۔۔آج کل۔۔۔داغ صاحب۔۔۔جس۔۔۔ذہنی اور قلبی کشاکش سے دوچار ہیں۔۔۔اُس کی بابت داغ صاحب سے بہتر۔۔۔کون روشنی ڈال سکتا ہے۔۔۔!

''ہم میں سے بیشتر احباب رام پور کے میلے بے نظیر سے یقیناً واقف ہوں گے۔اُن دنوں داغ صاحب نواب رام پور کی ملازمت میں ہونے کے سبب وہیں قیام رکھتے تھے۔یوں تو داغ صاحب قدرت کی صناعی کے بہت بڑے قدر داں اور دلدادہ ہیں ہی مگر صنفِ لطیف کی جانب اُن کی توجہ۔۔۔اُن کی رغبت اور اُن کا جھکاؤ ضرورت سے کچھ زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔

یوں تو رام پور کے بے نظیر میلے میں داغ صاحب کی دل بستگی کا کافی سامان دستیاب تھا۔۔۔مگر۔۔۔اس بار جس تیر کی زد میں داغ صاحب اور اُن کا دل ناتواں تھا۔۔۔وہ۔۔۔تیر۔۔۔نہیں۔۔۔تلوار۔۔۔بلکہ۔۔۔بھالے کی تاثیر کی حامل کلکتہ کی نامور طوائف منّی بائی تھی۔داغ اگر منّی بائی کے حسن اور رعنائی پر فریفتہ تھے تو منّی بائی داغ کی شاعری کی دیوانی تھی۔منّی بائی نہ صرف اعلیٰ شعری ذوق کی حامل یکتائے زمانہ طوائف تھی بلکہ حجاب تخلص سے شعر بھی کہا کرتی تھی۔ یوں کہیے کہ ہر دو مریضوں کی شفایابی ایک دوسرے کی مرہونِ منت تھی

بقول حضرتِ والا (حالی صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے)

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے جو چھپایا نہ جائے گا

میلے میں منّی بائی کے۔۔۔داغ کے علاوہ اور بھی کئی چاہنے والے دُور دراز کا سفر طے کر کے منّی بائی سے ملنے آئے تھے اور اہلِ رام پور میں بھی باذوق، باوفا لوگوں کی کمی نہ تھی مگر داغ دہلوی کا موم کی مانند پگھلتا دل اور دیوارِ گریہ کی طرح ڈھلتی عمر ایک پل بھی منّی بائی سے جدائی کو تیار نہ تھی۔جب تک میلا بھرا رہا، منّی بائی کسی نہ کسی طور داغ صاحب کی دلجوئی کا فریضہ انجام دیتی رہی اور بدلے میں داغ صاحب سے نہ صرف اپنے کلام پر اصلاح بلکہ بہت کچھ داغ صاحب کے کرشماتی قلم کا فیضان بھی سمیٹتی رہی۔۔۔معینہ مدت پر میلہ ختم ہوا، باوجود منّت، سماجت اور کوشش کے منّی بائی نے رام پور میں اپنا قیام طے شدہ پروگرام سے ایک دن بھی نہ بڑھایا۔

اس سے قبل جو وقت مشقِ سخن اور نیاز مندان داغ کے کلام کی درستگی میں گزرتا تھا وہ اب منّی بائی کے ساتھ نام و پیام میں گزرنے لگا۔ہر چند منّی بائی داغ صاحب کے عشق میں گرفتار تھی مگر کسی طرح کی جذباتی یا ہیجانی کیفیت کو قطعی دخل نہ تھا۔۔۔منّی بائی داغ صاحب کو عاشق کے بجائے بڑے شاعر کے طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھتی اور اپنے کلام کو تابدار بنانے کے لیے ہر قیمت پر داغ صاحب کے تعلق میں رہنا چاہتی تھی۔

ہر چند داغ صاحب کی کیفیت ایک ہارے ہوئے جواری کی مانند تھی مگر داغ صاحب کسی طور پر منّی بائی کو اپنے خطوط میں یہ بھنک نہ لگنے دیتے کہ وہ منّی بائی کے عشق میں جاں سے گذر جانے کے مرحلے سے دوچار ہیں۔

شبِ وصال ہے گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کو

کچھ دن تو منّی بائی کی جانب سے داغ صاحب کے خطوط کے جواب بروقت دیے جاتے رہے۔۔۔مگر۔۔۔آہستہ آہستہ۔۔۔اُن میں۔۔۔وقفہ آتا گیا۔۔۔اور۔۔۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ داغ صاحب منّی بائی کے جواب کو ترسنے لگے اور اُن پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی۔

دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

اس کیفیت میں ایک سال کس طرح گزرا یہ داغ صاحب کے شعر سے خوب ظاہر ہوتا ہے۔

دیکھنا حشر میں جب تم پہ مچل جاؤں گا
میں کیا وعدہ تمہارا ہوں کہ ٹل جاؤں گا

اگلے سال بے نظیر میلے میں منّی بائی پھر رام پور آئی اور داغ صاب نے تمام گلے شکوے اور بے وفائیاں بھول کر نہایت گرمجوشی سے منّی بائی کا استقبال کیا۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ منّی بائی داغ صاحب کے خلوص، محبت اور مروّت کا کھلی بانہوں سے استقبال کرتی مگر ہوا اس کے اُلٹ جس کا گلہ داغ صاحب یوں فرماتے ہیں:

وفا کریں گے نبھائیں گے بات مانیں گے
تمہیں بھی یاد ہے کچھ یہ کلام کس کا تھا

داغ صاحب کے کلام نے منّی بائی کا دل پھر سے موم کر دیا اور بے نظیر میلے کے تمام دن اور بیشتر راتیں ایک دوسرے کی ہمراہی میں کاٹنے کے بعد میلے کے اختتام پر جب وقتِ جدائی آیا تو داغ صاب پھر سے رنجیدہ ہو گئے:

وہ زمانہ بھی تمہیں یاد ہے تم کہتے تھے
دوست دنیا میں نہیں داغ سے بہتر کوئی

داغ کے کلام کی تاثیر سے ایک دنیا تحیّر زدہ ہے جس کا ثبوت اُن کے لاکھوں چاہنے والوں کے علاوہ قریب دو ہزار شاگردانِ سخن ہیں۔ اس باب میں دوسرا کوئی شاعر داغ کا ہم سر نہیں۔ منّی بائی نے داغ کی افسردگی کو اہمیت واولیت دیتے ہوئے انہیں کلکتہ آنے کی دعوت دی جسے داغ صاحب نے بخوشی قبول کر لیا۔

منّی بائی کے رام پور سے جانے کے بعد۔۔۔ رام پور داغ کو بیاباں لگنے لگا۔ وہ رام پور جہاں عزت، شہرت، نام ونمود اور بے پناہ چاہنے والے اُن کی دلجوئی کے لیے پا بہ رکاب رہتے۔۔۔ داغ صاحب بڑھتی عمر اور سفری صعوبتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دلّی، لکھنؤ، عظیم آباد (پٹنہ) کے طویل سفر کے بعد کلکتہ پہنچے۔

کلکتہ پہنچ کر مسئلہ رہائش کا تھا مگر اہلِ ذوق اور عاشقانِ داغ نے مسجد خداداد کے قریب کرائے کا ایک گھر لیا۔ اہل کلکتہ نے نہ صرف داغ صاحب بلکہ اُن کی شاعری کی بھی خوب پذیرائی کی۔ مسجد خداداد کے مقابل داغ دہلوی کا قیام قریب تین ماہ رہا۔ اس دوران داغ صاحب نے جو بھی کہا۔۔۔ اُس میں منّی بائی کسی نہ کسی حوالے سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ داغ صاحب کا کلکتہ میں دل لگنے لگا تھا جس کے زیرِ اثر داغ صاحب کلکتہ کو مستقل مسکن بنانے کی بابت اکثر سوچتے۔

یوں بھی ہزاروں لاکھوں میں تم انتخاب ہو
پورا کرو سوال تو پھر لاجواب ہو

شومئ قسمت نواب رام پور کلب علی خان کے انتقال کی خبر نے اُنہیں رام پور کے لیے رختِ سفر باندھنے پر مجبور کر دیا۔ ایک طرف منّی بائی سے جدائی کا غم دوسری جانب داغ صاحب کو رام پور میں اب پہلی سی پذیرائی نہیں مل رہی تھی۔ پہلے سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار داغ صاحب اور شکستہ ہو گئے اور انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رام پور کو خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

رام پور سے داغ صاحب دلّی گئے مگر اہلِ دلّی نے داغ صاحب کی حسبِ منشا پذیرائی نہ کی تو حیدر آباد، دکن روانہ ہو گئے۔ داغ صاحب کا خیال تھا کہ اب وہ زندگی کے بقیہ دن منّی بائی کی یادوں کو بھلا کر حیدر آباد میں گزاریں گے۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

دی شب وصل مؤذن نے اذاں پچھلی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

نظام حیدر آباد، دکن نے کلکتہ کے سفر پر نکلنے کا ارادہ باندھا تو من پسند ہمراہی کے طور پر داغ صاحب کا انتخاب کیا۔ نظام کو انکار کرنے کی داغ صاحب میں جرأت نہ تھی۔ نظام کے احسانوں کے بدل میں اُن کے پاس کلکتہ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

داغ صاحب جس بات سے ڈر رہے تھے وہی بات زور وشور سے دورانِ سفر اُن پر حاوی رہی:

سب لوگ جدھر وہ ہیں ادھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں
تیور ترے اے رشک قمر دیکھ رہے ہیں
ہم شام سے آثار سحر دیکھ رہے ہیں
میرا دل گم گشتہ جو ڈھونڈا نہیں ملتا
وہ اپنا دہن اپنی کمر دیکھ رہے ہیں
کوئی تو نکل آئے گا سر باز محبت
دل دیکھ رہے ہیں وہ جگر دیکھ رہے ہیں
ہے مجمع اغیار کہ ہنگامۂ محشر
کیا سیر مرے دیدۂ تر دیکھ رہے ہیں
اب اے نگہ شوق نہ رہ جائے تمنا
اس وقت ادھر سے وہ ادھر دیکھ رہے ہیں
ہر چند کہ ہر روز کی رنجش ہے قیامت
ہم کوئی دن اس کو بھی مگر دیکھ رہے ہیں
آمد ہے کسی کی کہ گیا کوئی ادھر سے
کیوں سب طرف راہ گزر دیکھ رہے ہیں
تکرار تجلّی نے ترے جلوے میں کیوں کی
حیرت زدہ سب اہل نظر دیکھ رہے ہیں
نیرنگ ہے ایک ایک ترا دید کے قابل
ہم اے فلک شعبدہ گر دیکھ رہے ہیں
کب تک ہے تمہارا سخن تلخ گوارا
اس زہر میں کتنا ہے اثر دیکھ رہے ہیں
کچھ دیکھ رہے ہیں دل بسمل کا تڑپنا
کچھ غور سے قاتل کا ہنر دیکھ رہے ہیں
اب تک تو جو قسمت نے دکھایا وہی دیکھا
آئندہ ہو کیا نفع و ضرر دیکھ رہے ہیں
پہلے تو سنا کرتے تھے عاشق کی مصیبت
اب آنکھ سے وہ آٹھ پہر دیکھ رہے ہیں
کیوں کفر ہے دیدار صنم حضرت واعظ
اللہ دکھاتا ہے بشر دیکھ رہے ہیں
خط غیر کا پڑھتے تھے جو ٹوکا تو وہ بولے
اخبار کا پرچہ ہے خبر دیکھ رہے ہیں

پڑھ پڑھ کے وہ دم کرتے ہیں کچھ ہاتھ پر اپنے
ہنس ہنس کے مرے زخم جگر دیکھ رہے ہیں
میں داغؔ ہوں مرتا ہوں ادھر دیکھیے مجھ کو
منہ پھیر کے یہ آپ کدھر دیکھ رہے ہیں

کلکتہ پہنچ کر داغ صاحب پر ایک طرح سے بجلی آن گری۔۔۔ دنوں۔۔۔ ہفتوں۔۔۔ مہینوں بُنے خواب یکا یک چکنا چور ہو گئے۔ منّی بائی کا نام پتہ ڈھونڈنے میں داغ کو جن دشواریوں کا سامنا ہوا۔۔۔ اُسے داغ صاحب کے شعر کو نیا رنگ دے کر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

منّی ہے جس کا نام یہ ہمیں جانتے ہیں داغ
کن مشکلوں سے پتہ ڈھونڈ پائے ہم

مطلوبہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر، جونہی داغ صاحب نے معاون کو کنڈی کھڑکانے کا اشارہ کیا، ترت ہی ایک باریش اور بدشکل صاحب یوں نمودار ہوئے جیسے دروازے کے پیچھے کھڑے پہرے دار ہوں۔ شخص موصوف نے چند لمحے داغ صاحب اور اُن کے معاون کا نیچے سے اوپر تک جائزہ لینے کے بعد چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا:

''فرمایئے۔۔۔! کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔ جناب کی۔۔۔؟''

اس سے پہلے کہ داغ صاحب کچھ کہیں۔۔۔ معاون نے آگے بڑھ کر۔۔۔ عرض کیا:

''آپ حضور کو نہیں پہچانتے۔۔۔؟ ۔۔۔ ارے صاحب۔۔۔ آپ کے لیے۔۔۔ ناز۔۔۔ فخر۔۔۔ بلکہ۔۔۔ غرور کی بات ہے۔۔۔ جن کے دم قدم سے۔۔۔ سارے جہاں میں۔۔۔ اردو زبان کا ڈنکا بجتا ہے۔۔۔ وہ خود چل کر۔۔۔ آپ کے درِ دولت پر۔۔۔ آئے ہیں۔۔۔ یعنی حضرتِ داغ دہلوی۔۔۔ بہ نفسِ نفیس۔۔۔ تشریف لائے ہیں۔۔۔!''

''معاف کیجیے گا۔۔۔ آپ کے طویل بیان کے بعد بھی۔۔۔ ہم اُتنے ہی لاعلم ہیں۔۔۔ جتنے آپ کے آنے سے قبل تھے۔۔۔!'' (باریش شخص کی بدذوقی پر داغ صاحب اور اُن کے معاون خفیف ہو کر رہ گئے)

''اجی سنتے ہیں۔۔ دروازے پر کون آیا ہے۔۔۔ باہر ہی کھڑے رہیں گے۔۔۔ یا۔۔۔ اندر آ کر کچھ بتلائیں گے بھی۔۔۔!''

''وہ۔۔۔ بیگم۔۔۔! (سٹپٹاتے ہوئے) کیا نام فرمایا تھا آپ نے۔۔۔؟''

''جی داغ۔۔۔ داغ دہلوی۔۔۔!''

''بیگم۔۔۔! (باہر کھڑے کھڑے) ایک صاحب۔۔۔ اپنا نام۔۔۔ داغ دہلوی۔۔۔ بتلاتے ہیں جبکہ دوسرے صاحب سے ابھی کا تعارف حاصل نہ ہو سکا ہے۔۔۔!''

داغ صاحب کا نام سن کر جس طرح منّی بائی کی سُدھ گم ہوئی عین اُسی طرح داغ صاحب بھی منّی بائی کی مترنم آواز سُن کر ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گئے۔۔۔!''

''مہمان سے آنے کا مدعا دریافت کیجیے۔۔۔؟'' (منّی بائی کی آواز میں ڈر۔۔۔ خوف۔۔۔ صدمہ۔۔۔ ملال۔۔۔ ساری کیفیات۔۔۔ نمایاں طور پر عیاں تھیں۔۔۔؟

باریش شخص نے داغ صاحب اور اُن کے ہمراہی سے آنے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے سادہ اور سلیس الفاظ میں مدعا بیان کرتے ہوئے منّی بائی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جواب میں منّی بائی نے کہلا بھیجا کہ یہاں کوئی منّی بائی نہیں رہتی۔۔۔ یہاں صرف قاضی عبدالمجید اور اُن کی بیگم حجاب حمید کا قیام ہے۔

وقتی طور پر تو منّی بیگم نے جذبات کی رو میں بہہ کر یا قاضی عبدالمجید کو خوش کرنے کی غرض سے داغ صاحب کو ٹکا سا جواب دے دیا۔۔۔ مگر۔۔۔ جوں۔۔۔ جوں۔۔۔ منّی بائی کو مختلف ذرائع سے داغ صاحب کی حالتِ زار کا علم ہو رہا تھا۔۔۔ ڈوں۔۔۔ ڈوں۔۔۔ منّی بائی۔۔۔ داغ صاحب کی جانب ملتفت ہو رہی تھی۔ رہی سہی کسر داغ صاحب کے مکتوب نے پوری کر دی۔ اپنے مکتوب میں داغ صاحب نے منّی بائی کے شوہر نامدار قاضی عبدالمجید کو مخاطب کیا تھا اور صاف صاف الفاظ میں واضح کر دیا تھا کہ وہ یعنی داغ صاحب اور منّی بائی ایک دوسرے سے بے پناہ عشق کرتے تھے۔۔۔ اور کرتے ہیں۔۔۔!

داغ صاحب کے پہلے مکتوب کا قاضی عبدالمجید نے سخت الفاظ میں جواب دیا اور آئندہ کے لیے تنبیہہ بھی درج کرنا مناسب جانا۔۔۔ مگر۔۔۔ داغ کو ڈرانا۔۔۔ یا۔۔۔ اُن کے ارادوں سے باز رکھنا کم از کم کسی گوشت پوست کے انسان کے بس کا روگ نہ تھا۔۔۔!

داغ صاحب نے قاضی صاحب کے مکتوب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے واشگاف الفاظ میں قاضی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ آپ اور منّی بائی کا نکاح ایک طرح کا سمجھوتہ ہے۔۔۔ جبکہ۔۔۔ وہ یعنی داغ صاحب۔۔۔ اور۔۔۔ منّی بائی۔۔۔ ایک دوسرے کے فطری ہمدرد۔۔۔ غمگسار۔۔۔ اور۔۔۔ درد آشنا ہیں۔۔۔!

اس بار قاضی صاحب نے داغ کے مکتوب کا براہِ راست جواب دینے کے بجائے۔۔۔ درمیان میں ایک دانا شخص کو ڈالا اور زبانی پیغام میں اُس شخص کے ذریعہ داغ صاحب کی بڑھتی عمر اور ناقابلِ رشک صحت کو نشانہ بناتے ہوئے اپنے ارادوں سے باز رہنے کی سخت الفاظ میں تاکید کی۔۔۔!

داغ صاحب نے شخص مذکور کے ذریعہ کہلا بھیجا ''میں بوڑھا ہو کر بھی حجاب کے گرد ایک اُلو کی مانند ناچ سکتا ہوں۔ میں حجاب کو چراغ بنا کر اُس کی روشنی میں تمام عمر بِتا سکتا ہوں۔ ایک بار۔۔۔ فقط ایک بار میرا کہا مان لو۔۔۔ میں۔۔۔ تمام عمر۔۔۔ تمہارا وفادار۔۔۔ رہ کر۔۔۔ گزارنا چاہتا ہوں۔۔۔!

داغ صاحب کی تحریر پڑھ کر منّی بائی کے دل میں بھی پھر سے محبت کی شمع روشن ہو گئی اور اُس نے داغ صاحب کو ملاقات کے لیے بلوا بھیجا۔

منّی بائی کے دعوت نامے کے جواب میں داغ صاحب نے صاف

صاف الفاظ میں لکھ بھیجا۔۔۔ میں۔۔۔ اُس وقت تک تمہاری شکل نہ دیکھوں گا۔۔۔جب تک تم میری منکوحہ بن کر میرے گھر نہیں آتی۔۔۔!

تمام تر کوششوں کے باوجود قاضی عبدالمجید نے منّی بائی کو طلاق دینے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ چاروناچار داغ صاحب کو بے نیل ومراد حیدرآباد لوٹنا پڑا۔۔۔ بظاہر۔۔۔محبت کی یہ کہانی اختتام کو تھی۔۔۔مگر۔۔۔چند سال بعد۔۔۔ منّی بائی کی حیدرآباد آمد نے دبی چنگاری کو پھر سے دہکا دیا۔۔۔اس وقت داغ صاحب ستر کے پیٹے کو چُھو رہے تھے۔۔۔اس کے باوجود۔۔۔داغ صاحب نے۔۔۔پہلی سی گرمجوشی۔۔۔بلکہ۔۔۔والہانہ پن سے۔۔۔منّی بائی کا استقبال کرتے ہوئے۔۔۔اُس کے قیام۔۔۔و۔۔۔طعام کا۔۔۔مناسب بندوبست کیا۔۔۔اصل میں قاضی عبدالمجید کی موت کے بعد منّی بائی بالکل تنہا رہ گئی تھی۔۔۔عمر کا سنہرا دور بھی بیت چکا تھا۔۔۔ایسے میں۔۔۔اُسے داغ صاحب کی یاد ستائی۔۔۔داغ صاحب نے بھی۔۔۔کسی تاخیر کے بغیر۔۔۔منّی بائی کو نکاح کی پیشکش کر دی۔۔۔جسے منّی بائی نے بخوشی قبول کر لیا۔۔۔داغ کے عقدِ ثانی کی خبر سن کر۔۔۔اُن کے احباب۔۔۔اہلِ خانہ۔۔۔اور معتقدین۔۔۔و۔۔۔ناقدین نے حیرت کا اظہار کیا۔۔۔داغ صاحب کی بیٹی نے۔۔۔والد کے عقدِ ثانی پر۔۔۔احتجاج کے ساتھ۔۔۔ہمیشہ۔۔۔ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کی دھمکی بھی۔۔۔دے ڈالی۔۔۔مگر۔۔۔داغ صاحب پر کسی بات کا قطعی اثر نہ ہوا۔۔۔!

تمام تر کوششوں کی ناکامی کے بعد داغ صاحب کی بیٹی نے، داغ صاحب کے قریبی دوست میر ولایت علی خان سے مدد چاہی۔۔۔میر ولایت علی خان نے داغ صاحب سے کہا۔۔۔داغ صاحب۔۔۔ہم ذاتی طور پر۔۔۔آپ کی خوشی کے حق میں ہیں۔۔۔مگر۔۔۔جب آپ کی عمر۔۔۔اور۔۔۔صحت کی جانب نظر دوڑاتے ہیں۔۔۔تو۔۔۔ مایوسی کے سوا۔۔۔ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔۔۔میر صاحب کے ٹھوس استدلال کے جواب میں داغ صاحب نے دھیمے مگر پُرعزم لہجے میں کہا:

''ہمیں بیوی کی نہیں ۔۔۔ ہمدرد۔۔۔ و۔۔۔غمگسار کی ضرورت ہے۔۔۔حجاب کی عمر میں بھی۔۔۔ٹھہراؤ آ گیا ہے۔۔۔وہ بھی۔۔۔ جوانی کی دہلیز کو خداحافظ۔۔۔کہہ کر۔۔۔بڑھاپے کو خوش آمدید کہنے پر مجبور ہیں۔۔۔!

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو''

عشق ومحبت کی داستان میں ایک نیا موڑ اُس وقت آیا جب کلکتہ سے۔۔۔منّی بائی کے بہت سے حواری رشتہ داری کا دعویٰ کرتے ہوئے منّی بائی کے پاس آ کر رہنے لگے۔۔۔ایک طرف بیٹی اور داماد کی ناراضگی۔۔۔دوسری جانب ایک۔۔۔دو۔۔۔نہیں۔۔۔درجن بھر افراد کا ناواجب خرچ۔۔۔داغ صاحب کے شانوں کو۔۔۔ناتواں کرنے میں۔۔۔ برابر اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔۔۔آہستہ۔۔۔آہستہ۔۔۔گرمجوشی ختم ہونے لگی۔۔۔پھر سرد مہری نے جگہ بنائی۔۔۔آخر میں نفرت نے ایسے ڈیرے ڈالے۔۔۔کہ۔۔۔منّی بائی۔۔۔ اور۔۔۔داغ صاحب۔۔۔ایک دوسرے کی شکل سے بیزار ہو گئے۔۔۔اور ایک رات کی تاریکی میں۔۔۔منّی بائی۔۔۔اور۔۔۔اُس کے حواری۔۔۔بوریا بستر سمیٹ کر۔۔۔خاموشی سے کلکتہ سدھار گئے۔۔۔یوں۔۔۔محبت کی یہ۔۔۔اَنمل۔۔۔ بے جوڑ۔۔۔اور۔۔۔ بے وفا داستان اپنے اختتام کو پہنچی۔۔۔اور۔۔۔داغ صاحب دلگرفتگی کے عالم میں کہہ اٹھے:

لے چلا جان مری روٹھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا
اپنے دل کو بھی بتاؤں نہ ٹھکانا تیرا
سب نے جانا جو پتا ایک نے جانا تیرا
تو جو اے زلف پریشان رہا کرتی ہے
کس کے اجڑے ہوئے دل میں ہے ٹھکانا تیرا
آرزو ہی نہ رہی صبح وطن کی مجھ کو
شام غربت ہے عجب وقت سہانا تیرا
یہ سمجھ کر تجھے اے موت لگا رکھا ہے
کام آتا ہے برے وقت میں آنا تیرا
اے دل شیفتہ میں آگ لگانے والے
رنگ لایا ہے یہ لاکھے کا جمانا تیرا
تو خدا تو نہیں اے ناصح ناداں میرا
کیا خطا کی جو کہا میں نے نہ مانا تیرا
رنج کیا وصل عدو کا جو تعلق ہی نہیں
مجھ کو واللہ ہنساتا ہے رلانا تیرا
کعبہ و دیر میں یا چشم و دل عاشق میں
انہیں دو چار گھروں میں ہے ٹھکانا تیرا
ترک عادت سے مجھے نیند نہیں آنے کی
کہیں نیچا نہ ہو اے گور سرہانا تیرا
میں جو کہتا ہوں اٹھائے ہیں بہت رنج فراق
وہ یہ کہتے ہیں بڑا دل ہے توانا تیرا
بزم دشمن سے تجھے کون اٹھا سکتا ہے
اک قیامت کا اٹھانا ہے اٹھانا تیرا
اپنی آنکھوں میں ابھی کوند گئی بجلی سی
ہم نہ سمجھے کہ یہ آنا ہے کہ جانا تیرا
یوں تو کیا آئے گا تو فرط نزاکت سے یہاں
سخت دشوار ہے دھوکے میں بھی آنا تیرا
داغؔ کو یوں وہ مٹاتے ہیں یہ فرماتے ہیں
تو بدل ڈال ہوا نام پرانا تیرا

☆

خاک پوش

پروفیسر ابن کنول
(دہلی)

دہلی میں 1947 کے بعد ایک ایسا وقت بھی آ گیا جب ادبی یا غیر ادبی، اندرونی یا بیرونی شخصیت یا شخصیت کا استقبالیہ مکمل نہیں ہوتا تھا جب تک مجتبیٰ حسین کا خاکہ استقبالیہ محفل میں نہ پڑھا جائے یا متین امروہوی کے استقبالیہ اشعار پیش نہ کیے جائیں۔ متین امروہوی تو غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین تک محدود تھے، لیکن مجتبیٰ حسین خاکہ خوانی کے لیے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی بلائے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے تک جس طرح شادیوں میں سہرا خوانی لازمی تھی۔ اسی طرح استقبالیوں کا لازمی حصہ مجتبیٰ حسین کی خاکہ خوانی بن گئی تھی۔ بیچارے کبھی عقیدتاً، کبھی مجبوراً اور کبھی ضرورتاً ہر ایرے غیرے کا خاکہ لکھنے کے لیے مجبور تھے۔ سنا ہے بعض خاکے تو نہ چاہتے ہوئے بھی انھیں لکھنے پڑے۔ دراصل نئی بستیوں میں آباد نیم ادیب چاہتے تھے کہ اگر مجتبیٰ حسین ان پر ایک خاکہ لکھ دیں تو بہادر شاہ ظفر جیسی حیثیت کو اکبر اعظم جیسا وقار حاصل ہو جائے گا۔ مجتبیٰ حسین کا خاکہ ناموری کی سند مانا جانے لگا تھا۔ وہ مروّت کے مارے لکھ بھی دیتے تھے، بس اُن کے خاکے کا اثر ایسا ہوتا کہ خاک کو آسماں سے نسبت ہو جاتی۔ ممدوح فخریہ انداز میں ہر جگہ دہراتا کہ مجتبیٰ حسین نے مجھ پر خاکہ لکھا ہے، یہ نہیں معلوم کہ بے چارے مجتبیٰ حسین پر خاکہ لکھتے وقت کیا گزری تھی۔

مجتبیٰ حسین کا غالب کی طرح کہنا تھا کہ میرے اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا، جانے کیوں اور کس سے لڑتے تھے۔ غالب کی طرح انھیں بھی اس بات پر فخر تھا کہ اُن کے جدامجد ایران سے آئے تھے۔ شاید این آر سی (NRC) کے خوف سے مجتبیٰ حسین 2020 میں ہی دنیا چھوڑ گئے۔ کہیں واپس ایران نہ بھیج دیا جائے۔ مجتبیٰ حسین کی نسل تک آتے آتے ان کا خاندان قلم کا سپاہی بن گیا اور ایرانی رنگ دکنی ہو گیا تھا۔ ہم نے اس رنگ و روپ کا ایرانی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ احمد حسین کی دس اولادوں میں سے تین نے خوب قلم بازی کی۔ خدا جانے ابراہیم جلیس کو مجتبیٰ حسین کے بھائی ہونے پر فخر ہوتا تھا یا مجتبیٰ حسین کو۔ دونوں بھائیوں نے قلم بازی میں وہ کمال کیا کہ معاصرین کے چھکے چھڑا دیئے۔ 1960 کے بعد حیدرآباد زندہ دل لوگوں کا شہر بن گیا۔ باقاعدہ طنز و مزاح کے شعراء و ادباء کی زندہ دلانِ حیدرآباد کے نام سے ایک انجمن بن گئی۔ مجتبیٰ حسین کے والدین تلاشِ معاش میں گلبرگہ (کرناٹک) سے حیدرآباد آ کر آباد ہو گئے تھے۔ حیدرآباد کی فضا میں مجتبیٰ حسین کی زندہ دلی بھی پروان چڑھی۔ ان کی طبیعت اس لیے بھی چنچل تھی کہ وہ پنجولی میں پیدا ہوئے تھے۔ ہماری ملاقات مجتبیٰ حسین سے اس وقت ہوئی جب ہم دہلی آ گئے۔ وہ ہم سے پہلے ہی دہلی پہنچ چکے تھے۔ شہروں کا وقت بھی کیسے بدلتا ہے، کبھی دہلی سے روزگار کی تلاش میں پریشان حال یوروپ اور دکن جایا کرتے تھے، اب دکنی اور پورپے دہلی آتے ہیں۔ دہلی کی ادبی محفلوں میں ہم نے آنا جانا شروع کیا تو اُن سے ملاقاتوں کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی خاکہ سننے کو ملتا اور کبھی انشائیہ۔ اچھی خاصی راہ و رسم ہو گئی تھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں ان کے گھر جاتا تھا یا وہ میرے گھر آتے تھے، اکثر کسی کے مرنے کے بعد لوگ یہی کہتے ہیں۔ دراصل میں گھریلو تعلقات بہت کم رکھتا ہوں۔ ادب کو گھر سے باہر رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ وہ کبھی کبھی میرے مزاحیہ جملے سن کر کہتے تھے:

''ابن کنول! تم طنز و مزاح کیوں نہیں لکھتے۔''

میں جواباً انتہائی مؤدبانہ انداز میں کہتا:

''آپ کے ہوتے ہوئے یہاں کس کا چراغ جلے گا۔''

کچھ ایسا ہی ہوا، 2020 میں انھوں نے دنیا سے رخصت لی اور میں نے طنز و مزاح کی طرف توجہ دی۔ ایک ہی سال میں خاکوں کا مجموعہ بھی منظر عام پر آ گیا اور انشائیوں کا بھی، جو مجتبیٰ حسین کی موجودگی میں ممکن نہیں تھا۔ یہ بے ادبی بھی تھی کہ اُن کے ہوتے ہوئے میں خاکہ نگاری شروع کر کے ان کی حق تلفی کروں۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ خاک کو آسماں سے کیا نسبت۔ وہ طنز و مزاح کے نظام حیدرآباد تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کا زندہ دلی اور شگفتگی میں کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کی ابتدا کی کہانی بھی ایک مزاحیہ کالم نگار کی موت سے وابستہ ہے۔ حیدرآباد کے اخبار ''سیاست'' میں شاہد صدیقی نام کے ایک کالم نگار ''شیشہ و تیشہ'' کے نام سے مزاحیہ کالم لکھتے۔ خدا کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ جولائی کے آخری ہفتہ میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، نئے مزاح نگار کی تلاش ہوئی۔ بانیانِ سیاست کو جن میں عابد علی خاں کے علاوہ ایک مجتبیٰ حسین کے بھائی محبوب حسین جگر بھی تھے، شکل و صورت اور حرکات و سکنات سے مجتبیٰ حسین میں کافی مقدار میں مزاحیہ عناصر نظر آئے، ان سے کہا گیا کہ ''شیشہ و تیشہ'' سنبھالیے اور ''کوہ پیمائی'' شروع کر دیجیے۔ بس 12 اگست 1962 کا دن مجتبیٰ حسین کے لیے قلمی شگفتگی اور زندہ دلی کے آغاز کا دن بن گیا۔ پھر کبھی انھوں نے نہ قلم سے اور نہ زبان سے سنجیدگی کا اظہار کیا۔ ان کی سنجیدہ باتوں کو بھی لوگ غیر سنجیدگی ہی میں شمار کرتے تھے۔ مجتبیٰ حسین نے پہلے ''کوہ پیما'' کے نام سے مزاحیہ کالم لکھا، تاکہ عزت محفوظ رہے، لیکن جب عزت ملی، کالم مقبول ہوا تو کوہ پیمائی ختم کر کے طشت از بام ہو گئے۔ پردے سے باہر آ کر ایسے شگوفے کھلائے کہ دور تک خوشبو بکھر گئی۔ بطور طنز و مزاح نگار شناخت قائم ہو جانے کے بعد انھوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ ''عہد جوانی رو رو کاٹا'' یعنی یاسیت کے دور میں موت کے موضوع پر کچھ افسانے بھی لکھے تھے۔

دیگر شریف خاندانوں کی طرح مجتبیٰ حسین کی تعلیم کی ابتدا بھی مدرسے میں ہوئی، گزشتہ صدیوں میں مسلمان یہ سوچ کر اپنے بچوں کو مدرسوں میں پڑھاتے تھے کہ بڑا ہو کر عبدالحق محدث دہلوی نہ سہی، مولانا حالی یا مولانا شبلی ہی بن جائے

گا۔مجتبیٰ حسین سے بھیشاید یہی امید تھی، لیکن وہ پہنچ گئے مخدوم محی الدین اور راج بہادر گوڑ کے شہر میں۔ پھر آگے کیا ہوا، آپ سب جانتے ہیں۔ والد جوانھیں بنانا چاہتے تھے، انھوں نے بن کر نہیں دیا، کس کے والدین چاہیں گے کہ ان کا بیٹا دنیا کی دلبستگی یا ہنسانے کا ذریعہ بنے۔طنز و مزاح نگار کی حیثیت سرکس میں جوکر جیسی ہی ہے۔اپنے اندر کے غم چھپا کر سب کو ہنساتا ہے۔سرکس میں سب کا عمل سنجیدہ ہوتا ہے، سوائے جوکر کے، جسے دیکھنے والے سنجیدگی سے نہیں لیتے۔شاید وہ نہیں جانتے کہ سب سے مشکل کام اُسی کا ہے۔مجتبیٰ حسین اس راز کو جان گئے تھے، اس لیے انھوں نے سنجیدہ تعلیم کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ پرائمری اسکول میں دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا، مڈل اسکول میں فٹ بال کو دوڑاتے رہے، ہائی اسکول میں پتنگ پانگ میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ کالج اور شہر یعنی حیدرآباد میں داخل ہوئے تو شوق بدل گئے۔سنیما بینی اور ہوٹلنگ میں جوانی گزاری۔ بقول خود ''زمانہ طالب علمی میں ہر ایسی سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا، جو خارج از نصاب ہو۔ مجھے داخل در نصاب سرگرمیوں سے ہمیشہ چڑ رہی۔'' شاید جوانی کے انہی اعمال اور نصاب دشمنی کی وجہ سے انھیں این سی آر ٹی بھیجا گیا، جہاں نصاب ہی نصاب تھا، جس سے مفر ممکن ہی نہیں تھا۔این سی آر ٹی نصاب بنانے کا رخانہ ہے۔کالج میں رہ کر مجتبیٰ حسین انگریزی، سماجیات، معاشیات اور اردو یعنی مضمون کو نظر انداز کر کے ''خرافیات'' میں مصروف رہتے تھے۔انتقاماً انھیں این سی آر ٹی میں تمام مضامین کے نصاب کو نصب کرنے کی ذمہ داری دے دی گئی۔

تعلیم میں غیر سنجیدگی اور خرافات میں سنجیدگی کے سبب مجتبیٰ حسین کو جوانی میں گریجویشن کرنے کے بعد بھی بے روزگاری کے دن دیکھنے پڑے۔جس طرح برے وقتوں میں ماں کام آتی ہے اُن کی مادری زبان کام آئی، یعنی جس اردو کی کلاس کو چھوڑ کر قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے باغ میں بیٹھا کرتے تھے۔اسی نے آنسو پونچھ کر روزنامہ ''سیاست'' میں روزگار دے دیا۔والدین نے بیٹے کا لاابالی پن دیکھ کر پیروں میں بیڑیاں ڈالنے کا فیصلہ ہی نہیں کیا، بلکہ ڈال ہی دیں، تاکہ ادھر اُدھر بھٹکنا بند ہوجائے۔ اکثر بھری جوانی میں والدین اولاد کی شادی کر کے تمام راستے مسدود کر دیتے ہیں۔شادی کے بعد اچھے خاصے خوش مزاج لوگوں کا بھی ہنسنا ہنسانا کم ہوجاتا ہے یا بند ہوجاتا ہے۔مجتبیٰ حسین نے شادی سے قبل کی عمر ہنستے ہنساتے ہی گزاری تھی۔شادی کے بعد اُن کی خوش مزاجی قلمی ہنسی تک محدود ہوگئی، اس میں انھوں نے اس قدر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا کہ ادب کے سنجیدہ لوگ بھی اُن سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ وہ بہت جلد زندہ دلانِ حیدرآباد کے زندہ دل قلمکار بن گئے۔جس مزاح نگاری کو وہ غیر سنجیدگی سے لے رہے تھے، جسے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے دباؤ میں آکر لکھنا شروع کیا تھا، اس کی وجہ سے انھیں اتنی شہرت ملی کہ طنز و مزاح لکھنے میں سنجیدہ ہوگئے۔انھیں یہ بھی یقین ہوگیا کہ وہ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔اتنی کم عمری میں تو کسی ناول نگار یا افسانہ نگار کو بھی اُن کی فکشن نگاری کے طفیل شہرت نہیں ملی تھی۔

مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاری کی اتنی عزت دیکھ کر حیدرآباد میں کل ہند مزاح نگاروں کی کانفرنس بھی کر ڈالی۔زندہ دلانِ حیدرآباد کی جیسے لاٹری کھل گئی، انھوں نے مجتبیٰ حسین کی باقاعدہ دستار بندی کا فیصلہ کیا، یعنی انھیں زندہ دلانِ حیدرآباد کا جنرل سکریٹری بنا دیا۔مجتبیٰ حسین اس لیے خوش تھے کہ انھیں بغیر کرسی اور اقتدار کے اتنی عزت مل رہی تھی۔ وہ چھ بار مختلف انجمنوں کے جنرل سکریٹری رہے، ان کا کہنا تھا کہ خدا جانے میں جنرل سکریٹری کے رتبے سے آگے بڑھوں گا یا نہیں۔شاید ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انھیں اہل حیدرآباد نے سینیئر سٹیزن ہونے کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد شاخ کا صدر بنا دیا۔ اب اُن کی شہرت حیدرآباد سے نکل کر دہلی اور دہلی سے نکل کر سرحد پار تک پہنچ گئی تھی۔یہ حال دیکھ کر مجتبیٰ حسین نے بھی اکٹھے قلم اور قلمدان خرید لیے۔کسی سے کالم لکھا، کسی سے انشائیہ اور کسی سے خاکہ، کسی قلم کی سیاہی کو سوکھنے نہیں دیا، جب شہرت قطب مینار کی طرح بلند ہوئی تو قطب مینار کے پاس ہی آکر بس گئے، یعنی این سی آر ٹی میں تادمِ سبکدوشی قیام کیا جو قطب مینار کے قریب ہے۔قطب مینار کا قد تو آٹھ سو سال بیت جانے کے بعد بھی وہی رہا بلکہ ایک منزل کم ہوگیا، لیکن مجتبیٰ حسین کا قد قطب مینار سے بھی بلند ہوتا گیا۔جس طرح قطب مینار کو لوگ دیکھنے آتے ہیں اسی طرح مجتبیٰ حسین کو بھی دور دراز ملکوں تک سے دیکھنے اور سننے لوگ آنے لگے۔ جو آنہیں سکے، انھوں نے انھیں دیکھنے کے لیے کرایہ دے کر بلا لیا۔ اللہ کا شکر ہے مزاح نگاری کی بدولت انھوں نے دنیا کے بارہ ملکوں کا سفر اپنے پیسے خرچ کر کے نہیں کیا۔حج کے اخراجات بھی سرکار نے برداشت کیے۔مجتبیٰ حسین نے بیس برسوں میں بارہ ملکوں کا سفر کیا۔ابتدا 1980 میں جاپان سے ہوئی اور آخری سفر امریکہ کا سنہ 2000 میں کیا۔ڈھائی مہینے امریکہ والے ان کے طنز و مزاح سے محظوظ ہوتے رہے۔ چوراسی سال کی عمر میں صرف دو سو چوراسی دن ملک سے باہر رہے۔سب سے طویل قیام امریکہ میں رہا، شاید اس لیے کہ وہاں حسن چشتی حیدرآبادی موجود تھے۔خدا جانے ایک مہینہ پانچ دن جاپانیوں کی چیں پیں میں کس طرح گزارے۔کناڈا سے تو چار دن میں ہی واپس آگئے۔اتنا وقت تو جانے آنے ہی میں لگ جاتا ہے۔اس وقت شاید کناڈا میں ڈاکٹر تقی عابدی نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو ادب میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ پیرس، دوبئی یا مسقط جیسی خوبصورت جگہوں سے بھی پانچ چھ دن میں واپس آنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی لیکن جب اخراجات کوئی اور اُٹھاتا ہے تو یہی ہوتا ہے، گھر واپسی جلدی ہوجاتی ہے۔مجتبیٰ حسین کو شاید جاپان سب سے زیادہ اچھا لگا، چھوٹے چھوٹے لوگوں میں انھیں اپنی بلند قامتی کا بھی احساس ہوا ہوگا، اس لیے وہاں سے آنے کے بعد بس یہی اُن کے منہ سے نکلا ''جاپان چلو جاپان چلو'' یعنی جو میں نے دیکھا تم بھی دیکھو یا جو مجھ پر بیتی تم پر بھی بیتے۔انھوں نے باقی اسفار کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ایک کتاب ''لختِ لخت سفر'' میں ہی سب کو سمیٹ دیا، جس کی تزئین کاری میں ان کے دوست حسن چشتی نے حقِ دوستی ادا کیا۔جس طرح غالب کو حالی اور ذوق کو محمد

حسین آزاد مل گئے تھے، مجتبیٰ حسین کو حسن چشتی مل گئے۔ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے بھی شائع کرائے، خاکوں اور انشائیوں کو بھی بہترین تحریریں کہہ کر مرتب کیا، کالموں کا بھی انتخاب کر ڈالا۔ خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز تھے، حسن چشتی مجتبیٰ نواز۔ یہ بات میں پہلے بتا چکا ہوں کہ حسن چشتی حیدرآباد کے ہیں اور امریکہ میں آباد ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے امریکہ میں طویل قیام کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے، ورنہ کوئی غیر ملکی اتنے دن کسی مہمان کو برداشت نہیں کرتا۔

مجتبیٰ حسین کے اجداد نے اتنی تلوار بازی بھی نہیں کی ہوگی جتنی تیز رفتار انھوں نے قلم بازی کی۔ طبیعت کا سارا مزاحیہ پن قلم کی نذر ہوگیا، بارہ سال میں مزاحیہ مضامین کی چار کتابیں آگئیں۔ تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر اور بہرحال۔ رسوائی حیدرآباد سے نکل کر دہلی تک پہنچی اور دہلی میں اندر کمار گجرال تک پہنچ گئی۔ اللہ جانے اس مزاح نگار میں گجرال صاحب کو کیا نظر آیا کہ گجرال کمیٹی کے سنجیدہ کام میں مزاح نگار کو لگا دیا، جس کے یہاں کسی تحریر میں سنجیدگی نہیں تھی۔ پتہ نہیں گجرال صاحب مجتبیٰ حسین کو سنجیدگی کی طرف لانا چاہ رہے تھے یا گجرال کمیٹی کو غیر سنجیدگی کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ مجتبیٰ حسین تو دو سال بعد ہی وہاں سے این سی آر ٹی چلے گئے، تاکہ گجرال کمیٹی کے نتائج کا ان پر کوئی الزام نہ آئے۔ این سی آر ٹی میں ان کا تقرر بحیثیت ایڈیٹر ہوا تھا، جسے اردو میں مدیر کہتے ہیں۔ انھوں نے کچھ عرصہ روزنامہ ''سیاست'' میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کیا تھا، این سی آر ٹی والوں نے لفظ ایڈیٹر دیکھ کر اُن کا تقرر کرلیا ہوگا۔

مجتبیٰ حسین نے جب تک حیدرآباد میں رہے، مزاحیہ مضامین یا انشائیے اور کالم ہی لکھے۔ خاکہ اُڑانے یعنی خاکہ نگاری کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ شاید کنہیالال کپور اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں پر ایک ایک خاکہ لکھا تھا، لیکن دہلی آگئے تو مختلف النسل انسانوں سے اُن کی ملاقاتیں ہوگئیں۔ تعداد روز بروز بڑھتی گئی، ہر طبقہ کے لوگوں سے تعلقات بن گئے۔ ادیب، شاعر، دانشور پہلے سے ہی اچھے خاصے حلقۂ احباب میں تھے، اب سیاست داں اور افسر بھی ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین کو رشتے نبھانا آتا تھا، انھوں نے رشتوں میں پائیداری کے لیے باقاعدہ خاکہ نگاری شروع کردی، نتیجہ یہ ہوا کہ جس سے تعلقات نہیں بھی تھے اس نے خاکہ لکھوانے کی خواہش میں تعلقات استوار کرنے شروع کردیئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجتبیٰ صاحب کی دعوتیں کبھی گھر میں اور کبھی کافی ہاؤس میں ہونے لگیں۔ مجتبیٰ حسین نے بھی کسی کو مایوس نہیں کیا، خاکوں کے انبار لگا دیئے۔ پہلے ''آدمی نامہ'' آیا، پھر ''سو ہے وہ بھی آدمی''، اس کے بعد ''چہرہ در چہرہ'' اور ''ہوئے ہم دوست جس کے'' شائع ہوئے۔ قلم رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ کچھ خاکے ''آپ کی تعریف'' میں شامل ہوئے اور کچھ ''مہرباں کیسے کیسے'' کی زینت بنے۔ ابھی تو غیر مطبوعہ کی فہرست تیار ہوگی۔ دراصل مجتبیٰ حسین کو کسی کی دلآزاری منظور نہیں تھی۔ جس نے ہنس کے بات کی خاکہ اُسی پہ لکھ دیا۔ مجتبیٰ حسین کو خاکہ نگاری کا بڑا فائدہ ہوا۔ ممدوحین کی جانب سے واپسی تحفہ (Return Gift) بھی ملا، یعنی جس ناقد، شاعر، افسانہ نگار یا مزاح نگار پر خاکہ لکھا اس نے بلند اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی مزاح نگاری پر مضمون لکھ دیا۔ وہ چاہے آل احمد سرور ہوں یا شمس الرحمٰن فاروقی یا نثار احمد فاروقی یا گوپی چند نارنگ، کنور مہندر سنگھ بیدی ہوں یا شہریار، کرشن چندر ہوں یا خواجہ احمد عباس، مشتاق یوسفی ہوں یا احمد جمال پاشا، سب نے قلم کا قرض قلم سے اُتارا۔ مجتبیٰ حسین نے خاکہ لکھتے وقت کبھی ممدوح کی عمر کو نہیں دیکھا، اپنی عمر سے بیس سال بڑے کا بھی خاکہ لکھا اور اپنی عمر سے بیس سال چھوٹے کا خاکہ بھی تحریر کیا۔ جسے بہت زیادہ دیکھا اس پر بھی لکھا اور جسے ایک دو بار دیکھا اس کو بھی نوازا، کسی کو مایوس نہیں کیا۔ ایسے فراخ دل، فیاض اور سخی خاکہ نگار کی اردو میں دوسری مثال نہیں ملتی۔ بعض حاسدین نے تو یہاں تک مشہور کردیا کہ مجتبیٰ حسین کان پر قلم لے کر گلیوں گلیوں گھوم کر آواز لگاتے ہیں:

''خاکے لکھوالو خاکے۔ ہر قماش کے لوگوں کے، چھوٹے بڑے ادیبوں کے، سستے اور ٹکاؤ۔''

ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اپنا خاکہ لکھوانے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ اردو میں حاسدین کی کمی نہیں ہے، خود کبھی ایک پیراگراف نہیں لکھیں گے، لیکن دوسروں کی کتابیں دیکھ کر جل جل کر کوئلہ ہوجائیں گے، اُن کی دانست میں سوائے اُن کے سب جاہل ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے کبھی ایسے لوگوں کی پرواہ نہیں کی۔ اپنے قلم کی سیاہی کو خشک نہیں ہونے دیا، اسی لیے آج وہ صف اوّل کے ادیبوں میں شامل ہیں۔

اردو کے طنز و مزاح کے شعراء کے بارے میں جب خیال آتا ہے تو عجیب عجیب شکلیں ذہن میں اُبھر کر آتی ہیں، لیکن طنز و مزاح کے نثر نگاروں کو دیکھئے، سوٹ بوٹ میں دکھائی دیتے ہیں۔ یقین ہی نہیں ہوتا کہ اتنے اچھے عہدوں پر رہنے والے معقول خوش پوش لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہوں گے، اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی کے ظاہر پر نہ جاؤ باطن دیکھو۔ فرحت اللہ بیگ ہوں یا رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری ہوں یا ابن انشا، مشتاق یوسفی ہوں یا احمد جمال پاشا، شکل و صورت سے مزاح نگار لگتے ہی نہیں تھے۔ مجتبیٰ حسین بھی ایسے ہی تھے، کوٹ پینٹ پہن کر سر پر خود لگا کر جب اسکوٹر کو دہلی کی سڑکوں پر دوڑاتے تھے تو لگتا تھا کہ بحر ظلمات میں گھوڑا دوڑا رہا ہے۔ آفتاب کی روشنی میں مجتبیٰ حسین کبھی گھر نہیں جاتے تھے۔ گھر جانے کے لیے چاند کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا، دن بھر کہیں رہیں، سوتے اپنے بستر پر ہی تھے، یعنی صبح کا اُجالا رات کو گھر ضرور آجاتا تھا۔ تمام دن خدمت خلق یا ضیافت دوستاں میں مصروف رہتے تھے۔ دوستی بنانے کا بہت شوق تھا، پھر اُن کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ دراصل اُن کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہوگئے تھے، جو ضرورت مندوں کی مدد میں کام آتے تھے۔ تعلقات بنانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کسی غیر کا بھلا ہوجائے۔ وہ لوگوں کی اتنی مدد کرتے تھے کہ انھیں یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ کب، کہاں اور کیوں کس کی مدد کی تھی۔ اس معاملے میں ان کا حافظہ بہت کمزور تھا لیکن خاکہ لکھتے وقت

ممدوح کی شادی سے لے کر تجہیز و تکفین تک کی ایک ایک بات یاد آجاتی تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مجتبیٰ حسین نے کچھ مدت دہلی میں گزاری، لیکن دہلی میں شاید زندہ دل لوگوں کی تعداد کم ہورہی تھی یا زندہ دلی میں کمی آگئی تھی، اسلیے واپس زندہ دلانِ حیدرآباد میں جانے کا فیصلہ کرلیا اور دوبارہ روزنامہ ''سیاست'' میں کالم لکھنا شروع کردیے۔ دہلی میں ملازمت کرنے والے تمام مہاجرین اگر ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن واپس چلے جایا کریں تو دہلی خوبصورت شہر بن سکتا ہے۔ لیکن یہاں تو جو ایک بار آتا ہے کشتیاں جلا کر آتا ہے۔ اسی لیے دہلی کی پریشانیاں اور آبادی دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ کاش مجتبیٰ حسین کی طرح دیگر مہاجر ملازمین بھی سمجھ دار ہوجائیں۔ ہم کسی سے کیا کہیں، ہم خود دہلی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے۔ مجتبیٰ حسین حیدرآباد میں رہے یا دہلی میں یا پھر حیدرآباد میں۔ انھوں نے اپنے قلم اور قلمدان نہیں چھوڑے، نہ اس کی سیاہی کو خشک ہونے دیا۔ انھوں نے خوب اور خوب سے خوب تر لکھا، اس لیے بھی کہ ان سے اور کوئی کام آتا بھی نہیں تھا۔ اپنی چوراسی سالہ زندگی میں 58 سال مزاحیہ قلم کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ اس دوران کبھی کوئی سنجیدہ تحریر نہیں لکھی۔ سامعین اور قارئین ان کی سنجیدہ باتوں کو بھی غیر سنجیدہ اور مزاحیہ سمجھتے تھے۔ بیشتر لوگ ان کے سامنے محتاط ہوکر بولتے بھی تھے اور رہتے بھی تھے، اس خوف سے کہ کہیں کوئی لغزش ہوئی تو مجتبیٰ حسین خاکہ میں شامل کردیں گے۔ اتنا تو لوگ اللہ میاں سے بھی نہیں ڈرتے جتنا خاکہ نگار سے ڈرتے ہیں۔ بلاوجہ لوگ مجتبیٰ حسین جیسے خوش اخلاق اور خوش مزاج خاکہ نگار سے ڈرتے تھے۔ شاید انھیں یہ خوف زیادہ رہتا تھا کہ کہیں ہمارا خاکہ روزِ محشر فرشتوں کے ہاتھ نہ لگ جائے اور اس کی بنیاد پر فیصلہ ہو۔ خاکہ نگار مجتبیٰ حسین اب خود خاک پوش ہیں اور ان سے پوچھا جارہا ہے کہ جب خالق نے آدمی کا گوشت پوست کا خاکہ تیار کردیا تھا تو تمھیں قلمی خاکہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے مزاحیہ طرز بیان سے ضرور فرشتوں کو محظوظ بھی کریں گے اور مرعوب بھی۔ ہوسکتا ہے عالمِ ارواح میں خاکہ نگاری کی دوسری باری کی ابتدا ہوجائے۔ ہم تو دعا ہی کرسکتے ہیں کہ اللہ وہاں بھی اُن کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

ناموں کے نشاں

شاہد انوار

(کراچی)

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

(حیدر علی آتش)

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

(چراغ حسن حسرت)

جذبِ عشق سلامت ہے تو ان شاءؔ
کچے دھاگے سے چلیں آئیں گے سرکار بندھے

(انشاءاللہ خان انشاء)

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستین کا

(امیر مینائی)

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزاں دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(شیخ ابراہیم ذوق)

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(مرزا غالب)

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھ ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

(داغ دہلوی)

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

(فدوی لاہوری)

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

(میر طاہر علی رضوی)

موت برحق مگر پہلے عشق

گارسیامارکیز
- ترجمہ -
ظفرقریشی (نیویارک)

''ایک صدی کی تنہائی'' نامی ناول کے خالق گیبریئل گارسیامارکیز ۱۹۲۷ء میں کولمبیا میں پیدا ہوئے۔ وہ خود کو صحافی اور ادیب کہتے تھے۔ ان کی تحریروں کا دنیا کی تقریباً تمام ہی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انہیں ۱۹۸۲ء کا نوبل انعام برائے ادب ملا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام انہوں نے میکسیکو میں گزارے۔ میکسیکو میں وہ اپنی بیوی مرسیڈیز بارچا اور دو بچوں اور پانچ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ رہتے رہے ہیں۔

☆

سینیٹر اونیسیمو سانچز (Senator Onesimo Sanchez) کو اس کے ڈاکٹروں نے پیشن گوئی کے طور بتایا تھا کہ وہ چھ ماہ اور گیارہ دن مزید زندہ رہ سکے گا۔ یہ اطلاع اس نے ایک تلخ لیکن ناگزیر حقیقت کے طور پر قبول کر لی تھی لیکن اپنی زندگی کے اس آخری حصے میں اسے ایک عورت ملی جس سے اسے عشق ہو گیا تھا۔ اس عورت سے سینیٹر کی ملاقات روز ال ڈیل ویرے (Rosal Del virrey) نامی گاؤں میں ہوئی تھی جو ایک ریگستان کے کنارے پر واقع تھا۔ دراصل گاؤں کے آگے ایک بندرگاہ تھی اور بندرگاہ کا تعلق گاؤں سے تھا۔ دن بھر گاؤں میں خاموشی چھائی رہتی۔ لوگوں کی نظر میں یہ گاؤں ایسا تھا جو عموماً خوابوں میں دکھائی دیتا ہے۔ بے آباد، سنسان اور اداس۔ اس گاؤں کی راتیں البتہ جاگ اٹھتی تھیں کیونکہ راتوں کو علاقے کے اسمگلر اپنی چھوٹی بڑی کشتیاں لے کر بندرگاہ میں لنگر انداز ہو جاتے تھے۔ دن کی کڑی دھوپ میں بندرگاہ گاؤں کی طرح اجاڑ اور ویران رہتی تھی۔ بندرگاہ ریگستان کے خاتمے پر شروع ہوتی تھی۔ اسے جس سمندر کا سامنا تھا وہ دور سے خشک میدان سا لگتا تھا۔ ایسا میدان جس کی کوئی سمت نہ ہو۔ پورا گاؤں انسانی تہذیب کے لیے ضرورت کی ہر چیز سے دور تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی صورتحال میں لوگوں کی تقدیر بدلنے کا اہل کوئی شخص کیوں ایسی جگہ رہنا چاہے گا۔ گاؤں کا نام بھی مضحکہ خیز تھا کیونکہ اس نام میں لفظ گلاب شامل تھا اور پورے گاؤں میں گلاب کا صرف ایک پودا یا جھاڑی تھی جس میں لگنے والا واحد پھول سینیٹر اونیسیمو سانچز کی جیکٹ میں لگا ہوا تھا۔ سینیٹر نے یہ پھول خود اپنے ہاتھ سے اپنی جیکٹ میں لگا رکھا تھا۔ اسی دوپہر کو سینیٹر کی ملاقات لاؤرا فارینا (Laura Farin) نامی ایک حسن کی دیوی دوشیزہ سے ہوئی تھی۔

سینیٹ کے انتخابات چار برس کی مدت کے بعد ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک روایت تھی کہ ہر چار برس بعد جو انتخابی گہما گہمی ہوتی تھی اس کا مرکزی نقطہ یقینی طور پر یہ گاؤں ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ چار برسوں کے وقفے کے بعد اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں سینیٹر کو چند دن کے لیے گاؤں میں رکنا پڑتا تھا۔ سینیٹر کی گاؤں میں آمد کے دن گاؤں میں میلے کا سماں ہو جاتا تھا لہٰذا اس دن سب سے پہلے میلے کے فنکاروں کی گاڑیاں آئیں۔ پھر مقامی ریڈ انڈین قبائل کے اجرتی تماش بینوں کے ٹرکوں پر ٹرک آئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو سینیٹر سانچز کی ہر انتخابی مہم کا حصہ ہوتے اور انہیں حاضری کی اجرت ادا کی جاتی کیونکہ یہ لوگ نہ صرف جلسوں اور جلوسوں کی رونق بڑھاتے بلکہ ان کی موجودگی سینیٹر سانچز کی مقبولیت بھی ظاہر کرتی۔ سینیٹر سانچز کا انتخابی جلوس مختلف شہروں اور گاؤں دیہات سے ہوتا ہوا جب اس مخصوص گاؤں تک پہنچتا تو یہ انتخابی مہم کا آخری حصہ ہوتا۔ سارا کھیل تماشا صبح گیارہ بجے سے ذرا قبل شروع ہوتا اور دو تین دن جاری رہتا۔ لاؤڈ اسپیکروں پر تازہ ترین اور مقبول گانے بجائے جاتے۔ جلوس میں بھانت بھانت کی موٹر گاڑیاں ہوتیں۔ سب سے نمایاں موٹر گاڑی سینیٹر سانچز کی تھی جو ''وزارتی گاڑی'' کہلاتی تھی۔

یہ موٹر گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تو تھی لیکن اس کی ٹھنڈک گویا گاڑی کے اندر معلق تھی اور سینیٹر اونیسیمو سانچز کو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بے چینی سے دوچار کر رہی تھی۔ گاڑی کے رکنے پر اس نے دروازہ کھولا اور جونہی ایک قدم باہر نکالا جہنم کی گرم ہوا کے ایک زبردست تھپیڑے نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ سینیٹر کی اصلی ریشمی قمیض اس کے پسینے میں یک لخت تر بتر ہو گئی۔ اس کا پسینہ بہت پتلی یخنی جیسا رنگ اختیار کر گیا تھا۔ اس شدید گرمی میں سینیٹر سانچز کو احساس ہوا کہ وہ نہ صرف عمر رسیدہ ہو گیا ہے بلکہ تنہائی اس کا مقدر بن گئی ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک وقت وہ تھا جب چالیس برس کی عمر میں اس نے گاٹن گن (Gottin Gen) یونیورسٹی سے میٹلر جیکل انجینئر (Metallurgical Engineer) کی اعزازی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ مطالعے کا شوق رکھتا تھا لیکن یہ شوق اس کے لیے منفعت بخش ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ لاطینی زبان کی نہایت برے ترجمے والی کتابیں انہماک سے پڑھا کرتا تھا۔ وہ کسی زمانے میں دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر دینے والی جرمن حسینہ کے ہمراہ ہنسی خوشی رہ رہے تھے لیکن ان سب سے زیادہ خوش وہ خود تھا یا کم از کم اس وقت تک خوش تھا جب تک اسے نہیں بتایا گیا تھا کہ اگلی کرسمس سے قبل وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر جائے گا۔

گاؤں میں آخری اور علاقے کے سب سے بڑے انتخابی جلسے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ سینیٹر سانچز نے سوچا کہ وہ تھوڑی دیر اس گھر میں آرام کرے گا جو خاص طور پر اس انتخابی مہم کے دوران اس کے استعمال کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر دراز ہونے سے قبل اس نے پینے کے پانی کے گلاس میں گلاب کا پھول جیکٹ سے نکال کر ڈال دیا۔ یہ پھول بڑا ہی سخت جان تھا۔ ریگستان پار کرنے کے سفر میں بھی وہ اسی طرح کھلا ہوا تھا اور مہک رہا تھا جیسے ابھی ابھی پودے سے علیحدہ کیا گیا ہو۔ پھر اسے دوپہر کے کھانے کا خیال آیا۔ اس نے کچھ دلیہ نکال کر کھایا اور درد کی شدت کم کرنے والی چند گولیاں

پھانک لیں کہ جب درد اٹھے تو پیٹ میں دوا موجود ہو۔ کمرے میں بجلی کا پنکھا رکھا تھا۔ اس نے پنکھا چلایا اور اپنے تمام کپڑے اتار کر لیٹ گیا کہ عریاں حالت میں لیٹنے کے لیے اسے کم از کم پندرہ منٹ تو ملیں۔ سینیٹر سانچز کی شعوری کوشش تھی کہ وہ اپنے اطراف کے حوالے سے کمرے میں موجود ہر شے کو توجہ سے دیکھے لیکن ذہن کو بھٹکنے اور اپنے آخری وقت کے بارے میں سوچنے سے روکے۔ بے فکری سے اونگھنے کا یہ طریقہ اس نے بہت کوشش کے بعد سیکھا تھا۔ اِدھر ڈاکٹروں کے سوا کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اسے ایک مخصوص معیاد کی سزا سنائی گئی ہے چنانچہ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جب تک زندہ ہے اپنی زندگی معمول کے مطابق گزارے گا اور تنہا اپنی سزا بھگتے گا۔ اس کے فیصلے میں غرور کا عنصر نہیں شرمندگی تھی۔

مختصر وقت تک اونگھنے کے بعد جب وہ تیار ہو کر باہر نکلا تو اسے احساس تھا کہ اپنی قوت ارادی پر اسے کنٹرول حاصل ہے۔ سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ کچھ آرام اور غسل کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کھدر کی سوتی پتلون اور بڑے بڑے پھولوں کے ڈیزائن والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ درد کو قابو میں رکھنے والی گولیوں نے اسے روحانی طور پر متوازن کر دیا تھا۔ موت کی تباہ کن پیشن گوئی نے اس کی توقع کے برعکس زیادہ اداس کیا تھا۔ انتخابی جلسے کے لیے بنائے گئے چبوترے پر چڑھتے ہوئے اسے ان لوگوں سے چڑ ہو رہی تھی جو اپنی خوش قسمتی کے لیے اس سے مصافحے کی غرض سے اپنے ہاتھ آگے بڑھا رہے تھے۔ اسے ان لوگوں سے ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی تھی جو کسی اور وقت جلسہ گاہ کے تپتے ہوئے میدان میں بمشکل کھڑے تھے، اس لیے کہ وہ ننگے پیر تھے اور مقامی انڈین قبیلے سے ان کا تعلق تھا۔ اس نے خیر مقدمی نعروں اور تالیوں کا ہاتھ اٹھا کر جواب دیا اور انہیں خاموش ہونے کے لیے کہا۔ تقریر شروع کرتے ہوئے وہ تقریباً غصے میں تھا۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا تو اس کا خطاب حرکات و سکنات سے عاری تھا۔ اس کی نظریں جلسہ گاہ کے سامنے موجود سمندر پر تھیں جو اس گرمی میں ٹھنڈی سانس لے رہا تھا۔ اس کی نپی تلی اور گہری آواز میں سمندر کا ٹھہراؤ تھا۔ لیکن وہ جو تقریر کر رہا تھا وہ اس سے قبل اتنی بار کر چکا تھا کہ سامعین کو لگتا نہیں تھا کہ وہ حقیقت بیانی کر رہا ہے۔ تقریر کے الفاظ بار بار دہرائے جانے کے سبب اسے ازبر تھے اور اثر نہیں رکھتے تھے۔

''ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں قدرت کو شکست دینا ہے''

اس نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے الفاظ پر یقین نہیں تھا۔ ''ہم اپنے ہی ملک میں خدا کی ننگی بھوکی سرزمین پر یتیموں کی طرح نہیں رہیں گے۔ خواتین اور حضرات ہم ایک مختلف قسم کے لوگ ہوں گے۔ ہم عظمت کے متلاشی پُرمسرت لوگ ہوں گے۔''

اس کا انتخابی جلسہ کیا تھا، اچھا خاصا کھیل تماشے کا سرکس تھا۔ جب وہ تقریر کر رہا تھا تو اس کے حامیوں اور ملازمین نے کاغذی پرندے فضا میں اچھالنے شروع کر دیے۔ فضا میں جونہی یہ پرندے پہنچتے، یوں لگتا تھا جیسے انہیں زندگی مل گئی ہے اور وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے جلسہ کے میدان کا طواف کرتے اور پھر سب کے سب اکٹھے ہو کر سمندر کا رخ کرتے۔ عین اس وقت جلسے کے حاضرین کے پیچھے کھڑے اس کے ملازمین ٹرکوں سے گتے اور کپڑے کے نقلی درخت نکال کر کولتار کے میدان میں اس طرح لگا دیتے کہ یوں لگتا کہ آناً فاناً ایک جنگل اُگ آیا ہے۔ اس جنگل کے آگے گتے کے خوبصورت، سرخ رنگ کی اینٹوں کے گھر، شیشے کی کھڑکیوں کے ساتھ بالکل اصلی گھر لگتے۔ یہ گھر ان کی اصلی غربت زدہ اور مفلوک الحال جھگیوں کو چھپا لیتے۔

سینیٹر اپنی تقریر میں جان ڈالنے کے لیے لاطینی الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتا جاتا تا کہ لوگ اس کے پیدا کردہ سراب میں کچھ دیر اور کھوئے رہیں۔ وہ اپنی تقریر میں بارش لانے والی مشینیں فراہم کرنے کے وعدے کرتا۔ وہ کہتا کہ میں ایسی مشینیں متعارف کروا سکتا ہوں جو مرغیوں کے انڈوں سے جلد بچے نکالنے کی اہل ہوتی ہیں۔ وہ کہتا کہ اس کے پاس خوشبیوں اور جولانیوں کے ایسے تیل ہیں جو بنجر زمین سے سبزیاں تر کاریاں اُگانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

وہ جب دیکھتا کہ اس کا کارکن گتے پر چپکے، رنگا رنگ چھپے ہوئے کاغذ کی فرضی دنیا کھڑی کر چکے ہیں، تب وہ اپنی انگلی سے اس فرضی دنیا کی طرف اشارہ کر کے کہتا: ''خواتین حضرات، وہ دیکھو، وہ رہی ہمارے مستقبل کی دنیا۔''

جلسے کے حاضرین پلٹ کر دیکھتے تو انہیں گتے کے گھروں اور سرسبز جنگل کے درختوں کے پیچھے، سمندر کی جانب گتے کا ایک بڑا بحری جہاز دکھائی دیتا۔ یہ جہاز مصنوعی شہر کی سب سے اونچی عمارت سے بھی اونچا دکھائی دیتا ہے۔ جلسے کے حاضرین یہ جعلی خواب دیکھ کر خوش ہوتے۔ خود سینیٹر بھی اس حقیقت سے واقف تھا کہ قریہ قریہ، شہر شہر، گاؤں گاؤں اور دیہات دیہات چکر لگانے کے عمل میں اکھاڑ پچھاڑ کے نتیجے میں گتے کے خوابناک شہر کی چمک دمک ماند پڑنے لگی ہے۔ مکانوں کے کونے، درختوں کے پتے اور شاخیں اور بحری جہاز کے عرشے کی تام جھام ٹوٹ رہی ہے۔ اور پھر موسم کی انتہا پسندی نے اس فرضی دنیا کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ گتے، گاؤں اتنا ہی پرانا، گرد آلود اور سالخوردہ دکھائی دے رہا ہے جتنا روزال ڈیل ویرے نامی اصلی گاؤں تھا۔

بارہ برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ نیلسن فارینا (Nelson Farina) سینیٹر کا خیر مقدم کرنے والوں میں شامل نہیں تھا تاہم اس وقت وہ اپنے گھر کے ایک ٹھنڈے حصے میں بیٹھا، لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہونے والی سینیٹر کی تقریر سن رہا تھا یا دوسرے الفاظ میں اونگھ رہا تھا اور تقریر سن رہا تھا اور اپنی نیند پوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ گھر اس نے اپنے فارماسسٹ والے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ان ہی ہاتھوں سے اس نے اپنی پہلی بیوی کو قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا اور پھر اسے اپنے آبائی جزیرے جوڈیولز آئی لینڈ (Devil's Island) یا شیطانی جزیرہ کے نام سے مشہور تھا، اس کے قبرستان میں دفن کیا تھا۔ پہلی بیوی کو قتل کرنے کے بعد وہ شیطانی جزیرہ سے فرار ہو کر روزال ڈیلی ویرے نامی ایک گاؤں میں بس گیا تھا۔

روزال ڈیلی ویرے کے ساحل تک وہ ایک بحری جہاز سے پہنچا تھا۔

اس بحری جہاز پر اس کے ہم سفر ہزاروں رنگ برنگے معصوم میکاؤ طوطے (Macaw Parrots) اور وہ خوبصورت کافرادا کالی عورت تھی جو اسے پیراماری بو (Paramaribo) میں ملی تھی۔ اس عورت سے اس کی ایک بیٹی تھی۔

اس عورت کا حشر نیلسن فارینا کی پہلی بیوی جیسا نہیں ہوا کیونکہ اسے فطری موت نصیب ہوئی تھی۔ روزال ڈیل ویرے پہنچنے کے بعد وہ بیمار ہو کر چل بسی تھی۔ لوگوں کے مطابق پہلی بیوی کے گوشت کے ٹکڑے اس کی کھاد بن گئے تھے جس کی کاشت خود اس عورت نے بڑے شوق سے کی تھی۔ تاہم اس کا پورا ڈھانچا بمعہ ڈچ (Dutch) نامی شیطانی جزیرے کے قبرستان کی زینت بنا تھا۔ اس کی بیٹی کو ورثے میں اس کا حُسن، رنگ روپ اور جسمانی خطوط اور باپ کی پیلی پیلی آنکھیں جو دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی تھیں، ملی تھیں۔ نیلسن فارینا کو بحیثیت باپ اس حقیقت کا علم تھا کہ جس بیٹی کو وہ پال پوس رہا ہے، بالغ ہونے پر دنیا کی حسین ترین عورت ہوگی۔

نیلسن فارینا کی سینیٹر اوفیسیو سانچز سے پہلی ملاقات اس کی پہلی انتخابی مہم کے دوران ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں نیلسن فارینا نے سینیٹر سے درخواست کی تھی کہ وہ ایک جعلی شناختی کارڈ کے حصول میں اس کی مدد کرے تاکہ وہ نیلسن فارینا قانون کے لمبے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکے۔ سینیٹر نے دوستانہ لیکن سخت انداز میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن نیلسن فارینا بھی کچی مٹی کا نہیں بنا ہوا تھا۔ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی اور برسوں اپنی درخواست دہراتا رہا۔ جب بھی اسے سینیٹر سے ملاقات کا موقع ملتا وہ ایک مختلف طریقے سے اپنی درخواست کا اعادہ کر دیا کرتا لیکن اس مرتبہ نیلسن فارینا نے گھر سے نکلنا بھی گوارا نہ کیا اور دو درختوں کے تنوں سے ایک چادر باندھ کر ایک جھولا سا بنا کر ان ہی درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں پڑ گیا۔ اس جھولے یا Hammock میں لیٹ کر اس نے دل میں سوچا کہ میں یہاں اس جہنم میں ٹھیک ہوں، اسے بحری قزاق اور چور، لٹیرے اور ڈاکو لاکھ جنت قرار دیں لیں۔ سینیٹر کی تقریر کے اختتام پر جب تالیاں بجیں تو وہ سمجھ گیا کہ تقریر ختم ہوگئی ہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گتّے کے جنگل کا پچھلا حصہ جو کھپچیوں کے سہارے کھڑا تھا، اسے نہایت بدنما اور بھدا لگا۔ ادھر گتّے کے بحری جہاز کو پٹڑی پر آگے پیچھے کرنے والے مزدور اپنے کام میں مصروف تھے۔ نیلسن فارینا کو یہ منظر بھی اچھا نہیں لگا۔ اس نے زیرِ لب ''حرامزادہ'' کہا اور منہ میں جمع لعاب کو تھوک کر ''سیاسی بازیگری!'' کہا اور آنکھیں بند کر کے پھر لیٹ گیا۔

روایت یہ تھی کہ تقریر کے بعد سینیٹر کو شہریوں سے ملانے کے لیے گلیوں اور محلوں میں گھمایا جاتا۔ چنانچہ اہم شہریوں کا ایک گروہ سینیٹر کے گرد جمع ہو گیا اور سب مل کر ایک قریبی گلی میں داخل ہوئے۔ گروہ آگے بڑھتا رہا اور گروہ کے سرکردہ افراد سینیٹر کو شہریوں کو درپیش مسائل سے آگاہ کرتے رہے۔ سینیٹر مسکراتے ہوئے خوش دلی کے ساتھ ان کے مسائل سن کر سر ہلاتا رہا گویا اس کا کام سننا اور سر ہلانا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سینیٹر کے جواب ایسے ہوتے تھے کہ لوگ مطمئن ہو جاتے تھے گویا اسے کسی کا مطالبہ پورا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سینیٹر کو گاؤں کے لوگ اپنے نرغے میں لیے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک عورت نے جو اپنے چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ چھت پر کھڑی تھی، اپنی نمایاں اور اونچی آواز میں کہا:

''سینیٹر۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے بس ایک گدھا درکار ہے جو میں کنویں سے پانی نکالنے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہوں!'' آتش بازی کے دھماکوں اور لاؤڈ اسپیکروں سے نشر ہونے والی موسیقی کے باوجود عورت کا مطالبہ نیچے سینیٹر اور اس کے میزبان گروہ تک واضح طور پر پہنچ گیا۔ سینیٹر نے گردن گھما کر عورت اور اس کے دبلے پتلے، فاقہ زدہ بچوں کو دیکھا اور پوچھا:

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

''وہ اپنی قسمت آزمانے عروبہ (Aruba) جزیرے کی طرف چلا گیا ہے۔'' عورت نے مسکراتے ہوئے ایک بار پھر اونچی آواز میں جواب دیا:

''وہاں اسے ایک غیر ملکی عورت مل گئی۔ وہی جو اپنے دانتوں پر ہیرے لگا لیتی ہیں!''

عورت کا جواب سن کر سینیٹر اور اس کے ساتھ موجود گروہ کے افراد ہنس پڑے۔

''ٹھیک ہے۔'' سینیٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:

''تمہیں گدھا مل جائے گا۔''

کچھ دیر بعد جب سینیٹر گاؤں کے زعماء کے ساتھ گاؤں کے مختلف علاقے دیکھ رہا تھا اس کے ایک ملازم نے اسے بتایا کہ ایک مضبوط قسم کا نوجوان گدھا عورت کے گھر پہنچا دیا گیا ہے۔ گدھے کے پچھلے حصے پر ''سینیٹر کی انتخابی مہم کی جناب سے ایک حقیر تحفہ'' پکی روشنائی سے درج تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی کبھی نہ بھولے کہ یہ گدھا تحفے میں دیا گیا ہے اور سینیٹر سانچز نے دیا ہے۔

اپنے دورے میں سینیٹر نے انسانی ہمدردی کے متعدد چھوٹے موٹے اور کام بھی کیے ایک غریب بیمار شخص کو اپنے ہاتھ سے دوا چمچ میں ڈال کر پلائی۔ بیمار آدمی کے گھر والوں نے اس کی چارپائی گھر کے دروازے پر لا کر رکھ دی تھی تاکہ سینیٹر کی طرف سے انسانی ہمدردی کے مظاہرے کو پورا گاؤں دیکھ لے۔ جب سینیٹر اور اس کے ساتھ چلنے والے آخری موڑ پر پہنچے تو ایک گھر کی باڑھ کے پیچھے سینیٹر کو نیلسن فارینا کا شناسا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور شکل سے وہ بیمار نظر آ رہا تھا۔ سینیٹر نے اس کو پہچان کر ہاتھ ہلا دیا۔ اپنی اس حرکت میں اس نے کوشش کی کہ نیلسن فارینا کو غلط فہمی بھی نہ ہو کہ وہ اس کی بیماری پر ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے۔

''کیسے ہو؟'' سینیٹر کا لہجہ قطعی غیر جانبدارانہ تھا۔ نیلسن فارینا نے اپنے چہرے کو مزید غمزدہ اور بیمار بنا لیا اور کہا:

''آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں کتنا ٹھیک ہوں!''

درجنوں لوگ اس وقت نیلسن فارینا کے گھر کے سامنے تھے۔ یہ لوگ سینیٹر کے گاؤں کے دورے کی وجہ سے اس کے ساتھ تھے۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کے سبب وہاں شور بھی ہو رہا تھا۔ لوگوں کی آوازیں سن کر نیلسن فارینا کی بیٹی جو گھر

کے اندر تھی باہر نکل آئی۔ وہ اس وقت مقامی انڈین قبیلے کا لباس گواجیرو (Guajiro) پہنے تھی۔ تیز دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے اپنے چہرے پر ایک خاص قسم کا تیل لگا رکھا تھا۔ اس کی حالت اس وقت ایک ایسے کھنڈر کی سی تھی جو ذرا سی مرمت کے بعد چمکنے لگتا ہے چنانچہ اس کے گھر کے سامنے جتنے لوگ جمع تھے، ان میں سے جس جس نے اسے دیکھا دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔ سب نے اپنے اپنے طور پر خود سے کہا کہ ایسا حُسن پوری دنیا میں نہ ہوگا۔ سینیٹر کی حالت اس کے ساتھ موجود تمام لوگوں سے خراب تھی۔ اس کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ ''خدا کی قسم!'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر نیلسن فارینا کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے زیرلب کہا: ''ایسے خدا تو اپنے فیصلوں سے کبھی کبھی تباہی پھیر دیتا ہے!''

اس رات نیلسن فارینا نے اپنی بیٹی کو بہترین لباس زیب تن کرنے کی تلقین کی اور جب وہ تیار ہوگئی تو اسے سینیٹر سے ملنے کے لیے اس کے عارضی گھر میں بھیج دیا۔ گھر کے باہر دو مسلح گارڈ گرمی میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ محافظوں کے حکم پر وہ وہیں رکھی ہوئی تیسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

سینیٹر برابر والے کمرے میں روزانہ ڈیلی ویرے کے اہم قائدین سے گفتگو میں مصروف تھا۔ گاؤں کے زعماء سے یہ ملاقات اسی کی درخواست پر ہو رہی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سینیٹر ان لوگوں کے سامنے وہ حقائق رکھنا چاہتا تھا جن کا ذکر اس نے اپنی تقریر میں نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ مجموعی طور پر ان تمام لوگوں جیسے تھے جن سے وہ ریگستان کے دیگر گاؤں دیہات میں، اپنی ہر انتخابی مہم کے اختتام پر ملا کرتا تھا ویسے یہ بات اور تھی کہ سینیٹر ان کو دل سے ناپسند کرتا تھا۔ انتخابی مہم کے اختتام پر ہونے والی یہ ملاقات اسے لگتا تھا کہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ اس کی قمیض پسینے میں شرابور ہوگئی تھی تاہم اس کی کوشش اور خواہش تھی کہ کمرے میں موجود واحد بجلی کا پنکھا جو گرم ہوا پھینک رہا تھا، اس کی قمیض اسی گرم ہوا سے آخر کار خشک ہوگئی تھی۔ فی الحال صورت حال یہ تھی کہ کمرے میں اتنے لوگوں کی موجودگی بھی گرمی میں اضافے کا سبب تھی۔ پنکھا بے اعتنائی کے ساتھ نہ صرف گھوم رہا تھا کہ بلکہ ''زوں زوں'' کی بھنبھناہٹ والی ویسی ہی آواز نکال رہا تھا جیسی گھوڑوں کی مکھیاں نکالتی ہیں۔

حضرات! ہم یقیناً کاغذی پرندے نہیں کھا سکتے!'' سینیٹر نے کہا۔ اس کی آواز میں خفگی تھی۔ ''آپ جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ بکریوں کی مینگنیوں سے بھرپور اس علاقے کے چشموں کے پانی میں جب کیڑے نہیں ہوں گے اور ان کی جگہ صحت بخش معدنیات ہوں گی تو اس صورت میں نہ میرے پاس کچھ کرنے کے لیے ہوگا اور نہ آپ لوگوں کے پاس۔ اس علاقے میں درخت ہوں گے اور پھولوں والے پودے ہوں گے۔ کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں آ رہی ہے؟'' وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے سینیٹر کی بات کا جواب نہیں دیا۔

بات کرتے ہوئے سینیٹر نے ایک کیلنڈر کا ایک مہینے کا صفحہ پھاڑا اور اسے تہہ در تہہ موڑ کر تتلی کی شکل دے دی اور پھر اس تتلی کو یونہی کسی مخصوص سمت کا نشانہ لے کر بھیجنے کے بجائے چھت کی طرف اچھال دیا پنکھے کی گرم ہوا سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے تتلی کمرے میں جمع لوگوں کے سروں کے اوپر چند لمحوں کے لیے منڈلاتی رہی اور پھر کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ دریں اثنا سینیٹر کی اس چھوٹے سے اجتماع سے گفتگو جاری رہی۔ اس گفتگو کے دوران سینیٹر کو احساس تھا کہ اس کا دھیان موت کے حوالے سے پیشن گوئی کی طرف تھا جس کی وجہ سے اس کی گفتگو میں تحمل کا عنصر غالب تھا۔

''چنانچہ ۔۔۔'' سینیٹر نے کہا۔ ''جو بات آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں، اسے میں دہرانا ضروری نہیں سمجھتا۔ لیکن پھر بھی میں احتیاطاً کہوں گا کہ آنے والے انتخابات میں میری کامیابی میں آپ سب کا زیادہ مفاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آلودگی والے پانی سے اور مقامی انڈین باشندوں کے پسینے سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ آپ لوگوں کی بات دیگر ہے، آپ دونوں ہی چیزوں سے منافع کمار ہے ہیں۔''

کرسی پر بیٹھی لاؤرا فارینا (Laura Farina) نے دروازے میں سے تتلی کو نکلتے دیکھا۔ دونوں مسلح محافظ اونگھنے کے بہانے اب باقاعدہ سو رہے تھے اور رائفلیں ان کی گود میں تھیں۔

کھلی فضا میں اِدھر اُدھر ڈولنے کے بعد تتلی کی تہیں کھلی اور پورا صفحہ ایک دیوار سے جا چپکا۔ لاؤرا فارینا نے تتلی کے کاغذ کو اپنے ناخنوں سے کھرچ کر یا کرید کر دیوار سے علیحدہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس عرصے میں ایک محافظ کمرے کے اندر سے باہر آنے والی تالیوں کی آوازوں سے جاگ گیا تھا۔ اس کو جدوجہد کرتے دیکھ کر اس نے غنودگی کے عالم میں کہا:

''یہ تتلی دیوار سے نہیں اترے گی۔ کسی مصوّر نے یہ دیوار پر بنائی ہے۔''

لاؤرا فارینا نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوبارہ اسی کرسی پر بیٹھ گئی جس پر اتنی دیر سے بیٹھی ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد سینیٹر کی میٹنگ ختم ہوئی اور لوگ ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ آخری مہمان کو رخصت کر کے سینیٹر اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر رہا تھا کہ اس کی نظر محافظوں کے کیبن میں بیٹھی لاؤرا فارینا پر پڑی۔ ''تم ۔۔۔ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' لاؤرا فارینا نے اس کے سوال کا جواب فرانسیسی زبان میں دیا ''مجھے آپ سے ملنے کے لیے بھیجا گیا۔''

سینیٹر بات سمجھ گیا تھا۔ اس کے دونوں محافظ دروازے پر تھے۔ سینیٹر نے اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی پھر اس نے غور سے لاؤرا فارینا کو دیکھا۔ اس کے غیر معمولی حسن کو سامنے پا کر وہ اپنی تمام تر تکالیف بھول گیا تھا۔ اور اس وقت سینیٹر کی ممکنہ یقینی موت نے اس کے لیے ایک فیصلہ کر دیا تھا۔

''اندر آ جاؤ!'' اس نے لاؤرا فارینا کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

لاؤرا فارینا کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے وہ رک گئی۔ اسے اپنے راستے میں ہزاروں ڈالروں کے نوٹ کاغذی تتلی کی طرح اڑتے دکھائی دیئے۔ سینیٹر نے آگے بڑھ کر بجلی کا پنکھا بند کر دیا۔ ہوا کے بند ہوتے ہی ڈولتے نوٹ کمرے میں پھیلی اشیا پر گر گر کر ساکت ہوگئے۔

''دیکھا تم نے؟ ایک بے وقعت چیز بھی اُڑ سکتی ہے!'' سینیٹر نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

لاؤرا فارینا کو کمرے میں بیٹھنے کے لیے ایک تپائی ملی جو اسکول کے بچوں کو بٹھانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لاؤرا فارینا کی جلد رواں، چکنی اور جھریوں سے پاک تھی۔ اس کی رنگت خام تیل جیسی تھی، اس کے بال نوجوان گھوڑیوں جیسے تھے اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں روشن قمقموں سے زیادہ روشن تھیں۔ سینیٹر نے دیکھا کہ لاؤرا فارینا کی نظریں آخر کار پانی کے گلاس میں پڑے گلاب کے پھول پر ٹک گئی تھیں جس کی تازگی کو علاقے میں پھیلی قلمی شورے کے بخارات (Salt Petre) نے ماند کر دیا تھا۔ ''یہ گلاب ہے!'' سینیٹر نے کہا۔

میں جانتی ہوں۔ ریوحاچا میں مجھے بتایا گیا تھا کہ اس پھول کو کیا کہتے ہیں۔'' لاؤرا فارینا نے کہا۔

سینیٹر اپنے رکھے گئے فوجی پلنگ (Cot) پر بیٹھ گیا۔ گلاب کے مختلف پھولوں کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی قمیض کے بٹن کھول رہا تھا۔ اس عمل کے دوران اس نے قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر دل کے قریب اس نشان پر انگلی پھیری جو بحری قزاقوں کے جہاز پر کام کرنے والے ملاح اکثر اپنے سینے پر گودواتے ہیں۔ وہ نشان دل کا ہوتا ہے جس میں تیر پیوست دکھایا جاتا ہے۔

سینیٹر نے اپنی قمیض اتار کر فرش پر ڈال دی اور لاؤرا فارینا سے کہا کہ وہ جوتے اتارنے میں اس کی مدد کرے۔ لاؤرا فارینا گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ کر اس کے ایک پیر کے جوتے کے تسمے کھولنے لگی۔ سینیٹر اس دوران اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس ملاقات کی بدقسمتی کس پیر کے حصے میں آئے گی۔

''تم تو ابھی بچی ہو!'' سینیٹر نے دفعتاً کہا۔

''یہ آپ کا خیال ہے!'' لاؤرا فارینا نے مسکراتے ہوئے کہا ''حقیقت یہ ہے کہ میں اپریل میں پورے انیس سال کی ہو جاؤں گی۔''

سینیٹر کی لاؤرا فارینا میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ ''اپریل کے کس دن؟'' اس نے پوچھا۔

''گیارہ تاریخ کو!'' لاؤرا فارینا نے جواب دیا۔

سینیٹر کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر آئی اور گزر گئی۔ ''ہم دونوں ایک ہی مہینے میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارا ستارہ ایک ہی ہے۔'' سینیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم تنہائی پسند ہیں۔''

دونوں جوتوں کے تسمے کھل گئے تھے۔ لاؤرا فارینا نے اس کی بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اب ان جوتوں کا کیا کرے۔ اپنی طرف سے سینیٹر کو قطعی علم نہیں تھا کہ وہ لاؤرا فارینا کے ساتھ کیا کرے گا۔ وہ اس اچانک قسم کی عشقیہ ملاقاتوں کا عادی نہیں رہا تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ سامنے جو لڑکی ہے وہ اس کی تباہی اور ذلت کا سبب بن سکتی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر لاؤرا فارینا کو اپنے گھٹنوں کے حصار میں مضبوطی سے جکڑ لیا اور اسے سے بغل گیر ہو کر اس طرح لیٹ گیا کہ لاؤرا فارینا اس کے اوپر تھی۔ وہ اب تذبذب کا شکار ہو رہا تھا۔ اسے سوچنے کے لیے چند لمحے درکار تھے۔ اس عالم میں اسے احساس ہوا کہ لاؤرا فارینا نے کوئی زیر جامہ نہیں پہن رکھا تھا۔ سینیٹر کو لاؤرا فارینا سے جنگلی جانوروں کی مہک آئی۔ دل ہی دل میں وہ خوفزدہ تھی اور اس کی جلد ٹھنڈے پسینے چھوڑ رہی تھی۔

''ہم سے کوئی محبت نہیں کرتا۔'' سینیٹر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔

لاؤرا فارینا نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ ہانپ رہی تھی اور ہانپنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ سینیٹر نے بستر میں اپنے بازو میں جگہ دی اور اس کی مدد کرنے کے لیے اٹھ کر لائٹ بجھا دی۔ اب کمرے میں صرف گلاب کا سایہ تھا۔

اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے لاؤرا فارینا نے اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اُدھر سینیٹر نے بہت آہستگی سے اور ہولے ہولے اپنے ہاتھ سے اسے سہلانا شروع کیا۔ وہ اسے چھو نہیں رہا تھا لیکن اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے اس جگہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں وہ درحقیقت تھی۔ سینیٹر کو حیرت ہوئی جب اس نے محسوس کیا کہ اس کی انگلیاں لوہے کی کسی چیز سے ٹکرائیں انگلیوں کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ ''یہ کیا چیز ہے؟'' اس نے لاؤرا فارینا سے پوچھا۔

''لوہے کا چھانگیہ ہے جو مقفل ہے'' لاؤرا فارینا نے کہا۔

''مقفل ہے؟ مگر کیوں؟'' سینیٹر نے غصّے میں سوال کیا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیا چیز تھی جو تالے سے بند کی گئی ہے۔

''اس کی کنجی کہاں ہے؟'' اس نے غصّہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

لاؤرا فارینا نے اطمینان کا سانس لیا اور بولی ''کنجی میرے پپا کے پاس ہے۔ میرے پپّا نے کہا تھا کہ جب آپ کو چابی کی ضرورت محسوس ہو تو آپ اپنا کوئی آدمی بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔ میرے پپّا نے یہ بھی کہا تھا کہ جب آپ چابی کے لیے کوئی آدمی بھیجیں تو اس کے ہاتھوں میں ایک تحریری وعدہ بھی بھیجیں کہ آپ ان کی قانونی صورتحال کو ٹھیک کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔''

سینیٹر کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی تنابیں کھینچ لی ہیں۔ ''حرامی، مینڈک کی اولاد'' سینیٹر نے زیر لب لاؤرا فارینا کے باپ کو گالی دی۔ پھر اس نے کمرے کی تاریکی میں خود کو پُرسکون کرنے کی غرض سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس تخلیئے میں اپنے آپ سے ملاقات کی۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ اس نے خود سے کہا تھا:

''یاد کرو کہ تم ہو یا کوئی اور، موت قریب ہی ہے اور پھر جلد ہی تمہارا نام بھی مٹ جائے گا۔'' یہ خیال اس کے جسم میں ایک جھرجھری پیدا کر گیا۔ جھرجھری کے اثر پر قابو پانے میں اسے کچھ لمحے لگے۔

''اچھا مجھے ایک بات تو بتاؤ'' اس نے لاؤرا فارینا سے پوچھا:

''میرے بارے میں تم نے کیا سنا ہے؟''

''بالکل سچ سننا چاہتے ہیں آپ؟''

''خدا کی قسم بالکل سچ!'' سینیٹر نے کہا۔ اب وہ سچ کا سامنا کرنے

کے لیے تیار تھا۔

''اچھا۔۔۔!'' لاؤرافارینا نے ''اچھا'' کو کھینچ کر لمبا کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو لوگ دوسرے سیاستدانوں سے زیادہ برا سمجھتے ہیں اس لیے کہ آپ ان سب سے مختلف ہیں۔''

لاؤرافارینا کے منہ سے اپنے لیے برائی سن کر سینیٹر ناراض نہیں ہوا۔ وہ کافی دیر تک خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی پوشیدہ ترین جبلت کو کہیں رکھ کر واپس آ گیا ہے۔

''لعنت ہے ساری باتوں پر'' اس نے فیصلہ کن انداز میں لاؤرافارینا سے کہا:

''اپنے حرامزادے، کتّے کی اولاد باپ سے کہنا کہ اس کے قانونی مسائل میں ٹھیک کر دوں گا۔''

''اگر آپ چاہیں تو میں جا کر چابی لا سکتی ہوں۔'' لاؤرافارینا نے کہا۔

سینیٹر نے اسے روک دیا۔ ''چابی کو بھول جاؤ۔ اگر ممکن ہو تو تھوڑی دیر میرے ساتھ سو جانا۔ کاٹ کھانے والی تنہائی میں کسی کا اتنا ساتھ بھی بہت غنیمت ہے!''

لاؤرافارینا نے سینیٹر کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اس وقت اس کی نظریں، پانی کے گلاس میں تیرتے ہوئے گلاب کے پھول پر تھیں۔ سینیٹر نے اسے کمر سے تھام رکھا تھا۔ اس کا منہ لاؤرافارینا کی بغل میں تھا جہاں سے اسے وہ بو آ رہی تھی جو اس نے اکثر جنگلی جانوروں سے برآمد ہوتی محسوس کی تھی۔ سینیٹر نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے آپ کو دہشت کے حوالے کر دیا۔ چھ ماہ اور گیارہ دن بعد وہ اسی حالت میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ جس حالت میں وہ مرا ایسی نہیں تھی کہ کہا جاتا کہ مرنے کے بعد اس نے نیک نامی کمائی۔ عوامی سطح پر وہ بدنام ہو گیا تھا کیونکہ اس کی میت سے، غصّے اور عشق میں مبتلا لاؤرافارینا چیخ چیخ کر روتی رہی کہ سینیٹر اسے تنہا چھوڑ کر مر گیا تھا۔ جب تک سینیٹر کی تدفین نہیں ہو گئی لاؤرا فارینا پاگلوں کی طرح دھاڑیں مار کر روتی رہی۔

۔۔۔ ویران بستیاں ۔۔۔

کہتے ہیں کہ ایک طوطا طوطی کا گزر ایک ویرانے سے ہوا،
ویرانی دیکھ کر طوطی نے طوطے سے پوچھا
''کس قدر ویران گاؤں ہے۔۔۔؟
''طوطے نے کہا لگتا ہے یہاں کسی الو کا گزر ہوا ہے''
جس وقت طوطا طوطی باتیں کر رہے تھے،
عین اس وقت ایک اُلو بھی وہاں سے گزر رہا تھا،
اس نے طوطے کی بات سنی اور وہاں رک کر ان سے مخاطب ہو کر بولا،
تم لوگ اس گاؤں میں مسافر لگتے ہو،
آج رات تم لوگ میرے مہمان بن جاؤ،
میرے ساتھ کھانا کھاؤ،
اُلو کی محبت بھری دعوت سے طوطے کا جوڑا انکار نہ کر سکا اور انہوں نے اُلو کی دعوت قبول کر لی،
کھانا کھا کر جب انہوں نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی،
تو اُلو نے طوطی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔۔۔
تم کہاں جا رہی ہو
طوطی پریشان ہو کر بولی یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے،
میں اپنے خاوند کے ساتھ واپس جا رہی ہوں۔۔۔،
الو یہ سن کر ہنسا۔۔۔
اور کہا۔۔۔
یہ تم کیا کہہ رہی ہو تم تو میری بیوی ہو۔
اس پہ طوطا طوطی الو پر جھپٹ پڑے اور گرما گرمی شروع ہو گئی،
دونوں میں جب بحث و تکرار زیادہ بڑھی تو اُلو نے طوطے کے کے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا
''ایسا کرتے ہیں ہم تینوں عدالت چلتے ہیں اور اپنا مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں،
قاضی جو فیصلہ کرے وہ ہمیں قبول ہو گا''
اُلو کی تجویز پر طوطا اور طوطی مان گئے اور تینوں قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے،
قاضی نے دلائل کی روشنی میں اُلو کیحق میں فیصلہ دے کر عدالت برخاست کر دی،
طوطا اس بے انصافی پر روتا ہوا چل دیا تو اُلو نے اسے آواز دی،
''بھائی اکیلے کہاں جاتے ہو اپنی بیوی کو تو ساتھ لیتے جاؤ''
طوطے نے حیرانی سے اُلو کی طرف دیکھا اور بولا
''اب کیوں میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو،
یہ اب میری بیوی کہاں ہے،
عدالت نے تو اسے تمہاری بیوی قرار دے دیا ہے''
اُلو نے طوطے کی بات سن کر نرمی سے بولا،
نہیں دوست طوطی میری نہیں تمہاری ہی بیوی ہے۔۔۔
میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ بستیاں الو ویران نہیں کرتے.
بستیاں تب ویران ہوتی ہیں جب ان سے انصاف اٹھ جاتا ہے۔۔۔

☆

"میزانِ عدل"

محاصرہ

احمد فراز

(●)

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا میرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرص کرم ہے نہ خوف خمیازہ
اسے ہے سطوت شمشیر پہ گھمنڈ بہت
اسے شکوہ قلم کا نہیں ہے اندازہ

میرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
میرا قلم نہیں کاسہ کسی گدا گر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

میرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
میرا قلم نہیں اس دز و نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پہ کمند اچھالتا ہے

میرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
میرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دہرا نقاب رکھتا ہے

میرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
میرا قلم تو عدالت میرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاک جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقین ہے مجھے
کہ یہ حصار ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبوں کی قسم
میرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

التجا

عبداللہ جاوید

(●)

داتا
جو دینا ہے
وہ دے دیتا
تو میں یہ کرتا
نہ ہی وہ کرتا

مرے ہاتھ
سدا کے سوالی تھے
ترے دست عطا کب خالی تھے۔؟
مجھے بھیک کی پل پل جلدی تھی
تری جانب سے پابندی تھی
مری پستی، تیری بلندی تھی
یا تیری سب نیرنگی تھی۔
داتا!

احکام جو تیرے تھے
ان کو
جانا، سمجھا اور بھول گیا
ممنوعہ چیزوں کے پیچھے
اک سیدھا رستہ
بھول گیا

بے سمت ہُوا
بے سمت پھرا
میں تیرا رستہ بھول گیا

تن من میرا
سب داغ ہُوا
اس پر بھی تو نے کرم کیا
مرے سامنے آئینہ رکھا
اور عکس نے
منھ پر تھوک دیا
تب مجھ پر میرا حال کُھلا

یہ بھی تیری عطا ہے، تیری عطا
مرے چہرے کا اک اک دھبّا
ابھی خلق کی آنکھوں سے ہے چھپا
مرے شانے آج بھی سیدھے ہیں
اور سر اونچا کا اونچا ہے
مری ٹوپی
آج بھی ٹیڑھی ہے
اور پھندنا بھی لہراتا ہے

جو خلقت مجھ پہ نہیں ہنستی
نہیں کھلتی ان پہ مری پستی
یہ بھی تیرا کرم ہے، تیری عطا ہے
داتا!

میں اندر سے شرماتا ہوں
پھر تیرے در پر آتا ہوں
مجھ بھیک کی جلدی والے پر
اس اندر سے
منھ کالے پر
رحمت کر دے!

پانسہ پھینکو

ستیہ پال آنند
(امریکہ)

وقت تھا جب میں نے تخلیق کے کمروں میں
افسانوں اور نظموں کے گلدان سجائے
شہرِ سخن کی گلی گلی میں
تاریکی کو دور بھگاتے دیئے جلائے
نئے نئے مضمونوں کو شعروں میں سمو کر
گھر گھر تک تحفے پہنچائے
وقت مرا ہمجولی تھا تب
ویراں راہوں پر بھی ایسے ساتھ چلا، جیسے جڑواں ہو!
وقت نے ساتھ دیا تو پھر اپنے جیسے
کچھ سنگی ساتھی ان راہوں پر ساتھ ہو لیے
اک ٹولی سی نکل پڑی تھی
لکھ لکھ کر اور بول بول کر
اپنی بات سبھی تک پہنچانے کا ہم نے جتن کیا تھا

نصف صدی کی باتیں جیسے خواب ہوئی ہیں
اب خاموش ہوں۔۔لیکن لوگو
اردو کی بے مہر صلیب پہ چڑھا ہوا یہ ادنیٰ کافر
ایک بات کہنے کی ضد تو کر سکتا ہے
کانٹوں کا یہ تاج تو میری اپنی ملکیت ہے، لیکن
پانسہ پھینکو
دیکھو، میرے کپڑے کس کے ہاتھ لگیں گے

○

عیسیٰ مسیح کو سولی پر چڑھانے کے بعد صلیب کو لانے والے سپاہیوں نے آپس میں پانسہ پھینک کر اس بات کا تصفیہ کیا تھا کہ مصلوب کے کپڑے کس کی ملکیت ہوں گے۔

پگڈنڈی

ولی عالم شاہین
(کینیڈا)

بھری جوانی میں آیا تھا
یہاں
اب اسّی سال سے اوپر کا بوڑھا ہوں
پگڈنڈی بھی لمبی ہوتی جاتی ہے
اس پر چلنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے
پیڑ تھے کم کم
دھوپ برابر رہتی تھی
پگڈنڈی پر پیڑوں کی اب چھاؤں گھنی ہے
تتلی کے پر اور نازک چڑیوں کے ڈھانچے
جہاں تہاں بے ٹھور پڑے ہیں
اوجھل بھی ہو جاتے ہیں
تھک جاؤں تو لکڑی کے سادہ بنچوں پر بیٹھنے کی آسانی ہے
سانس ذرا ٹھہرے تو میں کچھ کھا کر پھر چل پڑتا ہوں

پگڈنڈی پر آتے جاتے
یوں ہی کسی دن
بنچ سے اٹھ بھی نہ پاؤں گا
پیڑوں کی شاخوں میں پکھیرو شور مچاتے رہ جائیں گے

○

مغلُوب

فیصل عظیم
(کینیڈا)

شمال میں برف تیزی سے گھُل رہی ہے
زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے
سمندروں میں چڑھا ہوا ہے گئے زمانوں کا تازہ پانی
کئی جزیرے تو اب بھی ہیں بیخبر، مگر کل
کہیں نہ ہوں گے!
بدلنے والی ہیں سرحدیں، پر
بڑا ہی شیریں ہے خوابِ غفلت
ہمارے اندازے، خواب، سب پیچھے رہ گئے ہیں
سمندروں میں بہت سے طوفان اُٹھ چکے ہیں
اِدھر زمیں پر،
بساط پر بازیوں کی تیزی، نظر سے اوجھل
اُدھر فلک پر ستارے اوجھل
وہ جن کو شہ مات ہو رہی ہے، وہ سارے اوجھل،
کہف کے غاروں میں سو رہے ہیں
وہ جن کے ساحل، جزیرے، فردوسِ منتظر کے
نشان، بے نام ہونے کو ہیں
کوئی تو جا کر اُنہیں جگائے
اُنہیں بتائے
زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے
زمیں سے طوفان اُٹھ رہے ہیں
سمندروں میں بدل رہے ہیں

○

اس نظم کی ایک سطر ہے "زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے" ابھی شاہدہ حسن صاحبہ سے معلوم ہوا کہ یہ ان کی عراق جنگ پہ لکھی ایک نظم کا عنوان بھی تھا اور ایک مصرعے کا جز بھی ہے، سو یہ نظم میں ان کے نام کرتا ہوں

مسدس

بشارت حسین وقار (جھنگ)

کس نے جہاں کو حسن ولطافت سے بھر دیا
کس نے شجر کی شاخ کو شیریں ثمر دیا
کس نے ہوا چلا کے پرندے کو پر دیا
کس نے نفوس کو بھی بقا کا ہنر دیا
راہ_نجات ،خلد کا جادہ اسی کا ہے
کونین اس کے، کن کا ارادہ اسی کا ہے

کس بے نیاز کی ہے ادا محوِ ناز میں
کس نے بھرا ہے سوزِ دلِ نے نواز میں
کس کی عطا ہے عزم، دلِ شاہباز میں
کس نے بھرا ہے نور جبینِ نیاز میں
مومن سے آ کے ملتا ہے ہر شب نماز میں
جس کا ہنر عیاں ہے نشیب و فراز میں

کس نے بدن میں خون کی ندیاں بہاء ہیں
کس نے کلام_پاک سے روحیں جگاء ہیں
کس نے کرم سے سرد ہوائیں چلاء ہیں
کس نے ثمر کے بوجھ سے شاخیں جھکاء ہیں
جس نے کھلایا پھول، کلی سے وہی تو ہے
جس نے کیا کلام نبی ص سے وہی تو ہے

کس نے دلوں کے باب_مقفل کو وا کیا
کس نے الست عہد کو ازخود وفا کیا
کس نے خرد کو نور _بصیرت عطا کیا
کس نے علوم_غیب سے رمز آشنا کیا
جس کے کرم کی کوء نہیں حد وہی تو ہے
ہر ایک نیک روح کا مشہد وہی تو ہے

کس نے بدن کو روح سے مربوط کردیا
کس نے لطیف ربط کو مضبوط کردیا
کس نے عطائے خلد کو مشروط کردیا
کس نے رموز_عشق کو مبسوط کردیا
بخشا ہے نطق جس نے زباں کو وہی تو ہے
تھامے ہوئے زمام_زماں کو وہی تو ہے

سیلف پورٹریٹ

فریدہ کاہلو (میکسیکو)

۔ ترجمہ ۔

خان حسنین عاقب (انڈیا)

چمکدار رنگوں سے میں
سیلف پورٹریٹ بناتی ہوں
میں اکثر دیر رات تک
اپنی نیند کے پروں سے
گرد جھاڑتی ہوں
تا کہ
سفید کاغذ کی کھردری زمین پر
اپنے وجود کو تراش سکوں
میرے لیے یہ تجربہ
کسی تاریک جنگل سے گزرنے
جیسا ہے
یہ تجربہ
نوکیلے کانٹوں کے لمس کا ذائقہ چکھنے جیسا ہے
یہ ایک پُل ہے
تخلیق کی اذیت
اور فصلِ زیاں کے بیچ بنا ہوا

یہ ایک پُل ہے
اندرون ذات کی روشنی
اور وسعتِ ھنر کے بیچ بنا ہوا

اپنی ہی ذات کے اندرون میں
میری ملاقات اس شخص سے ہوئی
جسے زندگی سے عشق ہے
میرے دل کی زمین نے اپنے آپ کو
غموں، اہانت اور نفرت کے
اندھیروں سے پاک کر لیا ہے
جسے شبنمی روشنی میں
میری آنکھوں کے کناروں پر
دیکھ کر
تم محو حیرت ہو جاتے ہو

چمکدار رنگوں سے
میں اپنے سیلف پورٹریٹ بناتی ہوں
تا کہ باقی ماندہ
گیلے پینٹ کو استعمال کر سکوں

میں خود اپنی تصویر بناتی
کیونکہ
میں اکثر تنہا ہوتی ہوں
اور
میں وہ موضوع
وہ معمول ہوں
جسے صرف میں ہی
بہتر جانتی ہوں!!!

فریدہ کاہلو (1907–1958) مشہور میکسیکن مشہور مصور اور شاعرہ

''بڑھاپا''

فیض منصور فیض
(جھنگ)

(اچھا لگتا ھے)
اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جسے خود ہی بنایا ہو اسی کی چھاؤں میں گزرے
جہاں اجداد سوئے ہیں انہی کے پاؤں میں گزرے
جنہوں کے ساتھ گزری ہے انہی کے چاؤں میں گزرے
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جہاں کا آب زم زم آپ کو کامل شفا دے دے
جہاں کا پیر کامل آپ کو حاصل دعا دے دے
جہاں کی خاک پاک آپ کو اپنی پناہ دے دے
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جہاں ساتھی پرانے ہوں ماضی کے فسانے ہوں
یادوں کے خزانے ہوں سبھی اپنے زمانے ہوں
موسم بھی سہانے ہوں محبت کے ترانے ہوں
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے
جہاں بیمار ہوں گر تو ہوں تیماردار کافی
اگر پہلو بدلنا ھو تو ہوں عیالدار کافی
اگر آواز دوں اک کو تو ہوں پاسدار کافی
بڑھاپا اچھا لگتا ہے اگر یہ گاؤں میں گزرے
اگر اس گھر میں گزرے

○

میری اڑان

سویتا گرگ ساوی
(پنچکولہ)

۔ترجمہ ۔

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

لفظ گندھ جاتے ہیں
بھاؤ کے گُلگل دھاگوں میں
کوئی گیت نیا بن جاتا ہے
میں کرتا دھرتا نہیں ہوتی
سچ کہوں تو یہی سچ ہے
میں لفظوں کو نہیں پروتی۔

جھر جھر بہتی آنکھوں سے
گرتا ہوا ہر اک آنسو
سچا موتی بن جاتا ہے
میں جان بوجھ کو نہیں روتی
سچ کہوں تو یہی سچ ہے
میں لفظوں کو نہیں پروتی

سب قسمیں سندوری رسمیں
پائل کا اک اک گھنگھرو
مجھے ساری رات جگاتا ہے
پلکیں جگتی ہے نہ سوتی
سچ کہوں تو یہی سچ ہے
میں لفظوں کو نہیں پروتی۔

○

مشرف ذوقی کا کلامیہ

نادیہ عنبر لودھی
(اسلام آباد)

مشرف عالم ذوقی فکشن نگاری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی ایسے لکھاری تھے جن کے چودہ ناول اور افسانوں کے آٹھ مجموعے شائع ہوچکے ہیں- آپ کالم نگاری بھی کرتے تھے۔مشرف عالم ذوقی کا قلم جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔آپ نے ناولوں کے ذریعے اس ثقافتی یلغار کو بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جو بیرونی ذریعے سے ہماری نئی نسل کو گمراہ کررہی ہے۔اس بیرونی استعماریت کی جڑیں نوآبادیات نظام میں پیوست ہیں نوآبادیاتی نظام جوکہ اب مابعد نوآبادیات میں تبدیل ہوچکا ہے۔نئے نوآبادیاتی نظام میں آئی۔ایم۔ایف (IMF)، ورلڈ بینک، اور ثقافتی و تعلیمی تنظیمیں کام کرتی ہیں جوکہ ہماری معاشی، تعلیمی، سیاسی اور انتظامی پالیسیاں بناتی ہیں۔انہی پالیسیز کے ذریعے بیرونی استعماریت کی جاتی ہے۔

آج ہمارا ماحول کیا ہے؟

ایک بچہ والدین، گھر، اسکول اور معاشرے کا فرد ہے- والدین اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔گھر میں بچے کے ہاتھ میں کی پیڈ تھمادیا جاتا ہے اب بچے کی تربیت سوشل میڈیا کے حوالے ہے۔اسکول میں استاد بھی بچوں کو نیٹ سے استفادہ حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔لیکن بات یہاں تک نہیں رکتی۔

بچے کی سوچ ان اشتہارات کے تحت پروان چڑھتی ہے جو اسے گوگل دکھاتا ہے۔وہ ویب سائٹس جوکہ غیر اخلاقی مواد کی ترسیل کرتی ہیں ایسے کلب جن کا ممبر بن کر وہ آن لائن سیکس پارٹنر کا چناؤ کرسکتا ہے مشرف عالم ذوقی کے ناول پوکے مان کی دنیا میں ایک ایسے بچے کی کہانی سنائی گئی ہے جس کی جسمانی عمر بارہ سال ہے اور وہ ویڈیو گیم کھیلتے کھیلتے ریپسٹ بن جاتا ہے۔یہ ناول استعماریت، مابعد نوآبادیات صارفیت، میڈیا، گلوبلائزیشن، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری، انٹرنیٹ، چیٹنگ، جنک فوڈ کے اثرات کو سامنے لاتا ہے۔ مابعد نوآبادیات کے اثرات استعماریت کی پیداوار ہیں اور یہ نئی نسل کو گمراہ کررہے ہیں ۔مشرف عالم ذوقی کی زیادہ تر تحریریں پیروں تلے سے کھسکتی ہوئے تہذیبی و اخلاقی بنیادوں کا نوحہ ہیں۔مشرقی تہذیب و کلچر پر مغربی یلغار اور کلچرل امپیریلزم کے مُضر اثرات جو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہمارے گھروں میں داخل ہوکر بالخصوص نئی نسل کے ذہنوں کو آلودہ کرنے میں مصروف ہیں ان کو مشرف عالم ذوقی نے تحریر کا حصہ بنایا ہے لیکن ان کا حل کیا ہے؟

آج کے بچے کو آپ زبردستی ناپسندیدہ خوراک کھانے پر مجبور نہیں کرسکتے - اس سے بحث کرکے اپنی بات نہیں منوا سکتے۔جو temptations وہ آن لائن دیکھتا ہے وہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مشرف کے ناول مرگ انبوہ کا پاشا مرزا بھی ایک ایسا ہی کردار ہے نیٹ چیٹ اور 'بلیو وہیل' گیم کا شوقین مرزا پاشا اخلاق سے عاری نوجوان ہے جو نیٹ سے دنیا فتح کرنا چاہتا ہے وہ پزا اور برگر کا شوقین ہے کتابیں اسے بے کار لگتی ہیں۔وہ ''contentgenerated-User'' کا حصہ ہے اور گلوبل ویلج میں رہتا ہے۔حقیقی دنیا سے اسے دلچسپی نہیں ہے شاید اس کی وجہ دنیا کی بدصورتی، رشتوں کی مفاد پرستی اور مالی تنگی ہے۔

مرگ انبوہ کا دوسرا حصہ مردہ خانے میں عورت کے نام سے لکھا گیا ہے جو زوال پذیر سماجی صورت حال پر طنز ہے- مردہ انسان احساسات سے عاری ہوتا ہے انسان بھی احساسات سے عاری ہوتے جارہے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' نئی نسل کی اخلاقی گراوٹ کو بیان کرتا ہے یہ اخلاقی گراوٹ مشرف عالم ذوقی کے خیال میں استعماری یلغار کی وجہ سے ہے لڑکی کا بے ہودہ لباس اور لڑکوں سے دوستی اور جنریشن گیپ اس کے باپ کو بہت پریشان کرتا ہے۔

دوسری طرف اسی ناول میں ایک اور کہانی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے یہ ایک معذور لڑکی کی عجیب کہانی ہے جوکہ اپنے باپ کے ناجائز بچے کی ماں بن جاتی ہے۔نور محمد نام کا ایک شخص اپنی بیوی نادرا کے انتقال کے بعد اپنی بیٹی نگار کے ساتھ جنسی تعلق استوار کرلیتا ہے۔اس ناول میں مشرف عالم ذوقی نے حیوانی جبلت کے سامنے ایک باپ کو مجبور دکھایا ہے۔جوکہ سراسر عقلی، مذہبی اور معاشرتی، ہر لحاظ سے مکروہ فعل ہے۔یہ ناجائز بچی جوان ہوتی ہے اور پھر ناول نگار اسے باپ کی نواسی قرار دے دیتا ہے۔یہ کیسا فلسفہ ہے؟ اس مسلئے کا بہتر حل اس بچی کی شادی تھی۔گاؤں سے آئے نوجوان سے بچی کو بچاتے بچاتے اس کا اپنا باپ اسے حاملہ کردیتا ہے۔

مشرف کے ایک اور مشہور ناول نالہ شب گیر میں خواتین کے جنسی استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے خیال میں عورت ایک برانڈ بن چکی ہے جس کے نام پر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنا پراڈکٹ دنیا میں پھیلاتی ہیں۔عورت ہمیشہ سے کھلونا رہی ہے اور آج بھی اسے اسی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ناول کا ایک کردار صوفیہ مشتاق احمد ہے جو ہندوستانی معاشرے کی خوف زدہ لڑکی ہے جسے بچپن سے ڈرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ناہید ناز اس کے مقابل دوسرا کردار ہے جو صدیوں کی غلامی سے آزادی چاہتی ہے۔یہ ایسی عورت کی کہانی ہے جو بچپن ہی سے اپنے گھر کے مردوں یعنی ماموں، دادا اور کزن کے ہاتھوں جنسی زیادتی کا شکار بننے کے بعد دل میں مردوں کے خلاف بھرپور نفرت کو جمع کرتی رہی ہے گھر میں موجود دوسری لڑکیوں نے سمجھوتا کرلیا اور اس کھیل کا خاموشی سے حصہ بنتی رہیں لیکن ناہید نے بغاوت کی۔

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

ادھورا پن مکمل ہے

پروین شیر
(نیویارک)

کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی کا منفرد تخیل دنیائے دروں میں زلزلے پیدا کر دیتا ہے اور دنیائے بیروں کے حسین رنگوں کے کچے ہونے کا گواہ بن جاتا ہے۔ رنگین عینک سے بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی بے رنگی صاف نظر آنے لگتی ہے۔ سوچ بے چین ہو کر گھبرائی ہوئی بے منزل بھٹکنے لگتی ہے۔ یہ صورت حال فکر کے کئی چراغ روشن کر دیتی ہے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت معروف شاعر، جون گوڈفری سیکس (Jhon Godfrey Saxe) کی نظم The Blind Men and the Elephant پڑھ کر ہوئی۔

امریکہ کا معروف شاعر، جون گوڈفری سیکس (Jhon Godfrey Saxe) ورمونٹ میں ۱۸۱۶ میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۷ میں دنیا چھوڑ گیا۔ اس کے آباؤ اجداد جرمنی سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ تجارت کے پیشے سے اکتا کر اس نے شاعری شروع کر دی تھی۔

اس کی یہ سب سے مشہور نظم ایک قدیم، تقریباً ڈھائی ہزار سال سے زیادہ پرانی ہندوستانی تمثیلی کہانی کی بنیاد پر ہے جو انیسوی صدی میں وجود میں آئی تھی۔ ہندوستان کے بہت مقبول مجاز یہ Parable سے متاثر ہو کر سیکس نے یہ نظم کہی تھی اور مغرب میں متعارف کیا تھا۔ مغربی قاری نے اس مشہور طنز نگار کی اس تخلیق کو بہت سراہا تھا۔ گرچہ یہ نظم اس کی موت کے بعد زیادہ مشہور ہوئی۔

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کی داستانوں میں یہ بہت مشہور حکایت ہے جو ہندوستان سے شروع ہوئی اور ہر جگہ پھیلی۔ خاص کر یورپ میں بہت مشہور ہے۔ اس کی بنیاد پر بچوں کی کتابیں بھی شایع ہوئیں جس کے تخلیق کاروں میں پال گالڈون (Paul Galdone) کا نام نمایاں ہے۔

یہ ہندوستانی تمثیلی کہانی جس کے کئی ترجمے ہیں مختلف لوگوں کے نقطۂ نظر سے دیکھے گئے حقائق پر مبنی ہے۔

گوڈفری کی نظم کا اقتباس یہ ہے:

''وہ ۶ ہندوستانی تھے
جو مزید علم کی طرف مائل تھے
وہ ہاتھی دیکھنے گئے، گرچہ سب نابینا تھے
پہلا آدمی ہاتھی کی طرف گیا اور اس کے کشادہ و قوی پہلو پہ گرا
وہ فوراً چیخا
''خدا مجھے اپنی برکت عطا کرے
کہ ہاتھی بالکل ایک دیوار کی مانند ہے!''
دوسرے نے ہاتھی کے دانت کو ٹٹولا
''اوہو۔۔ یہ کیا ہے؟
اس قدر گول، ہموار اور نوکیلا
مجھ پر یہ صاف ظاہر ہے
یہ حیرت انگیز ہاتھی ایک نیزے جیسا ہے!''

اس نظم میں ہاتھی خدا کا استعارہ ہے اور نابینا لوگوں کا صرف ایک حصے کے محدود لمس کی بنیاد پر ہاتھی کی پوری شبیہ کے متعلق فیصلہ کر لینا مختلف مذہبی عقائد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کے مکمل یقین کی وجہ ان کے ادھورے علم کی بنیاد ہے۔ نابیناؤں نے ہاتھی کے کسی ایک عضو کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا اور یہ سمجھ لیا کہ ہاتھی کی شکل وہی ہے۔ یوں وہ سب صحیح بھی تھے اور غلط بھی کیونکہ ان کا مشاہدہ ادھورا تھا۔ پھر تباہ کن کشمکش اور ایک دوسرے سے اختلافات پیدا ہوئے جس سے متاثر ہو کر گوڈفری نے یہ نظم کہی تھی:

''اکثر عقائد کی جنگ میں
جھگڑنے والے
تنقید کرتے ہیں لاعلمی میں
کہ ایک دوسرے کا مطلب کیا ہے
اور بے وقوفی میں
ایک ہاتھی کے متعلق بولتے جاتے ہیں
جسے ان میں سے کسی ایک نے بھی نہیں دیکھا!''

یہ صورت حال کئی سوالات سے ذہن کو الجھانے لگتی ہے۔ گرہیں کھلتی ہی نہیں۔

خلاؤں میں بھٹکتے ہوئے، چکراتے ہوئے سیارے، یہ گردشیں۔۔۔ ازل سے سیاروں کا ستاروں کے ارد گرد منڈلاتے رہنا۔۔۔ کس تلاش میں سرگرداں ہیں یہ؟ سورج کے گرد چکراتی ہوئی ہماری زمین اور زمین پر بھٹکتے ہوئے انسان۔ شاید سہارے کی جستجو، سچ کی تلاش، سکون کی تلاش، روشنی کی تلاش، کاملیت کی تلاش میں ہیں۔ دوڑتے، بھاگتے، رینگتے، ٹٹولتے لوگ۔ چھوٹے چھوٹے دائروں کے اندر بند جن سے باہر نکلنے کا نا کوئی راستہ ہے اور نا ہی وہ نکلنا چاہتے۔ ان کے ہاتھوں میں چراغ ہیں لیکن ٹمٹماتی ہوئی لو کی مدھم روشنی اپنی محدود طاقت تک ہی منظر کو روشن کر سکتی ہے۔ دور تک جو پھیلاؤ ہے وہ تاریک رہ جاتا

ہے۔آدھا سچ پورا سچ بن جاتا ہے۔

دور۔۔۔دھند کے اندر جاتے ہوئے آب وگل کے مختلف راستے، پگ ڈنڈیاں، پختہ سڑکیں، کچی راہیں، ندیاں، سمندر اور ان پر رواں مسافر۔ایک دوسرے سے بیگانہ، الگ الگ اپنی اپنی ٹولی بنا کر چل رہے ہیں۔یہ مختلف راستے دور جا کر دھند کے ایک ہی نقطے میں ضم ہو جاتے ہیں۔مسافروں کو ایک ہی مقام پر پہنچاتے ہیں۔ابتدا ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا اور انتہا ساتھ۔لیکن اتنی دور تک دیکھنے کی آنکھوں میں طاقت کہاں۔۔۔ان کی بصارت اور بصیرت جس راستے پر انہیں لے جاتی ہے ان کے قدم اسی سے مانوس ہو جاتے ہیں اور وہی ان کی منزلوں تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔یہ راہیں انہیں ایک یقین کی بانہوں میں جکڑ لیتی ہیں۔آدھے سچ کو پورا سچ سمجھنے کا یقین۔۔۔!انہیں پورا یقین ہے کہ دوسرے رستوں پہ چلنے والے کسی کھائی میں گر جائیں گے۔لیکن دھند کی آغوش سبھی راستوں کو اپنے سینے میں سمیٹ لیتی ہے۔بے بصیرت مسافر اپنے یقین پر جیت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے اعتبار کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔پھر اختلافات کے بطن سے نفرتوں کی پیدائش ہوتی ہے۔دشمنی کے خنجر ایک دوسرے کے خون پی کر بھی پیاسے رہتے ہیں۔بے بصری تباہی کے زہریلے ناگوں کو جنم دیتی ہے جو ہر موڑ پر اپنا پھن اُٹھائے ہوئے لہراتے رہتے ہیں۔تعصب کے گدھ انسانیت کے جسم کو نوچ نوچ کر کھاتے رہتے ہیں اور اسے لاغر بنا دیتے ہیں۔انسانیت کی آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھیں شفافیت چاہتی ہیں لیکن یہ ممکن نہیں۔نفرتیں اپنی سرفرازی کے جام چڑھاتی رہتی ہیں۔سوچ کے اصلحہ خانوں میں دشمنی کے کارتوس جمع کیے جاتے ہیں۔بصیرت کفن اوڑھ کر سوئی رہتی ہے۔محبت کی ہری بھری شاخوں کو ایندھن بنا کر چھاؤں چھین لی جاتی ہے۔جنون میں ڈوبے ہوئے نابینا مسافر ادھورے پن کو تکمیل سمجھ کر مختلف راستوں پر سفر پورا کرتے ہیں کہ وہ تو یہ دیکھنے سے مجبور ہیں کہ دوسرے بھی اسی دروازے کی طرف جا رہے ہیں جس طرف یہ گامزن ہیں۔

دھند سے جھانکتی ہوئی منزل مسکرا کر اس تماشے کو دیکھتی رہتی ہے۔مختلف راستوں کے دھاگوں کے آخری سروں کو ایک ساتھ جوڑ کر اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے۔نابیناؤں کی ٹولیاں اپنا اپنا پرچم تھامے ہوئے، ایک دوسرے کو زیر کرتے ہوئے رواں ہیں۔

مختلف عقیدوں کے سنگلاخ دائرے ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے غیر مکمل علم کی اساس پر زلزلے پیدا کرتے ہیں۔ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔

گوڈفری کی نظم کے نابینا لوگوں نے علم حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کیا انہوں نے مطلق کو پالیا؟اپنے اپنے تجربات، اپنے اپنے نظریے، اپنے اپنے راستے۔سچ کو پانے کے لیے مکمل بصارت اور بصیرت لاحق ہے۔نیم سچائی کے چھوٹے چھوٹے بلبلے ایک دوسرے میں سما کر ایک نہیں ہوتے۔رعونت سے سر اُٹھائے اختلافات کی پتھریلی فصیلوں کو جو بھی گرانے کی کوشش کرتا ہے ان سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔زمین اپنے شانوں پر موٹی، پتھریلی تفرقے کی دیواروں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے، اپنے دل کے نہاں خانوں میں دکھ کا لاوا چھپائے ہوئے خاموش دیکھتی رہتی ہے۔کبھی تو اس کا دل اتنی شدت سے دھڑکتا ہے کہ اس کا سینہ شق ہو جاتا ہے جس سے چٹے ہوئے جاندار تہس نہس ہو جاتے ہیں۔اس کی آنکھوں سے رواں رنج وغم کے سیلاب انہیں بہالے جاتے ہیں۔یہ تھراتی ہے لیکن دیواریں نہیں گرتیں۔روز نیا سورج خون کے آنسو بہا کر افق کی خندق میں گر کر مر جاتا ہے۔پورا چاند چمکتا ہے تو اسے بھی کرب کے ہتھوڑے روز ذرا ذرا توڑتے رہتے ہیں۔اور آخر کار اس کا آخری ٹکڑا بھی سیاہی کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔نفرتوں کا کثیف دھواں فضاؤں کی صیقل آنکھیں دھندلا دیتا ہے اور اس کی شفاف گود تعصب کا کوڑے دان بن جاتی ہے۔تفاوت کی چیخ وپکار، سنگین حالات کے سیاہ بادل، بربریت کے پنجوں میں دم توڑتی ہوئی انسانیت، کھنڈر میں تبدیل ہوتے ہوئے خوابوں کے محل، سکھ چین کی اُکھڑی اُکھڑی سانسیں، حیوانیت کے قہقہوں کی گونج سے کانپتا ہوا آسمان۔۔۔کیونکہ یہ بدنصیب سیارہ نابیناؤں کا سیارہ ہے۔

لیکن کچھ مسافر ایسے بھی ہیں جن کے راستے تنہا تنہا ہیں۔یہ لوگ سوچ کے سر بفلک کوہ پر آگہی کے الاؤ میں جلتے رہتے ہیں۔یہ خواب دیکھنے والی زندگانیاں ہیں جو اپنے سیارے کو تکمیل کے جواہرات سے سجانا چاہتی ہیں۔یہ بلند فکر مسافر چاہتے ہیں کہ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تمام لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں بن جائیں۔ان کے خواب ان کی آنکھوں میں بھی سما جائیں۔ان کی یہ بے چینیاں تا زندگی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔یہ لوگ سوچتے رہتے ہیں کہ۔۔۔کیسی ہوتی یہ زمین جب منزل تک پہنچنے کا اس پر ایک ہی راستہ ہوتا؟ کیسا ہوتا یہ سیارہ جب اس کے سینے پر سرحدوں کی خراشیں نہ ہوتیں؟جب جنون کی کوکھ سے نفرتوں کے خوفناک بھیڑیے پیدا ہو کر ایک دوسرے کو لہولہان نہ کرتے؟جب اپنے اپنے دائروں میں بے بصری انسانیت کے چیتھڑے نہ اُڑاتی؟ یہ لوگ ہتھیار کی جگہ پھول اگانا چاہتے ہیں۔

انہیں تنہا لوگوں میں برطانیہ کا ایک عظیم فنکار جون ونسٹن لینن (John Winston Lennon) بھی تھا جو ۱۹۴۰، اکتوبر میں پیدا ہوا تھا۔ایک انتہائی مقبول گلوکار، نغمہ نگار اور مصنف تھا جو ہمیشہ اندھی اور دقیانوسی قدروں کے خلاف رہا۔۸ دسمبر ۱۹۸۰ کی رات نیویارک میں اپنی رہائش گاہ کے قریب قتل کر دیا گیا جب وہ صرف ۴۰ سال کا تھا۔اس کا قاتل مارک ڈیوڈ چیپمن (Mark David Chapman) ایک امریکی مجرم ہے جو ۱۹۵۵ میں پیدا ہوا۔اس کا

بچپن بہت مشکلوں میں گزرا تھا۔جس کے ردعمل میں یہ حد درجہ مذہبی کرسچن ہوگیا اور جون لینن کی منفرد سوچ اور روشن خیال تحریروں سے نفرت کرنے لگا۔چیپمن کے شدید غصے کی ایک وجہ لینن کی یہ مشہور غنائی نظم ''تصور کرو''(Imagine) بھی تھی جس میں ایک حسین دنیا کے خوبصورت خواب کی شدت ہے:

''تصور کرو۔۔۔یہاں کوئی ملک نہیں
تصور کرو۔۔۔یہاں کوئی ملکیت نہیں
تصور کرو۔۔۔سب لوگ
پوری دینا کے یکساں حصے دار ہیں
تم کہہ سکتے ہو کہ میں خواب میں ڈوبا ہوں
لیکن صرف میں ہی نہیں ہوں
مجھے یہ امید ہے
ایک دن تم ہم جیسوں میں شامل ہو گے
اور یہ دنیا ایک جیسی ہوگی۔۔۔!''

لیکن اس زمین پر زندگیوں کے سیارے اپنے اپنے عقیدوں کے ستارے چن کر اپنے محور کے گرد رقصاں ہیں۔انسانوں کے بنائے ہوئے سرطان زدہ قانون و عقیدے بغاوت پر اکسانے لگتے ہیں تو آوازوں کے درمیان بھی ویرانے گونجنے لگتے ہیں۔فرزانوں کی بستی میں سچ کی راہ دکھانے والے دیوانوں کو عجوبہ سمجھا جاتا ہے اور یہ دیوانے تنہائی کا مرقع بن جاتے ہیں۔ایسے لوگ سچ کی پوتھی کو جھوٹ کی بھٹی میں نہیں جھونکتے۔یہ لاعلمی کے سکون کی سزا نہیں جھیلتے۔یہ آگہی کے درد کی طمانیت میں جیتے ہیں۔دنیا دھوئیں کا مسکن بنتی جارہی ہے لیکن لینن جیسے لوگوں کی آنکھیں گرد وغبار میں بھی شفاف رہتی ہیں۔بند دروازوں کو وا کرنے کے جنون میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ گھونٹ گھونٹ خواب پیتے ہیں۔ان کے افکار کی سرفرازی کے پھول تند ہواؤں میں بھی نہیں بکھرتے۔لینن کی طرح خواب دیکھنے والے عریاں حقیقتوں پر غلاف چڑھانے والوں سے جنگ لڑتے رہتے ہیں۔لوگ ان کے عظیم جذبوں کے امڈتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر بھی شدید جذبوں کی موجیں سنگین چٹانوں پر کف اچھالتی رہتی ہیں اور جھاگوں کے بلبلے ریت میں گم نہیں ہوتے۔ان لوگوں کی انفرادیت کڑی دھوپ میں جھلس کر بھی زندہ رہتی ہے۔ایسے لوگ انسانیت کی معراج کے خواب دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔۔۔لیکن یہ تو نابیناؤں کا سیارہ ہے جن کے لیے ادھوراپن مکمل ہے۔۔۔!

۔ بقیہ ۔

مشرف ذوقی کا کلامیہ

آج کی عورت غلام بننے کے لیے تیار نہیں ہے ہماری قوم جو ہر جدت کو آگے بڑھ کر اپناتی ہے لباس سے خوراک تک-عورت کے معاملے میں آج بھی اس کی سوچ وہی دقیانوسی ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے ہندوستانی مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کو بیان کرنے کے لیے بھی ناول لکھے۔لیکن اصل مسئلہ اس سے بھی آگے کا ہے۔

جنسی بے راہروی، انسسٹ سیکس sexincest، گرل فرینڈ بوائے فرینڈ کلچر، ہم جنس پرستی جیسے مسائل تو چل ہی رہے تھے۔الحاد پرستی نے ذہنوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا ہے-یہودیوں کی فری میسنز طرز کی خفیہ تنظیمیں دنیا بھر میں ہر مذہب کے افراد کو گمراہ کر رہی ہیں۔

ماحولیاتی استعماریت انسان کے لباس سے اس کی سوچ تک کو متاثر کر رہی ہے۔دور حاضر کا انسان اپنی شناخت کھو رہا ہے۔ایک ترقی یافتہ نظام میں انسانی سکون درہم برہم ہو چکا ہے۔یہ نئی تہذیب کی دستک ہے مشرف عالم ذوقی نے بین الاقوامی اور قومی مسائل کو اپنے فکشن کا حصہ بنایا ہے۔ان کا اصل کمال بھی یہی ہے کہ انہوں نے اس طوفان سے خبردار کیا ہے جو بیرونی یلغار کی صورت میں ہمارے گھروں میں گھس آیا ہے یہ استعماریت کی بدترین شکل ہے اس سے بچاؤ کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا اصل سوال یہ ہے۔

☆

ایک صدی کا قصّہ

سلیل چودھری
دیپک کنول (ممبئی)

لاس انجلس (امریکہ) کی ایک مشہور دکان تھی جہاں موسیقی کے سارے سازمل جایا کرتے تھے۔اس دکان کے مالک کا نام ڈیوڈ برناڈ تھا۔ یہاں امریکنوں کے ساتھ ساتھ بہت سارے ہندوستانی بھی کام کرتے تھے ۔ لاس انجلس میں یہ واحد دکان تھی جہاں پر ہندوستانی سازمل جایا کرتے تھے۔ایک دن ایک ہندوستانی نوجوان اس دکان میں داخل ہوا۔اُس نے معمولی سالباس پہنا ہوا تھااس لئے اُس کی طرف کسی نے خاص دھیان نہ دیا۔وہ وہاں رکھے سازوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔چونکہ وہاں پر کام کررہے سیلز مینوں کا کام گاہکوں سے نپٹنا تھااس لئے ایک سیلز گرل جس کا نام کرسٹینا تھا اُس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی اوراُس سے کہا کہ کیا میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں۔نوجوان نے کرسٹینا سے کہا کہ وہ چند ستار دیکھنا چاہتا ہے۔کرسٹینا نے اُسے کئی ستار دکھائے۔اچانک نوجوان کی نظر اونچائی پر ٹنگے ایک ستار پر پڑی۔نوجوان نے وہ ستار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔چونکہ ستار کافی اونچائی پر ٹنگا ہوا تھااس لئے کرسٹنا اُسے ٹالنے کی کوشش کرنے لگی ۔نوجوان وہ ستار دیکھنے کے لئے بضد تھا۔اسی بیچ دکان کا مالک ڈیوڈ وہاں سے گزرا۔اُس نے نوجوان سے پوچھا کہ کیا کوئی پرابلم ہے تو نوجوان نے کہا کہ وہ اُس ستار کو دیکھنا چاہتا ہے جو وہاں ٹنگا ہوا ہے۔مالک نے سیڑھی منگانے کے لئے کہا اور ایک ملازم کو یہ ستار نیچے لانے کے لئے کہہ دیا۔جب ستار نیچے لایا گیا تو مالک دکان نے اُس نوجوان سے کہا کہ اس ستار کو یہاں باس ستار کہا جاتا ہے۔ نوجوان نے ستار کو چھوتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اس ستار کو جو بھی نام دیں ہم اسے صدا بہار ستار کے نام سے جانتے ہیں۔تھوڑی دیر اس ستار کے ساتھ کھیلتے ہوئے اُس نوجوان نے مالک سے کہا۔کیا میں اس ستار کو بجا سکتا ہوں ۔مالک دکان نے کہا۔شوق سے بجاؤ۔جب اُس نوجوان کی اُنگلیاں ستار پر چلنے لگیں تو دھیرے دھیرے دکان میں کام کرنے والے سارے ملازم اُس نوجوان کے گرد جمع ہوگئے۔اُس نے ایسا سماں باندھا کہ سبھی مسحور ہوکے رہ گئے۔مالک دکان نے اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔میں نے آج تک اس قسم کا ستار بجاتے ہوئے ایک ہی آدمی کو دیکھا ہے جس کا نام ہے روی شنکر۔تم نے جس طرح ستار بجایا ایسا لگ رہا تھا جیسے روی شنکر ستار بجا رہے ہیں۔مجھے خوشی ہے کہ تم میری دکان پر آئے۔ اب بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں۔نوجوان نے کہا کہ میں اس ستار کو خریدنا چاہتا ہوں۔ مالک دکان نے کہا کہ تمہیں اس ستار کو خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ستار میں تمہیں اپنی طرف سے تحفے میں پیش کرتا ہوں۔کرسٹنا جو پاس ہی کھڑی تھی اب تک سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔اُس نے پہلی دفعہ ایسی میلوڈی سنی تھی جس نے اُس کے روح کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اُس نے بڑھکر نوجوان کے ہاتھوں کو چوما اور پھر جیب سے ایک ڈالر کا نوٹ نکال کر نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔میں نے ہمیشہ ہندوستانی لوگوں کو کنٹراور امریکن کو برتر سمجھا۔یہی وجہ ہے کہ جب تم دکان میں داخل ہوئے تو میں نے تمہیں کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب تم نے اس ستار کو بجا کر اپنے ہنر کا مظاہرہ کیا تو مجھ پر جیسے سحر طاری ہوگیا۔میں نہیں جانتی کہ تم پھر کبھی ملو گے کہ نہیں اس لئے میں اس نوٹ پر تمہارا آٹوگراف چاہتی ہوں۔نوجوان نے نوٹ تھاما اور پھر اُس نوٹ پر اپنا نام لکھ دیا۔اس نوجوان کا نام سلیل چودھری تھا۔ ہندی فلموں کا مشہور موسیقار سلیل چودھری۔

سلیل چودھری 19 نومبر 1922 کو مغربی بنگال کے چوبیس پرگنہ کے ایک گاوں غازی پور میں پیدا ہوا۔اُس نے بچپن کے کئی سال آسام کے چائے باغات میں گزارے جہاں پر اُس کا باپ ایک ڈاکٹر تھا۔وہ بچپن سے ہی مغربی موسیقی کے ساتھ آسام اور بنگال کے لوک گیت سن سن کے بڑا ہوگیا۔یہ سنگیت کا بھنڈار اُس کے باپ کے پاس تھا جو سنگیت کا رسیا تھا۔اُس کا ایک آئرش ساتھی ڈاکٹر جو کہ اُس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا،کام چھوڑ کے اپنے وطن واپس جارہا تھا۔اُس کے پاس ایک گرامافون ریکارڈر اور درجنوں مغربی موسیقی کے ریکارڈ تھے۔اُس نے یہ گرامافون ریکارڈر اور اُس کے سارے ریکارڈ اُس سے خریدے ۔ان ریکارڈوں کی بدولت سلیل چودھری کا رجحان مغربی سنگیت کی طرف بڑھنے لگا۔وہ دن بھر ان ریکارڈوں کو سنتا رہتا تھا۔جن میں موذت، بیٹھون، لچکو وسکی اور چوپین جیسے مغربی سمفنی کے ریکارڈ تھے جنہیں سلیل چودھری اکثر و پیشتر سنا کرتا تھا۔اُس کے باپ نے اُسے یہ سیکھ دی تھی کہ کسی بھی آرٹ کو سیکھنے سے پہلے ایک انسان کو سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کا ادراک ہونا چاہیے۔راج نیتی اور آرٹ کا پہلا پاٹھ اُسے اُس کے باپ نے ہی سکھایا تھا۔وہ چائے باغات کے ورکرس اور گاوں کے کسانوں اور مزدوروں کو جمع کرتا تھا اور پھر اُن کے ساتھ اسٹیج پر ناٹک پیش کرتا تھا۔ان ڈراموں میں اُن کی بدحالی اور بے بسی کو دکھایا جاتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران اُسے رفیوجیوں کے قریب رہنے کا موقع ملا۔اُس نے بھوک بیماری اور انسانی حقوق کی پامالی کے دلدوز مناظر دیکھے۔ اُس نے اپنی ابتدائی پڑھائی ہری ناوی ڈی اے وی اسکول میں پوری کی۔اُس کے بعد اُس نے بھنگ باسی کالج سے گریجویشن کی۔ یہ کالج کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک تھا۔یہیں پر رہ کے بھارت چھوڑو اندولن تحریک کے ساتھ منسلک ہوگیا ۔اس عرصے میں نہ صرف وہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا بلکہ موسیقی کی طرف بھی اُس کا رجحان بڑھتا چلا گیا۔

اپنی کم سنی کے دوران ہی موسیقی میں اُس کی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اسکول میں وہ بانسری۔ہارمونیم اور لیس راج بجایا کرتا تھا۔اُس نے چھ سال کی عمر

میں اپنے بڑے بھائی سے پیانو بجانا سیکھا۔کالج کے ایام کے دوران وہ دھنیں بنانے لگا۔اُس کا پہلا مقبول گانا بنگالی میں تھا جس کے بول تھے۔''بچار پوٹے تمہار بچار'' مطلب نیا فیصلہ آ گیا ہے کیونکہ لوگ اب بیدار ہوئے ہیں۔بہت جلد سلیل چودھری اپنے آبائی گاؤں غازی پور منتقل ہوا اور وہ وہاں اپنے ماموں کے ساتھ رہنے لگا۔ملک میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔لوگ برٹش سامراج کے خلاف لام بند ہو چکے تھے۔سلیل چودھری بھی اس تحریک کے ساتھ جڑ گیا اور اُس نے کئی انقلابی گانے لکھے۔1944 میں جب وہ اپنی ایم اے کی پڑھائی کر رہا تھا، بنگال میں وبا پھیل گئی۔سلیل چودھری نے لوگوں کو سڑکوں پر دم توڑتے ہوئے دیکھا۔اس وبا میں پچاس لاکھ بنگالی لقمہ اجل بن گئے۔یہ وبا اور بھوک مری انسانی خودغرضی کی دین تھی۔جو چاول ان غریبوں کو ملنا چاہیے تھا وہ برٹش فوجیوں کو بھیجا جا رہا تھا جو جنگ میں ملوث تھے۔باقی کے چاول کو کالے بازار میں منہ مانگے داموں پر بیچ رہے تھے۔ان سارے واقعات نے سلیل چودھری کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا اور وہ پوری طرح سے حکومت مخالف تحریک میں شامل ہو گیا۔اُس نے اپیٹا اور کمیونسٹ پارٹی کی فل ٹائم ممبر شپ لے لی۔۔اُسکے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا۔دوستوں نے اُسے صلاح دی کہ گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ روپوش ہو جائے۔چار سال تک وہ حلیہ بدل کر اپیٹا کی ناٹک منڈلی کے ساتھ گاؤں گاؤں گھومتا رہا۔شروع میں سلیل چودھری نے اس ناٹک منڈلی میں بطور ایک بانسری وادن کے حصہ لیا۔بعد میں اُس نے گیت لکھے اور وہ اپنے ان جوشیلے گیتوں سے لوگوں کو محظوظ کرتا رہا۔اُس کے گانے لوگوں کی آواز بن کر رہ گئے اس دوراں وہ ناٹک اور گیت لکھتا رہا۔

اپیٹا میں کام کرنا بڑا کٹھن تھا۔اس میں بیشتر والنٹیر کے طور پر کام کرتے تھے جب کہ سلیل چودھری جیسے کچھ خوش قسمت تھے جنہیں چھوٹی موٹی تنخواہ ملتی رہتی تھی۔وہ زیادہ تر پیدل ہی سفر کرتے تھے۔کبھی کبھی ایسی نوبت بھی آجاتی تھی کہ کئی کئی دن بھوکوں رہنا پڑتا تھا۔سلیل چودھری کی مقبولیت دیکھ کر برٹش سرکار کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔اُس کے ناٹکوں پر پابندی لگائی گئی۔اگر پولیس کو بھنک بھی لگ جاتی تھی کہ ناٹک منڈلی کسی گاؤں پہنچی ہے اور وہاں پر اُن کا شو ہونا ہے تو لوگوں کو اس شو سے دور رکھا جاتا تھا۔اُن کی مار پیٹ کی جاتی تھی۔کئی ایک تو اس تشدد کی وجہ سے مر گئے۔سلیل چودھری چونکہ قانون سے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اس لئے اس آنکھ مچولی میں اُس کا بہت سارا مواد برباد ہو گیا۔کوئی معتبر پبلشر نہ ملنے کے باعث وہ اپنے گیتوں اور ناٹکوں کو کتابی صورت میں محفوظ نہ رکھ سکا۔

اپیٹا میں وہ زیادہ دنوں تک کام نہ کر سکا۔کیمونسٹ پارٹی میں اندرونی رسہ کشی چل رہی تھی۔کچھ لوگ سلیل چودھری کی مقبولیت سے خار کھانے لگے تھے۔کچھ لوگ اُس کی تخلیقی کاوشوں میں اپنی حصہ داری چاہتے تھے۔سلیل چودھری ان حالات سے خوش نہ تھا اور وہ کیمونسٹ پارٹی کو چھوڑنا چاہتا تھا۔ایک دن اُس نے اپیٹا کو الوداع کہہ دیا اور اُس کے بعد وہ کلکتہ لوٹ گیا۔سلیل چودھری کے تعلق سے کئی قصے مشہور ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ کلکتہ سے ٹرین میں بیٹھ کر بمبئی کے لئے روانہ ہوا۔پتا چلا کہ وہ راستے میں ہی غائب ہو گیا۔دوستوں نے اُس کی بڑی کھوج کی مگر وہ کہیں نہیں ملا۔بعد میں پتا چلا کہ وہ دو چار مہینے گاؤں گاؤں سنگیت کی تلاش میں پھرتا رہا۔اُس نے گاؤں کے لوک سنگیت کو نہ صرف سنا بلکہ اُسے جمع بھی کیا اور پھر وہ یہ سنگیت لے کر کلکتہ لوٹ آیا۔

سلیل چودھری کی پہلی بنگالی فلم ''پری برتن'' تھی جس کا سنگیت اُس نے کمپوز کیا تھا۔یہ فلم 1949 میں ریلیز ہوئی۔سلیل چودھری نہ صرف سنگیت میں مہارت رکھتا تھا بلکہ وہ ایک اچھا خاصا لیکھک بھی تھا۔وہ ایک بنگالی فلم کے لئے کہانی لکھ رہا تھا۔اپنے زمانے کا جانا مانا ایڈیٹر اور ہدایت کار ہریش کیش مکھر جی بمبئی سے کلکتہ آیا ہوا تھا۔ایک دن اُس کی ملاقات سلیل چودھری سے ہوئی جس نے اُسے اپنی نئی کہانی سنائی جس کا نام اُس نے ''رکھشا والا'' رکھا تھا۔رشی کیش مکھر جی کو یہ کہانی بیحد پسند آئی اور اُس نے سلیل چودھری کو صلاح دی کہ وہ یہ کہانی بمل رائے کو سنائے۔اتفاق سے بمل رائے بھی کلکتہ آیا ہوا تھا۔اُس نے بمل رائے کو یہ کہانی سنائی۔بمل رائے نے اُس سے کہا کہ وہ کل آ کر یہیں پر مجھ سے مل لے۔سلیل چودھری جب اگلے روز بمل رائے سے ملنے چلا گیا تو پتا چلا کہ اُسے بمبئی سے فوری بلاوا آ گیا تھا اسلئے اُسے جانا پڑا۔ایک ہفتے کے بعد سلیل چودھری کو بمل رائے کا ایک تار ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ اس کہانی پر فلم بنانا چاہتا ہے۔اس فلم کا نام رکھا گیا ''دو بھیگہ زمین'' جس کے کہانی کار کے ساتھ ساتھ موسیقار بھی سلیل چودھری ہی تھے۔یہ کہانی ایک غریب رکھشا والے کی تھی جو اپنی گروی پڑی زمین کو ساہوکار سے چھڑانے کے لئے کن کن مشکلوں اور مصیبتوں سے گزرتا ہے۔اس کہانی نے باکس آفس پر تو دھوم مچا ہی دی ساتھ ہی اسے کئی اعزازات سے نوازا بھی گیا۔اس فلم نے بمل رائے کو سربلندی عطا کی۔اس فلم کو نہ صرف اس سال کی بہترین فلم کا فلم فیئر ایوارڈ ملا بلکہ انٹرنیشنل کنا س فلم فیسٹول میں بھی اس فلم کو اعزاز سے نوازا گیا۔

فلم ''دو بھیگہ زمین'' نے سلیل چودھری کو بمبئی میں اس طرح پیوست کر دیا کہ اگلے چند سالوں میں اُس نے کئی فلموں کا صدا بہار اور روح پرور سنگیت پیش کیا۔یہ فلمیں تھیں ''براج بہو'' ''نوکری'' ''پریوار'' ''ٹانگے والی'' ''آواز'' ''جاگتے رہو'' ''مسافر'' ''چھایا'' اور ''آنند'' قابل ذکر ہیں۔سلیل دا کا سنگیت دوسرے سنگیت کاروں کے سنگیت سے بالکل الگ تھا۔اُس نے کسی سنگیت کار کی تقلید نہیں کی بلکہ اُس نے اپنا ایک اسٹائل ایجاد کیا جو لوگوں کو بیحد پسند آیا۔اُسکا سنگیت مغربی موسیقی اور ہندوستانی لوک سنگیت کا ایک حسین امتزاج تھا۔سلیل دا اپنے سنگیت میں وائلن کا بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔کمال کی بات یہ ہے بنگال کا ایک نوجوان جو کہ بنگال کے دیہی علاقے سے ایک بانسری ہاتھ میں لے کر شہر آ گیا تھا اور شروع میں اُس نے بنگال کے لوک سنگیت کو سیکھا

اوراس مقام تک پہنچنے کیلئے اُس نے زندگی کے کئی بہترین سال سنگیت کو ایک نئی سمت اور رفعت دینے میں صرف کئے ۔ یہ ایسا پہلا ہندوستانی سنگیت کار تھا جس نے ہندوستانی کلاسیکی سنگیت کو مغربی سنگیت میں اس خوبی کے ساتھ ضم کیا کہ اُس کا سنگیت سر چڑھ کے بولنے لگا۔اس سنگیت کا جادو بہت جلد دیکھنے اور سننے کو ملا ۔1957 میں اُس نے ریمو گنگولی کے ساتھ ''بمبئی یوتھ چوئر'' کے نام سے ایک میوزک بنک کھول دیا۔کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ سلیل چودھری کسی فلم کا سنگیت ترتیب دے رہا ہے جب کہ اُس کا پارٹنر کسی اور فلم کا بیک گراونڈ میوزک تیار کر رہا تھا۔فلم ڈویژن کی بیشتر فلمیں پس منظر موسیقی کے لئے سلیل چودھری کے پاس آیا کرتی تھیں ۔فلم ''انوکھی رات'' اُس کی ایک زندہ مثال ہے اس فلم کا موسیقار کوئی اور تھا جب کہ پس منظر سنگیت سلیل چودھری نے تیار کیا تھا۔

1958 میں ریلیز ہونے والی 'مدھومتی'' سلیل چودھری کی زندگی میں سنگ میل کی حثیت رکھتی ہے ۔اس فلم کا ایک ایک گانا نگینے کی طرح فلم میں فٹ کیا گیا تھا۔اس فلم نے باکس آفس پر دھوم مچادی ۔ یہ فلم بمل رائے کے بینر تلے بنی تھی اور اسمیں دلیپ کمار، وجینتی مالا ، پران اور جینت اہم کردار میں تھے ۔ اسکے گانے شلیندر نے لکھے تھے جب کہ سنگیت کار سلیل چودھری تھے ۔دلیپ کمار کی یہ خواہش تھی کہ اس کے پلے بیک کے لئے طلعت محمود کو لیا جائے جب کہ طلعت محمود لنڈن میں شوکر رہا تھا اور ریکارڈنگ کرنے سے قاصر تھا۔اصل میں اُن دنوں مکیش کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اس لئے طلعت محمود چاہتا تھا کہ مکیش یہ گانے گائے ۔اُس نے سلیل چودھری سے مکیش کی سفارش کی ۔مکیش نے بھی سلیل چودھری کو مایوس نہیں کیا۔اُس نے ایک ایک گانے میں جان ڈال دی۔فلم نے تو تہلکہ مچا ہی دیا، سب سے زیادہ اس فلم کے سنگیت نے لوگوں کو دیوانہ بنا ڈالا ۔ یہ سنگیت سن کے فلم بین کسی اور دنیا میں کھو جاتے تھے ۔اس سنگیت کو سن کے جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ نا قابل بیان تھی ۔ایسا لگتا تھا جیسے فلم بین اُس رومانٹک اور طلسمی ماحول میں پہنچ گئے ہوں ۔بمل رائے جو ''مدھومتی'' سے پہلے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔اس فلم نے نہ صرف بمل رائے کو قرض سے آزاد کر دیا بلکہ اُس کی جھولی نوٹوں سے بھر دی۔اس فلم کے لئے سلیل چودھری کو بہترین سنگیت کار فلم فیئر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

''مدھومتی'' کی بے پایاں کامیابی کے بعد سلیل چودھری نے 1959 سے لے کے 1962 تک پندرہ فلموں کو اپنے سحر انگیز سنگیت سے آراستہ کیا جن کا نام تھا،''ہیرا موتی''''جواہر''''ہنی مون''''قانون''''پرکھ''''اُس نے کہا تھا''''چار دیواری''''چھایا''''کابلی والا''''مایا''''میم دیدی''''سپنے سہانے ''''ہاف ٹکٹ''''جھولا'' اور''پریم پترا''۔ان پندرہ فلموں میں سے فلم ''پرکھ''فلم ''اُس نے کہا تھا''''چھایا''''مایا'' اور''ہاف ٹکٹ'' کا سنگیت کافی بھی کافی مقبول ہوا تھا البتہ''مدھومتی'' والی کامیابی کسی اور فلم کو نہیں ملی جس کے لئے اُس نے کافی جدوجہد بھی کی مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا اور یہ کسک لے کر وہ جیتا رہا۔یہ اُسی مایوسی اور جھلاہٹ کا نتیجہ تھا کہ اُس نے ہندی فلموں میں سنگیت دینا چھوڑ دیا ۔بیس سال بنگالی اور ہندی فلموں کی نذر کرنے کے بعد اُس نے 1964 میں ملیالم فلموں کا سنگیت دینا شروع کیا۔مزے کی بات یہ تھی کہ سلیل چودھری بنگالی بابو جب کہ فلمیں ملیالم میں۔ ملیالم کیرلا واسیوں کی مادری زبان ہے ۔سلیل چودھری نے ستائیس ملیالم فلموں کو اپنے مدھ بھرے سنگیت سے آراستہ کیا۔سلیل چودھری کی پہلی ملیالم فلم ''چمبین''تھی جس کے ہدایت کار رامو کیرت تھا۔وہی سلیل چودھری کو ملیالم فلموں میں لے آئے تھے۔''چمبین''اسی نام کے ایک مشہور ناول پر مبنی تھی جس کے لیکھک ملیالم زبان کے مشہور رائٹر تھا کزے شیو شنکر پلے تھے ۔یہ فلم ملیالم آرٹ میں سنگ میل کی حثیت رکھتی ہے ۔اس فلم کو بے پناہ کامیابی ملی ۔اسے صدر جمہوریہ کی طرف سے 1965 میں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔اس فلم کے لاجواب گیت اور سلیل چودھری کی بے مثال دھنوں کو لوگوں نے بیحد پسند کیا۔اس فلم کی وجہ سے سلیل چودھری کیرلا میں ایک جانا مانا نام بن کے رہ گیا۔

سلیل چودھری جوہری کی نظر رکھتا تھا۔اُس کے گروپ میں ایک لڑکا گٹار بجاتا تھا۔سلیل چودھری اُس کی صلاحیت کو پہچان گیا تھا۔ایک دن اُس نے اپنے ایک ملیالم دوست سے کہا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکا ہندوستان کا بہت بڑا کمپوزر بنے گا۔چند سال بعد ملیالم فلموں میں ایک نئے سنگیت کار نے دستک دی جس کا نام الیاراجہ تھا۔ یہ وہی گٹار بجانے والا لڑکا تھا جو بعد میں ملیالم فلموں کا نمبر ایک سنگیت کار بن گیا۔اے آر رحمان کے والد آر کے شیکھر سلیل چودھری کا ارینجر تھا۔اے آر رحمان نے اپنے ایک انٹرویو میں ایک بار کہا تھا کہ اُس کے سنگیت پر سلیل چودھری کی موسیقی کا بہت زیادہ اثر ہے کیونکہ سلیل چودھری کے سنگیت نے اُسے بیحد متاثر کیا ہے۔

سلیل چودھری کے بارے میں کئی سارے قصے مشہور ہیں ۔ایک اور قصہ سن لیجئے ۔اس کا تعلق سلیل چودھری اور مشہور گلوکار اور سنگیت کار ہیمنت کمار سے ہے ۔زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے سے جلن ہونا انسان کی فطرت ہے ۔سلیل چودھری بھی اس سے مبرا نہیں تھا۔کہا جاتا ہے کہ وہ ہیمنت کمار کے اتنے قریب تھا کہ ایک بار ایک نیوز رپوٹر نے اُس سے ہیمنت کمار کے بارے میں پوچھا تو سلیل چودھری نے جذباتی ہو کے کہا کہ اگر اُسے کبھی گانے کا موقع ملا تو وہ ہیمنت کمار کی آواز میں گانے کی کوشش کرے گا۔اتنی عزت اور عقیدت تھی ہیمنت کمار کے تئیں اُس کے دل میں۔کئی لوگوں کو ان کی قربت راس نہ آئی۔کچھ لوگوں نے جا کر ہیمنت کمار سے کہا کہ سلیل چودھری کہتا ہے کہ اگر اُس نے اُس کے گانے نہ گائے ہوتے تو وہ اتنا مقبول نہ ہوتا۔یہ بات ہیمنت کمار کے کلیجے پر تیر کی طرح لگی۔رشتے بگڑ گئے ۔یہی منافق سلیل چودھری کے پاس آئے اور ہیمنت کمار کا حوالہ دیکر کہنے لگے کہ اگر ہیمنت کمار نے اُس کے گانے نہ گائے ہوتے تو وہ اتنا کامیاب نہ ہوتا۔منافقوں کی وجہ سے ان دونوں کے رشتے میں

اس قدر دراڑ پڑ گئی کہ برسوں وہ ایک دوسرے سے دور رہے۔ اُنہوں نے کئی سالوں تک ایک ساتھ کام نہیں کیا۔ جب غلط فہمیاں دور ہوگئیں تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہیمنت کمار کی آواز میں وہ کشش نہ رہی تھی اور سلیل چودھری کا سنگیت بھی اپنی دھار کھو بیٹھا تھا۔

1970 میں اُس نے بمبئی کو الوداع کہہ دیا اور وہ دل برداشتہ ہو کر کلکتہ لوٹ گیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ سنگیت کا مزاج بدل چکا ہے۔ اب لوگوں کو وہ پہلے جیسی میلوڈی نہیں بلکہ شور وغل والا سنگیت چاہیے۔ اُس نے کلکتہ میں ایک ریکارڈنگ اسٹوڈیو کھول لیا جس کا نام ''ساونڈ آن ساونڈ'' رکھا گیا۔ اُس نے وہاں پر کئی پروجکٹس پر کام کیا۔

سلیل چودھری ہمہ جہت فن کار تھا۔ وہ ایک کامیاب موسیقار ہی نہیں، وہ ایک لاجواب آرینجر کے ساتھ ایک کامیاب گیت کار بھی تھا اور ساتھ ہی وہ ایک سلجھا ہوا کہانی کار بھی تھا۔ فلم ''دو بھیگھہ زمین'' ''اُس نے کہا تھا'' ''پنجرے کے پنچھی'' وغیرہ کا کہانی کار وہی تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ہدایت کار بھی تھا۔ فلم ''پنجرے کے پنچھی'' کی کہانی بھی اُسی کی تھی، سنگیت بھی اُسی کا اور اس فلم کا ہدایت کار بھی وہی تھا۔ اس فلم کے مرکزی کرداروں میں مینا کماری، بلراج ساہنی اور محمود تھے۔ یہ فلم 1966 میں ریلیز ہوئی۔ سلیل چودھری کئی طرح کے ساز بجانے میں اس قدر ماہر تھا کہ سننے والے دانتوں تلے اُنگلی دبا کر رہ جاتے تھے۔

1952 کے جولائی کے مہینے میں سلیل چودھری نے ایک مصور جیوتی چودھری کے ساتھ ایک مندر میں جا کر بیاہ رچا لیا۔ جیوتی سے اُس کی تین بیٹیاں ہوئیں جن کے نام ہیں آلوکا، تلیکا اور لیپیکا۔ بعد میں اُس نے دوسری شادی کی۔ اس بار جس سے اُسے محبت ہوگئی اُس کا نام سبھیتا بینرجی تھا جو کہ ایک گلوکارہ تھی۔ اس سے اُسکی دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہوئے۔ جن کے نام ہیں انترا اور سچاریہ جب کہ بیٹوں کا نام ہے سکنتا اور سنجوئے۔ سنجوئے چودھری باپ کے ہی نقش قدم پر چلا۔ اُس نے موسیقی کو ہی اپنا پیشہ چنا۔ وہ ہندی فلموں کا ایک کامیاب سنگیت کار ہے۔ اُس نے اب تک سو کے قریب فلموں میں سنگیت دیا ہوگا۔

سلیل چودھری جو کہ ہندی فلموں سے سنیاس لے چکا تھا اُس کو رشی کیش مکھرجی پھر سے ہندی فلموں میں لے آئے اور اُسے 1970 کی کامیاب فلم ''آنند'' کے لئے سنگیت دینے کی ذمہ داری سونپ دی۔ سلیل چودھری نے منا ڈے کی آواز میں ریکارڈ کئے گئے اس گانے کو اپنی سمفنی سے امر بنا دیا۔ وہ گانا تھا ''زندگی کیسی یہ پہیلی ہائے، کبھی تو ہنسائے کبھی یہ رلائے''۔ 1970 سے لے کے 1995 تک اُس نے کئی بڑے بینر کی فلموں کو سنگیت سے آراستہ کیا۔ ان فلموں میں ''رجنی گندھا'' ''میرے اپنے'' ''چھوٹی سی بات'' ''کالا پتھر'' اور ''سوامی وویکانند'' قابل ذکر ہیں۔

سلیل چودھری نے ہندوستان کی تیرہ زبانوں کی فلموں کے لئے گانے تیار کئے جن میں پچھتر ہندی فلمیں، اکتالیس بنگالی فلمیں، ستائیس کے قریب ملیالم فلمیں، چند مراٹھی، تامل، تیلگو، کنڑ، گجراتی، اُڑیا، اور آسامی فلمیں۔ اُس نے ہر زبان میں بے مثال اور خوبصورت گانے پیش کئے۔ اُسے کئی ساز بجانے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ ایک لاجواب کمپوزر اور ارینجر تھا۔ وہ پس منظر کی موسیقی تیار کرنے میں ید طولی رکھتا تھا۔ بمل رائے کی ''دیوداس'' کا سنگیت کار تو سچن دیو برمن تھا مگر اُس کی پس منظر کی موسیقی کے لئے سلیل چودھری کی خدمات لی گئی تھیں۔ اسی طرح گلزار کی فلم ''موسم'' کا سنگیت کار مدن موہن تھا جب کہ اُس کا بیک گراونڈ سنگیت سلیل چودھری نے تیار کیا تھا۔ اُس نے کئی ساری بڑی فلموں کا بیک گراونڈ سنگیت تیار کیا تھا۔

سلیل چودھری نے بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں نیا جوش بھرنے کے لئے 1971 میں ''بنگلہ امر بنگلہ'' نام سے ایک البم بنایا جس نے آزادی کی اس تحریک میں نیا جوش اور ولولہ بھر دیا۔ 1990 میں جب سلیل چودھری نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا تو اُس کا ڈھاکہ میں ایک عوامی لیڈر کی طرح استقبال کیا گیا۔ 2012 میں بعد از مرگ بنگلہ دیش سرکار نے سلیل چودھری کو بہت بڑے اعزاز سے نوازا۔

پانچ ستمبر 1995 کو سلیل چودھری نے اس جہاں فانی کو الوداع کہہ دیا۔ وہ جسمانی طور پر چلا تو گیا مگر اپنا مدھر اور رس بھرا سنگیت چھوڑ کے گیا جس نے اُسے صدا کے لئے امر کر دیا۔

''اصرار''

چھٹی کلاس تک اُردو کے بھاری بھرکم الفاظ سے میری شناسائی کا یہ حال تھا کہ مَیں ''بذلہ سنجی'' کو گالی سمجھتا تھا۔ ایک محفل میں ایک باریش مولوی انکل نے جب اپنے ہی جیسے ایک متبرک صاحب سے کہا کہ ''آپ بڑے بذلہ سنج ہیں'' اور وہ جواباً ہاتھا پائی کی بجائے محض مُسکرا دیے تو مجھے اُس متشکرانہ مسکراہٹ پر برسوں حیرت رہی تاوقتیکہ مَیں نے چُھپ چُھپ کر فیروز اللغات میں ''بذلہ سنجی'' کا مطلب نہیں دیکھ لیا۔

اور آپس کی بات ہے کہ ایسا ہی مُبہم مجھے ''خندہ پیشانی'' پر بھی تھا! لیکن ''طوائف الملوکی'' کے جو لذیذ معنی مَیں سمجھتا تھا وہ تو مَیں کسی صورت نہیں بتا سکتا چاہے آپ ان باکس میں آ کر لاکھ اصرار کریں۔

مشتاق احمد یوسفی

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

ربیع الاوّل کے مہینے کا آغاز مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے صدقے ہماری تمام ملکی وقومی مشکلات دور فرمائے اور مقننہ، عدلیہ، صحافتی وسوشل میڈیا، افواج سمیت تمام اداروں کو انصاف کے رستے پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ مجھے تو علامہ اقبال رحمۃ اللہ کا ایک شعر ذرا سے تصرّف کے ساتھ یاد آرہا ہے:

نہ سمجھو گے تو مِٹ جاؤ گے پاکستان والو تُم
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

چہارسُو کے شروع کے تقریباً چون صفحات پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا اور نہ اس اعزاز پر شکریہ ادا کروں گا کہ یہ شمارہ اتنے شاندار قرینے کے ساتھ مجھے قرطاسِ اعزاز سے نواز گیا، کہ مجھے شکریے اور ممنونیت کے تمام الفاظ رسمی اور کھوکھلے لگ رہے ہیں۔ میرے دل کی گہرائیوں میں آپ کے لیے جو یکراں محبت ہے اس کی گہرائی سے آپ بخوبی واقف ہیں، اور یہ بھی سچ ہے کہ لفظوں کا سہارا لے کر کبھی میں نے اس محبت کا اظہار کیا، نہ آپ نے۔ چنانچہ میں خاموش رہتا ہوں اور آپ یہ خاموشی کی زبان سُن لیں۔ البتّہ یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس شمارے کی اشاعت کے بعد سے مجھے پاکستان اور بیرونِ پاکستان دوستوں کے فون اور میسجز آرہے ہیں جن میں وہ اس اعزاز پر مجھے مبارکباد پیش کررہے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ''چہارسُو'' کی آن لائن اشاعت کی رسائی وہاں وہاں تک بھی ہے جہاں تک کاغذی پیرہن نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسے ایک BLESSING IN DISGUISE بھی کہا جاسکتا ہے۔

شمارے کے دیگر تمام مشمولات کا مطالعہ بھی کرلیا ہے مگر ان دنوں لکھنے کے لیے زیادہ دیر لیپ ٹاپ پر بیٹھنے سے کمر میں درد ہوجاتا ہے (ویسا نہیں جو کسی زمانے میں چودھری نثار احمد، میاں شہباز شریف اور اسحاق ڈار کو ہوا کرتا تھا۔ وہ سیاسی تھا، یہ اصلی ہے!)۔ چنانچہ مختصراً عرض کروں گا کہ محمد اسد خاں، شمؤئل احمد اور تابش خانزادہ صاحبان کے افسانے اچھے لگے۔ غزلوں میں محمود شام، آفتاب مضطر، اور جنید آزر کی غزلوں نے اپنے اچھوتے پن اور جدتِ اظہار کے سبب متاثر کیا۔ البتہ اِس شمارے میں کچھ غزلیں فنی لحاظ سے کمزور اور قافیے ردیف کے التزامات سے مبرّا محسوس ہوئیں جن پر آپ کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ''چہارسُو'' کے معیار کو کسی صورت گرنے نہ دیں۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

برادر محترم گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

چہارسو کا تازہ شمارہ بذریعہ برقی ڈاک وصول ہوا۔ آپکا بے حد شکریہ۔ محترم نسیم سحر اور انکی ادبی کاوشوں سے تعارف باعث انبساط ہوا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نسیم سحر صاحب شوقیہ شاعری نہیں کرتے بلکہ یہ ذوق لطیف ان کے خون میں رچا بسا ہے۔ ان کے خاندان کی علمی و ادبی خدمات لائقِ صد تحسین ہیں اور سحر صاحب کی ادبی تخلیقات بہت معیاری اور لائق توجہ بھی ہیں۔ نامور اہل علم، دانشور اور زمانہ شناس ادیبوں نے انکے ادبی کارناموں کو سراہا ہے۔ آپ کا انداز گفتگو، چنیدہ سوالات کی ترتیب، ترکیب، اہمیت اور موزونیت نے تفصیلی تعارف کو قارئین کے لئے بے حد دلچسپ اور معتبر بنادیا ہے۔ یہ آپ کے قلم کا طرہ امتیاز ہے۔ تفصیلی رائے مکمل مطالعہ کے بعد ارسال کرونگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے زور قلم کو مزید توانائی اور جلا بخشے۔

پروفیسر عبدالوسیم صدیقی (اسلام آباد)

گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ اس بار چہارسو میں جناب نسیم سحر سے مفصل ملاقات ہوئی۔ ان سے غائبانہ تعارف تو عرصے سے ہے مگر ان کی شخصیت اور تخلیقی سفر کی بابت ایک بھرپور خاکہ پہلی بار سامنے آیا تو اچھا لگا بلکہ بہت اچھا لگا! نسیم سحر کا ادبی کام پرشکوہ مقدار کو ظاہر کرتا ہے جو ان کی پیہم کاوش کا اعتراف کراتا ہے۔ واقعہ یہ ہے اب جہد کے جادے پر گامزن مسافر خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں کیونکہ سوشل میڈیا کے 'فانوس خیال' نے 'فریب کاری' کو فروغ دے کر لکھنے اور پڑھنے والوں کو بھٹکا دیا ہے۔ ایک لمبی اننگز کھیل کر معیاری ادبی کام کی ٹھوس فہرست اب قصہء پارینہ ہونے جارہی ہے۔ بس دو دو چمکدار سی سطریں اچھالنے کا رواج عام ہورہا ہے، اس کے معا''بعد دیکھتے ہی دیکھتے سب تحلیل ہونے پر آمادہ! اب اس 'دام خیال' سے مربوط ہونے کا کیا دعویٰ کیا جائے کہ 'خوگر پیکر محسوس' کے اپنے مطالبات ہیں۔

حقیقت یہ ہے نسیم سحر کی کتب میں صنفی اور موضوعاتی سطحوں پر تحیر زا تنوع ملتا ہے۔ انھوں نے غیر معمولی وابستگی کے ساتھ مدت العمر کاغذ قلم کے رشتے کو نبھایا ہے۔ سو، یہ نقش تادیر قائم رہے گا! انھیں سنجیدہ فکر معاصرین نے فیاضی کے ساتھ سراہا، جس کے وہ حق دار تھے۔ اس خاص شمارے میں ان سے گفت وشنید خاصی دلچسپ ہے۔ سوالات کی نوعیت سوچ کر ایسی رکھی گئی کہ مسئول سے وابستہ انکشاف ذات کا مقصد پورا ہوکر رہا۔ اس طرح قاری بلاشبہ اپنے اس ادیب/شاعر کے اور قریب ہوا ہے۔

انتہائی دیدہ زیب، جاذب اور باوقار ''قرطاس اعزاز'' کی پیش کش پر ''چہارسو'' کی مجلس ادارت کے لیے مبارک باد!!

جمیل احمد عدیل (لاہور)

جناب گلزار جاوید، آداب۔

چہارسو کا نسیم سحر نمبر نومبر دسمبر ۲۰۲۲ء کا شمارہ اگست کے آخر میں ہی

موصول ہو گیا۔لوگ وقت پر رسالہ نہیں نکال پاتے ،آپ ایڈوانس میں چلتے ہیں۔ اس سے آپ کی کام سے Commitment اور عالمی منظر نامے سے باخبری ظاہر ہوتی ہے۔گلنار آفرین پر لکھے خاکے کا اندازِ بیان دلچسپ ہے جسے پڑھ کر مصنف کی شوخ اور خوش وخرم کا اندازہ ہوتا ہے جس کی تصدیق انہوں نے خود براہِ راست میں کر دی ہے۔ایک اہم سوال کا ذکر آپ کے سوالوں میں اچھا لگا کہ ''اردو زبان وادب بالخصوص پاکستان میں گروہ، دھڑوں اور گروپ بندی کے حوالے سے ہمیشہ تنقدی کی زد میں رہی ہے'' یہ صورت حال صرف پاکستان میں اردو زبان کی نہیں سبھی زبانوں اور سبھی جگہ، خاص کر ایشیائی ممالک میں یہ چلن عام ہے۔انٹرویو دلچسپ ہے۔نسیم سحر کو غزل کا شاعر کہا گیا ہے حالانکہ اُن کی حمد، نعت، نظمیں، رباعی، قطعہ اور ہائیکو بھی پڑھنے کو ملیں اور اُن کی غزلوں نے زیادہ متاثر کیا۔ایک کامیاب گوشہ نکالنے کے لیے میری جانب سے دلی مبارک باد قبول کریں۔

اسد محمد خان نے ''مئی دادا'' کا اچھا خاکہ کھینچا ہے۔دلچسپ انداز میں اُن کی شخصیت اور کہانی بیان کی ہے۔شموئل احمد صاحب نے موجودہ صورت حال کو اپنے مخصوص انداز میں کہانی میں مختلف رنگ بھرنے کے لیے بڑے رنگین انداز سے کہانی شروع کی اور پھر ایک کڑوے سچ کو کہانی میں بیان کرنے کی جرأت کی ہے۔ اُن کی جرأت کو سلام مگر کہانی یہ سوچنے کو مجبور ضرور کر دیتی ہے کہ کوئی عورت جو مرد سے شدید محبت کرتی ہو، وہ کسی سیاسی پارٹی کی انتہائی وفادار ہو کر بھی اپنے شوہر، اپنے محبوب کی مخالفت کے بعد اُس سے انتہائی نفرت بھی کر سکتی ہے کہ اپنے ہی محبوب کی جان لے لے؟ دیپک کنول نے ''شیشے کا گھر'' میں کشمیر کی سرزمین پر بکھرے درد اور وہاں کی حقیقی صورت حال کو بہت دل کو چھو جانے والے انداز میں بیان کیا ہے۔ انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں، خوبصورت کہانی تحریر کی۔وحشی سعید کی ''آنسو کیوں'' دوستوں کو محبت کی مختصر مگر اچھی کہانی ہے۔تابش خانزادہ کی کہانی ''جیت'' اچھا سبق دیتی ہے۔وکیلوں کے چکر میں دولت بھی گئی اور رشتے بھی۔آدھی موت کا جشن ریٹائرمنٹ کے دہانے پر کھڑے شخص کی نفسیات کو بیان کرتی ہے حالانکہ ان کا دوسرا پہلو بھی انسان کو دیکھنا اور سوچنا چاہیے کہ شکر ہے رب کا اب باقی کی زندگی وہ اپنی مرضی سے گزارے گا،نوکری کی پابندی میں نہیں۔اصلی زندگی تو ریٹائرمنٹ کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔وسیم عقیل شاہ کی ''طرفہ تماشا'' بھی آج کے دور کی عکاسی کرتی ہے۔ ہر دور میں محبت، وفا، مجبور، عیاشی اپنے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ یہ کہانی بھی محبتوں، خواہشوں، مجبوریوں اور وفاؤں کو بے نقاب کرتی ہے۔ارم نعیم کی کہانی ''کُم کُم'' اچھی کوشش ہے۔سبھی کہانیاں الگ الگ رنگ کی دلچسپ ہیں۔

ناول خاکِ شفا میں پیرزادہ انوار نے میواتی لوازمات کے نام اور چورما بنانے کی ترکیب، میوات کی تحریک، مہاکوی سعد اللہ خان کی تفصیل، وہاں کا موسم، تہذیب، موسیقی اور پوشاک کے بارے میں جو تفصیل دی ہے، اس سے تو لگتا ہے اُن کا تعلق اُس زمین سے ضرور ہے۔اس ناول کی ایک خاصیت یہ ہے کہ مصنف اپنی تحریر پڑھتا نہیں کھلی آنکھوں سے سب کو دکھاتا ہے۔مشاعرے کا جو سماں باندھا ہے پڑھ کر لگتا ہے ہم خود اُس مشاعرے میں شریک ہیں۔ظہیر دہلوی کی غزل: ''وہ کسی سے تم کو جو ربط تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' پڑھ یکلخت مومن کی غزل ''وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا۔۔۔'' یاد آ گئی۔ذہن میں سوال یہ اٹھا کہ کس شاعر نے کس کی نقل کی ہوگی۔اس وقت ریختہ پر تلاش کیا تو پتا چلا کہ مومن کا دور (۱۸۰۰۔۱۸۵۲) کا ہے جب کہ ظہیر دہلوی ان کے بعد آئے (۱۹۱۱۔۱۸۲۵) مومن اور ظہیر دہلوی دونوں کی غزلیں وہاں شامل ہیں۔حالی نے تو مشاعرہ ہی لوٹ لیا۔سامعین کا بیچ بیچ میں ٹہوکا دینا، بھائی، بہت خوب، کہانی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔اب کس طرف اس کا رخ بیٹھتا ہے یہ تو آئندہ قسط پڑھ کر ہی پتہ چلے گا۔بہرحال دلچسپ معلومات اور واقعات ضرور پڑھنے کو مل رہے ہیں۔

جمیل عثمان کا اپنے والد صاحب پر لکھا خاکہ ''ہجرتوں کا عذاب'' اچھا ہے۔اُن کی زندگی کے متعلق اور خاص طور سے ہجرتوں کے بارے اُن کے گوشے میں شامل انٹرویو میں پہلے بھی پڑھ چکی ہیں۔ڈاکٹر فیروز عالم کا لکھا مضمون ''کائنات میں جنس کا کردار'' معلوماتی تو ہے ہی مگر اسے پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ مصنف سائنس سے جڑنے کے باوجود ادب کے ساتھ کس قدر گہرا جڑا ہوا ہے۔ان کا اندازِ بیان اس بات کی گواہی دیتا ہے۔غالب کو یاد کرنا وہ بھول گئے۔ نظموں کے حصے میں چندر بھان خیال، ساگر ترپاٹھی کی نظم، فیض منصور فیض کا بڑھاپا بہت پسند آیا۔باقی شاعری اور شعر پر لکھا مضمون کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔

سب سے پہلے فلرز پر نظر جاتی ہے۔ممتاز مفتی کا ''لبّیک'' لاجواب۔ Important life lesson صرف فلر ہی نہیں، ایک مکمل کہانی ہے جو بزرگوں کا حال بیان کرتی ہے۔الزائمر کے متعلق بھی بڑی مفید جانکاری دی۔کل ملا کر اس بار بھی آپ نے دلچسپ، معیاری اور معلوماتی شمارہ ہمیں پڑھنے کو دیا جس کے لیے آپ مبارک باد اور شکریہ کے حقدار ہیں۔اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آپ کو اسی طرح کام کرنے کی ہمت عطا کرے۔(آمین)

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

محترم گلزار جاوید، آداب۔

محترمہ رینو بہل کی وساطت سے چہارسو کا تازہ شمارہ (نومبر۔دسمبر ۲۰۲۲ء) پڑھنے کا موقع ملا۔شمارہ جاذبِ نظر ہے۔مواد معیاری ہے۔ نسیم سحر کا زندگی نامہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ان کے لکھے خاکے ''مردانہ ڈبے کی زنانہ سواری'' اور ''میرا بہادر دوست'' (ترجمہ) اچھے لگے۔کھنک دار زبان استعمال کی گئی ہے۔محترمہ رینو بہل نے سکھ جیت کی پنجابی کہانی ''برف'' کا ترجمہ خوب کیا ہے۔ کہانی کے پلاٹ سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہے لیکن فطری تقاضے کا برمحل اعتراف ہے۔دیپک کنول کا سلسلہ وار کالم ''ایک صدی کا قصہ'' میں مشہور فلمی اداکارہ شیاما کی زندگی کی روداد تفصیل سے بیان کی گئی ہے اور دلچسپ ہے۔

شمول احمد کا افسانہ ''دیش دروہی'' ہمارے ملک میں پھیلی سیاسی اور مذہبی اجارہ داری کی ایک مثال ہے۔غیاث احمد گدی کا افسانچہ ''بابا لوگ'' بمبیا زبان کا ایک نمونہ ہے جو ہم اکثر اپنی فلموں میں سنتے ہیں۔دیپک کنول کشمیر کے منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ان کے پلاٹ کشمیر کی کشمیریت اور ریشیت سے کشید

کیے ہوتے ہیں۔ چہارسو کے تازہ شمارے میں بھی اُن کا افسانہ ''شیشے کا گھر'' ایک عمدہ افسانہ ہے اور ملی ٹینسی کے دور میں ہم کشمیری کن مسائل سے دوچار ہیں، اس کی تصویر پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر خالد حسین (جموں)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (جلد ۳۱ شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۲۲ء) اپنی منفرد تحریروں سے آراستہ نظر نواز ہوا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز منفرد اور سینئر شاعر و نثر نگار نسیم سحر صاحب کے نام ہے۔ براہِ راست کا مکالمہ مفید اور دلچسپ رہا۔ ساتویں جماعت سے شاعری کا شغف کا نتیجہ ہے کہ شعری خزینہ تقریباً ہر معروف صنف میں بہت زیادہ ہے۔ آپ کا سوال ''اسرار'' اور ''خواب'' والے کا جواب تفصیلی ہے۔ ابتدائی زمانے اور ۴۵ مسلم ممالک اور کچھ غیر مسلم ممالک میں قیام اور تفریح کا میابی حیران کن ہے۔ محمد انعام الحق نے نسیم سحر کے سوانحی کوائف ادبی کارگزاری کو سلیقے سے نذرِ قرطاس کیا ہے۔ محترم فاری شا اور محترمہ عطیہ سکندر علی نے صاحبِ قرطاس کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کا انتخاب متنوع موضوعات کے پیشِ نظر کیا ہے۔ نسیم سحر صاحب کی شخصیت اور فکر و فن پر اچھے مضامین ہیں مجھے خصوصاً خاور اعجاز، خورشید رضوی اور شاہد انوار کی تحریریں پسند آئیں۔ لاجواب گوشہ ہے۔ شان الحق حقی مرحوم کی سدا بہار غزل نے بہت لطف دیا۔ محمود شام کی غزل خطرناک ہے کچھ چنیدہ اشعار:

کبھی موسموں کے سراب میں کبھی بام و در کے عذاب میں
وہاں عمر ہم نے گزار دی جہاں سانس لینا محال تھا
(اعتبار ساجد)

اسی دوران میں اُس نے بساطِ غم الٹ ڈالی
زمانہ جب مرے پاؤں کی ٹھوکر ہونے والا تھا
(جنید آزر)

کل جنہیں طمغے ملے ملک سے غداری پر
طعنہ زن بھی وہ تو ہیں میری وفاداری پر
(ڈاکٹر ریاض ساغر)

رکھ دیے ہونٹ اس نے ہونٹوں پر
پھر ہوا کیا میاں نہیں معلوم
(انجم جاوید)

وہ اپنی کا دشمن بنا ہے جانے کیوں!
فقیہہِ شہر کو حسرت ہے شاہ زاری کی
(فیض الامین فیض)

اسد محمد خان کا افسانہ ''مئی دادا'' ایک شاہکار تخلیق ہے۔ ایسے ماحول، مکالمے، پیش کش اور کہانی کی چستی کے اعتبار سے یاد رہ جانے والا افسانہ ہے۔ قاری اس سے اپنی سوچ کے اعتبار سے سبق اور اپنے حصّے کی روشنی لے سکتا ہے۔ شموئل احمد ایک جرأت مند افسانہ نگار ہیں انہوں نے اہم اور جلتے ہوئے ہوئے موضوعات پر لکھا ہے مگر یہ افسانہ ''دیش دروہی'' بالکل مختلف ہے ایک لڑکی جو اپنے نظریات، عشق اور ملاپ میں جنون کی حد تک جانے کو تیار رہتی ہے۔ مضبوط افسانہ ہے۔ وسیم عقیل شاہ کا افسانہ ''طرفہ تماشا'' اپنی بنت کے اعتبار سے کامیاب افسانہ ہے۔ مشتاق احمد وانی کا افسانہ ''آدھی موت کا جشن'' پُر درد کہانی ہے۔ ہیڈ ماسٹر کا کردار بڑی محنت سے تخلیق کیا ہے۔ افسانے کے اختتام پر غریب استاد کے اندر کا دکھ نمایاں ہوتا ہے بل ادا کرنے کا لمحہ خاصا تکلیف دہ تھا۔

''خاکِ شفا'' ناول کیا ہے ایک جہان آباد ہے۔ میوات کے گاؤں کے نام وہاں کے پکوان (چورما، مال پوا، ہرا چھولیا، بیسن کی روٹی) میواتی پگڑیوں، رسم و رواج کی تفصیل، بانسری، سارنگی رقص، لباس، بنجر زمین پر میلے کا سماں، کسوڑی گاؤں کا ماحول، شاہ صاحب کا کردار، سرخ پگڑی، سفید کڑا، عینک کیا خوب منظر کشی کی ہے۔

پیرزادہ آلِ انوار صاحب آپ نے جو مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال تحریر کیا ہے میں ''دلی کا آخری یادگار مشاعرہ'' کی طرح میوات کا یادگار مشاعرا کا نام دوں گا۔ سخی لکھنوی، مرزا حاتم علی بیگ۔ عبدالغفور نساخ، سید مقصود علی لکھنوی، سفیر بلگرامی، ظہیر دہلوی اور دیگر کا ذکر کلام، ادبی جملے بازی

ہجر میں غم بھی ایک نعمت ہے
یہ نہ ہوتا تو آج کھاتے کیا

پنڈال سے آواز آئی ''جوتا'' کیا بات ہے۔ حالی کے آنے پر سرسید اور مسدّس حالی کی صدائیں، حالی مرحوم کا پُر درد خطاب اور کلام، سرسید کا مسدّس حالی کے متعلق مشہور قول، بے شمار تحسین۔ دل کر رہا تھا کہ یہ تحریر ختم نہ ہو۔

دیپک کنول نے شیاما (خورشید) کی داستان محبت، اداکاری کا شوق، کامیابیاں اور اختتام زندگی کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی اہم تحریر ''کائنات میں جنس کا کردار'' نفسیاتی اور سماجی حوالے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جمیل عثمان کے اپنے والد کی شخصیت پر پُر اثر تحریر ''ہجرت'' کے پس منظر میں ہے انسان سوچتا کیا ہے مگر تقدیر فیصلے کچھ اور کرتی ہے کہ اپنے پیاروں کو آخری کندھا بھی نہ دے سکے۔ رینو بہل نے اچھی کہانی منتخب کی ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم، آصف عمران، رینو بہل اور رعنا کوثر کے خط تجزیاتی ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

آپ نے اس بار کے چہارسو کو حمد و نعت کے نامور شاعر، میرے عزیز دوست اور چہارسو کے محبوب لکھاری کے نام کر کے میری طرح بہت سے دلوں کو پشوری کیا ہے۔ نسیم سحر کی شاعری اور نثر کو پڑھ کر قاری پر ایک قسم کا سحر طاری ہو جاتا ہے۔ نسیم بھائی نے اپنی زندگی ایک ایک لمحہ اردو لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے میں گزارا ہے۔ اس تخلیق پر چہارسو کے سب عملے کو مبارک باد۔

آیئے باقی چہارسو پر کچھ باتیں ہو جائیں۔ جب سے پیرزادہ آلِ انوار کا خاکِ شفا شروع ہوا ہے آپ کے افسانوں کا سلسلہ کٹ گیا لیکن پیر جی کا

ناول آپ کے افسانوں کا سا مزہ دیتا ہے۔ناول کے ہر پیراگراف میں میرے جیسے کم علم انسان کے لیے معلومات کے خزانے ہیں۔واہ واہ، پڑھ کر مزا آجاتا ہے۔

کافی عرصہ ہوا خالد عرفان کا، یوگی جی کا، آصف کا اور باقی بزرگ دوستوں کی جانب سے چہارسو میں کوئی نامہ نہیں پڑھا۔ خدا کرے سب ٹھیک ہوں۔ہم سب نے ایک دن جانا ہے،اس لیے میری گزارش ہے کہ اگر لکھاریوں میں کوئی پرلوک سدھارے اور آپ اسے چہارسو میں ایک اطلاع کے طور پر چھاپ دیں تو ان کی روح کو چین نصیب ہوگا کہ ان کے دوست اور چاہنے والے ان کو اب بھی یاد رکھتے ہیں اور ہم یہاں بیٹھے ان کی مغفرت کی دعا کر سکتے ہیں۔

تابش خانزادہ (لاس اینجلس)

پیارے گلزار صاحب،السلام علیکم

چہارسو کا قرطاس اعزاز بہ نام نسیم سحر نظر سے گزرا۔ واللہ کیا خوب ہے۔نسیم سحر صاحب ایک بہترین شاعر ہیں۔ میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب ہم 80 اور 90 کی دہائی میں جدہ میں رہتے تھے۔اس وقت میں چوری چھپے شعر کہتا تھا لیکن مشاعروں میں سنانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔لیکن ادبی محفلوں میں شریک ضرور ہوتا تھا اور مشاعروں میں نسیم سحر صاحب کو سنتا تھا۔ان کا دلنشیں کلام بہت بھاتا تھا۔ پھر جب میری پہلی کتاب "جلاوطن کہانیاں" شایع ہوئی تو میں نے انہیں کتاب دی۔ بہت خوش ہوئے اور بہت سراہا۔جدہ کے اردو اخبار میں اس کتاب پر مضمون بھی لکھا۔ بعد میں ان کا مضمون میں نے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کیا۔نسیم بھائی بہت مخلص ، بہت نفیس اور بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔جب انہوں نے "سحاب" نکالا تو مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس میں لکھوں۔انہوں نے "سحاب" میں میرے افسانے اور غزلیں شایع کیں۔کشفی صاحب کی نظر سے رسالہ گزرا اور اس کے بعد جب میں پہلی بار ان کے گھر گیا تو طنزیہ فرمایا، "اچھا! تو آپ میں شاعری کے جراثیم بھی ہیں۔میں تو آپ کو صرف افسانہ نگار سمجھتا تھا"۔میں نے کہا "سر! یہ نسیم سحر صاحب کی مہربانی ہے ورنہ میں شاعر واعر تو بالکل نہیں۔"

نسیم سحر صاحب پر خاص نمبر نکال کر آپ نے اپنے قارئین کو ایک بلند پایہ شاعر سے متعارف کرایا ہے۔ویسے وہ مشہور تو بہت پہلے سے ہیں لیکن مجھے خوشی ہے چہارسو کے ذریعے اور بہت سے لوگ انہیں جان جائیں گے اور جو پہلے سے جانتے تھے ان کی معلومات میں مزید اضافہ ہوگا،''براہ راست'' میں آپ کے تیکھے سوالات کے ذریعے۔ ویسے میں آپ سے سو فی صد متفق ہوں کہ نسیم سحر صاحب کو ادب میں ان کا وہ حق نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں- اللہ پاکستانیوں کو اپنے پیاروں کو پہچاننے کی توفیق دے۔

گلزار صاحب،آپ نے جو کوشش کی،اس کے لیے بہت شکریہ۔

جمیل عثمان (نیویارک)

محترم گلزار صاحب،السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نسیم سحر نمبر نظر سے گزرا،حسبِ سابق انٹرویو دلچسپ ہے۔نسیم سحر خود کو شرارتی بتاتے ہیں اور مشاعرے میں بھی فقرے اچھالتے ہیں۔ان کی شاعری کی شگفتگی کا راز ان کی یہی زندہ دلی ہے۔افسانے سبھی اچھے لگے لیکن اسد محمد خان مجھے کسی قدر مشکل افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔میں انہیں انجوائے نہیں کر پاتا۔اپنے وقت کی معروف اور ہر دل عزیز اداکارہ شیاما کی بابت معلوم ہوا کہ وہ مسلمان تھیں میں انہیں اب تک ہندو سمجھ رہا تھا۔میرے لیے یہ اطلاع خاصی دلچسپ ہے۔پیرزادہ آلِ انوار کا ناول بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔مومن کی غزل کی پیروڈی کم دلچسپ نہیں ہے۔ شاعری بھی خوب کی ہے۔اگر یہ اشعار مصنف نے مستعار لئے ہیں تو پھر کچھ کہنا الفاظ کا ضیاع ہے میرے خیال میں ناول میں فیکٹ اور فکشن گھل مل گئے ہیں۔آگے کیا صورتِ حال بنتی ہے اُس کی بابت اگلی قسط پڑھ کر ہی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

شمویل احمد (پٹنہ)

محترم گلزار جاوید صاحب،تسلیمات۔

چہارسو کے تازہ شمارے میں ناچیز کی کہانی ''برف'' کا اردو ترجمہ نظر سے گزرا۔میرے لیے یہ امر باعثِ اعزاز ہے کہ محترمہ رینو بہل نے فقیر کی کہانی ''برف'' کو لائقِ توجہ جانا اور اُس کا ترجمہ اصل سے بہتر کر کے میرا مان بڑھایا۔ آپ کے لیے بھی ڈھیروں دعائیں کہ آپ نے چہارسو جیسے باوقار جریدے کے قارئین سے ایک ناچیز اور پچھڑی ہوئی زبان کے مصنف کو متعارف کرایا۔اللہ آپ کو اس کا بہت سارا اجر دے۔آمین

سکھ جیت (لدھیانہ)

جاوید بھائی،تسلیمات۔

چہارسو کا تازہ شمارہ دنیا نیٹ پر طلوع ہوا تو نسیم سحر نمبر دیکھ کر خوشی ہوئی۔شمارے میں جناب نسیم سحر کی ذاتی اور تخلیقی حیات کے قریباً ہر گوشے پر گفتگو ہوئی تاہم جس طرح پی ڈی ایف مواد نہایت سرعت سے فقط ایک لمس کی حرکت سے لمبی لمبی چست لگاتا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے اسی طرح محترم نسیم سحر کی شخصیت کے متنوع گوشے پی ڈی ایف کا پی کو ٹچ کرتے ہی ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف اڑان بھر جاتے ہیں،ہاں مگر تا دیر حظ دلاتے رہتے ہیں۔گلزار بھائی نے پوری محنت کے ساتھ یہ نمبر ترتیب دیا ہے۔

اس شمارے کا افسانہ سیکشن پر کشش رہا۔نہ صرف وطن عزیز بلکہ دنیا کے پیشتر ممالک سے آئے افسانوں اور کہانیوں کا مدار، چہارسو میں آرکتا ہے۔۔۔اس بار اسد محمد خان کا ''مئی دادا'' ایک بڑے افسانہ نگار کی اپنی طرز، اور اپنے اسلوب میں ڈھلا افسانہ۔۔۔دلیش دروہی، شدت پسندوں کی کتھا جو غیر محسوس طریقے سے من کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے از خود کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔آنسو کیوں؟ رجائیت کی پرچارک ایک سادہ مگر پر حوصلہ کہانی شیشے کا گھر، اشرف المخلوقات کے طمع دار نفس کا نوحہ لیکن پائیدار اقدار کی فتح،افسانہ بنت میں طویل لیکن موضوع میں چست ہے۔افسانہ جیت میں افسانہ کار پر کار ہے۔ کافی مستعدی سے کہانی کو طوالت سے بچایا اور منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ

اصلاحی انجام پر منتج کیا۔ کچھ کہانیاں نہیں پڑھ سکی، پی ڈی ایف آنکھوں پر بہرحال بار تو ڈالتا ہے۔ شمارے میں منظومات اور دلچسپ تراشے ہمیشہ کی طرح گلزارِ بھائی کی محنت کو خوب خوب اجاگر کر رہے ہیں۔

فرخندہ شمیم (راولپنڈی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اردو ادب کی دنیا میں جناب نسیم سحر صاحب اپنی کثیر الجہات خدمات کے حوالے سے اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے جدہ میں طویل قیام کے دوران مشاعروں اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں جو قابل قدر خدمات انجام دیں ان کی ایک طویل فہرست ہے جو چہارسو کے تازہ شمارہ میں شامل ہے۔ نسیم سحر صاحب کے لیے شمارہ میں گوشہ رکھنا آپ کا قابلِ تحسین ادبی تحفہ ہے جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمارہ میں اچھے افسانے، مضامین اور شاعری شامل ہے۔ ''خاکِ شفا'' پیرزادہ آلِ انوار کی تازہ قسط دلچسپ اور انوکھی معلومات سے بھرپور ہے۔ مختلف اقسام کی خوراک کے نام شہروں، گاؤں کے نام، شاہ صاحب کا استقبال، مشاعرے کی روائیداد، مسدسِ حالی کا تذکرہ اور تحریر کا انداز سب کچھ مل کر ناول کی قسط کو نہایت دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

''کائنات میں جنس کا کردار'' ڈاکٹر فیروز عالم نے ایک نہایت اہم اور دلچسپ موضوع پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے آسمانی وحی کے نزول کی بنیاد پر بیان دیا گیا جو قرآن کی سورۃ نمبر ۳۶ کی آیت نمبر ۳۶ مین درج ہے جس میں کہا گیا کہ ''دنیا میں ہر چیز جوڑوں (Pairs) کی ''ورت میں پیدا کی گئی ہے خواہ وہ انسان اور جانور ہوں۔ زمین سے اُگنے والے پودے وغیرہ ہوں نیز وہ بے شمار اجسام جنہیں ہم نہیں جانتے سب کے سب جوڑوں کی صورت میں پیدا کیے گئے ہیں۔'' غور کیجیے اسی الہامی بیان کو جو کہ پیغمبر اسلام نے چودہ سو سال قبل دیا تھا ۱۹۳۳ء میں نوبل انعام یافتہ سائنسدان نے اپنی تحقیق میں ثابت کیا جو ''Direcs Law of Pairs'' کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اب کسی اور الہامی کتاب میں ذکر موجود نہیں ہے جیسا کہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔

تابش خانزادہ کی کہانی ''جیت'' حسبِ معمول مختصر، دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ پیغام یہ ہے کہ عام طور پر بیشتر مقدمات میں جیت صرف وکلاء کی اور ہار فریقین کی ہوتی ہے اس لیے اگر متنازعہ معاملات باہم صلح صفائی سے نمٹا لیے جائیں تو یہی عقلمندی کی بات ہوتی ہے۔ ''آدھی موت کا جشن'' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی بطور ہیڈ ماسٹر مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو گئے جس کے باعث ان کی تنخواہ تقریباً کم ہو کر نصف رہ گئی دیگر مراعات بھی ختم ہو گئیں لیکن عزیز و اقارب اور دوست احباب انہیں دعوت دینے مجبور کر دیتے ہیں کہ اتنی شاندار سروس کی کامیاب تکمیل کے موقع پر ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا جائے جو انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تیس ہزار پر دعوت ہال بُک کیا اور دیگر اخراجات کرنے کے بعد جان چھڑائی۔ ہمارے ہاں معاشرہ میں بعض غلط روایات اب تک جاری ہیں جن کی حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے۔

شاعری میں شان الحق حقی، ناصر علی سید، اشرف جاوید، نوید ظفر، آفتاب مضطر، بھان خیال، فیض منصور فیض کا کلام متاثر کن ہے۔ میری غزل کے چوتھے شعر میں کتابت کی وجہ سے مفہوم بدل گیا ہے اصل شعر یوں ہے:

زندگی اور نعمتیں اتنی
عطا ہے اُس کی جسے فنا ہی نہیں

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

نیا شمارہ حسبِ معمول اپنے اندر دلچسپ اور معلوماتی مضامین لے کر سکرین پر جلوہ گر ہوا۔ نسیم سحر صاحب کی شخصیت سے آپ کی سوالات کے ذریعہ ہم کو بہت آگہی ہوئی۔ قرطاسِ اعزاز کے مضامین نسیم سحر صاحب کے حوالے سے زیادہ نہیں پڑھ سکی۔ ہاں ان کا مضمون ''مردانہ ڈبے کی زنانہ سواری'' پڑھا بہت ہی شگفتہ اندازِ بیان ہے جو گلنار آفرین کی خصوصیات کو اجاگر کر گیا۔

اس دفعہ خاکِ شفا کا ذکر سب سے پہلے ہوگا کیونکہ ناول نگار نے اس دفعہ تو کمال کر دیا۔ انتہائی حیرانی ہوئی کہ مصنف نے بہت اچھے طریقے سے انواع و اقسام کے میواتی کھانے اس طرح تفصیل سے بیان کیے یوں لگا آپ اس وقت یہ کھانے نہ صرف کھا رہے ہیں بلکہ باورچی خانے میں موجود ہیں۔ یہ وہ کھانے ہیں جو آج کل سنائی بھی نہیں دیئے جاتے اس لیے کیسے بنائے جاتے تھے اگر آج کا مصنف یہ لکھے تو قابل تعریف ہے۔

اب آیئے مشاعرے کی جانب، اس کو پڑھنے میں جتنا بھی وقت لگایا جائے کم ہے۔ جو منظر پیش کیا گیا لگ رہا تھا وہیں بیٹھے ہیں اور باقاعدہ الطاف حسین حالی اور اس دور کے شعراء تشریف لائے ہیں اور پنڈال میں ہم بھی ہیں اور پھر ہر شاعر کا کلام یوں پڑھا جیسے کہ مشاعرے میں بیٹھ کر سن رہے ہوں خاص طور سے ظہیر دہلوی کا کلام الطاف حسین حالی کی باتیں قابلِ تعریف ہیں۔ مصنف کی معلومات اور اس کو پیش کرنے کا انداز میواتی زبان اور اس میں بیان کیا گیا کلام بہت مرعوب کر گیا۔ میری جانب سے مبارکباد۔

جو افسانے اب تک پڑھے ہیں وہ ہیں ''شیشے کا گھر'' بہت اچھا افسانہ دیپک کنول نے لکھا ہے۔ ''آنسو کیوں'' وحشی سعید، تابش خانزادہ کا ''جیت'' ارم نعیم کا ''کُم کُم'' سب افسانے اچھے اور معیاری ہیں۔ رینو بہل کی ترجمہ کی ہوئی کہانی ''برف'' ایک مختلف کہانی جس کا ادراک معاشرے کو ہونا چاہیے۔ جمیل عثمان کا ہجرتوں کا عذاب، سچائی پر مبنی ان کے بزرگوں کی پر درد کہانی۔

اس دفعہ غزل، نظم، نعت نہیں پڑھ سکی اس لیے معذرت۔ ''ایک صدی کا قصہ'' حسبِ معمول دلچسپ رہا۔ ابھی بہت کچھ پڑھنے کو باقی ہے جلد ختم کروں گی۔ خاص طور سے نسیم سحر کے بارے میں جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ ضرور پڑھوں گی۔

رعنا کوثر (نیویارک)

..... خاک ساخاکی .....

زندگی خالقِ حقیقی کی امانت ہے۔قدرت کی طرف سے سب سے حسین تحفہ بھی۔اور جب ایک بندہ اسے پوری محبت سے ایک عبادت کی طرح گزار کر خالقِ حقیقی کے سپرد کرتا ہے تو بندہ اپنے رب سے راضی، اور رب اس سے راضی۔آواز آتی ہے میرے بندے میری جنت میں داخل ہو جا۔بشیر آرائیں کی زندگی بھی ایک مسلسل جدوجہد ہے۔جس میں خوفِ خدا بھی ہے اور خدا کی مخلوق سے دلی محبت بھی، اپنے اردگرد کا درد بھی۔وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو نواز رہے ہیں۔رحیم وکریم انہیں نواز رہا ہے۔ان کی منزلیں آسان کر رہا ہے۔وہ کچی گلیاں نہیں بھولے تو کچی گلیاں بھی انہیں نہیں بھولی ہیں۔خودنوشت صدیوں سے قارئین میں سب سے مقبول صنف رہی ہے۔اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔قدم قدم پر مشکلیں، مقابلے سے ہمت اور تدبر، ہر گام مصائب، سامنے تحمل، برداشت اور ادراک۔جس محبت اور خلوص سے جیون گزارا، اسی لگن سے کہانی بیان کی گئی ہے۔جتنی سادہ زندگی، اتنی ہی سادہ طرزِ نگارش۔پڑھنے والا کتنا پتھر دل ہو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔پاکستان کی یہ سات دہائیاں جتنی بے یقینیوں اور بے چینیوں میں گزری ہیں وہ سب اس آپ بیتی میں سطر سطر نقش ہیں، لیکن وہ عملاً مایوسی میں نہیں ڈھلتی۔اور بیان کرنے والا بھی ناامیدی کی طرف لے کر نہیں جاتا۔''خاک ساخاکی'' اردو ادب میں یقیناً ایک خوش گوار اضافہ ہوگا۔

.....محمود شام

اشاعت:۲۰۲۲ء، قیمت:۔/۱۲۰۰روپے، دستیابی:اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی

..... آوازوں کا شور .....

شہلا نقوی کی اپروچ مختلف اور تازگی بھری ہے۔انہوں نے عورت کو ہر زاویے سے دیکھا اور پرکھا ہے۔اس مجموعے میں عورتوں کا ایک مجمع ہے جس میں وہ ہر کردار کو اس کے انفرادی ماحول اور تجربوں کے تناظر میں رکھ کر مشاہدہ کرتی نظر آتی ہیں۔ان کا یہ مشاہدہ بہت سے سوال کھڑے کرتا ہے جو ادب کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔کسی مصلح کی طرح وہ جواب نہیں دیتی ہیں بس فکر کو مہمیز دینے کا کام کرتی ہیں۔علاوہ ازیں اس مجموعے میں سانس لیتی زندہ عورتیں محض روتی دھوتی اور زخم چاٹتی نظر نہیں آتیں وہ اپنے اپنے طور پر اس دنیا سے نبرد آزما بھی ہیں اور اس دنیا کے سکھائے ہوئے طریقوں سے بھی۔''برنس'' کی خالہ، ''فیروزہ'' کی فیروزہ اور ''شناخت کی چوری'' کی دیبا جو زندگی کرنے کا ڈھب خود تلاش کر لیتی ہیں۔کچھ کہانیاں کرداروں کا عمدہ نفسیاتی تجزیہ کرتی ہیں۔''آسیب کی کوٹھی'' کی ذکیہ خالہ جس طرح خاموشی سے ساری زندگی زہر پیتی ہیں اور ایک بارگی ہی اسے اگلنا شروع کر دیتی ہیں۔یہ بیانیہ قابلِ داد ہے اور فوری طور پر قاری کو ذکیہ خالہ سے جوڑ دیتا ہے۔مصنفہ نے کہیں بھی ہم دردی جتائے بغیر جس دیانتداری سے یہ کردار خلق کیا ہے وہ قاری میں پوری طرح منتقل ہو جاتی ہے۔غلیظ گالیاں بکنے والی اس عورت پر نہ غصہ آتا ہے نہ اس سے نفرت ہوتی ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ شہلا نقوی کتنے عرصے سے اپنی جڑوں سے دور ہیں لیکن ان کی سلیس اور بامحاورہ زبان میں اپنی مٹی کی خوش بو ہے، ادبی چاشنی کے ساتھ بڑا گھریلو پن ہے۔سچ کہوں تو کئی بھولے بسرے محاورے مجھے یاد آ گئے اور بڑا لطف آیا۔مثال کے طور پر چیونٹیوں بھرا کباب اور پھلکا سی ناک۔۔۔

..... ذکیہ مشہدی

اشاعت:۲۰۲۲ء، قیمت:۔/۶۰۰روپے، دستیابی:اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی

..... شفیع مشہدی کے افسانے .....

شفیع مشہدی کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔جس زمانے میں انہوں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس عہد میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی حکمرانی تھی۔مگر آہستہ آہستہ اردو کے ادبی افق پر جدیدیت سے متاثر افسانہ نگار بھی اپنے جلوے بکھیر رہے تھے۔شفیع مشہدی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کے غالب رویّوں سے خود کو محفوظ رکھا اور سماجی مسائل و کرب کو اپنے مخصوص اسلوب میں افسانے کے قالب میں ڈھالتے رہے۔دیکھتے ہی دیکھتے اردو افسانے میں ان کی اہم شناخت قائم ہوگئی۔شفیع مشہدی کے افسانے کی زبان میں بڑی قوت ہے جو قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ان کے افسانے ان کے اردگرد کے واقعات اور کرداروں پر محیط ہیں جن میں مقامی زبان، بولی ٹھولی کے اثرات نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا کمال یہ ہے کہ وہ نت نئے موضوعات پر گہرے شغف، انہماک، دل سوزی اور جگر کاوی کے ساتھ ہمیشہ بڑا اور اچھا علمی کام کرتے ہیں۔یہ کتاب ''شفیع مشہدی کے افسانے'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔میں دونوں حضرات افسانہ نگار شفیع مشہدی اور محقق و نقاد ڈاکٹر ہمایوں اشرف جو اس کتاب کے مرتب ہیں انہیں صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی آمد کے بعد شفیع مشہدی کے افسانوں کی افہام و تفہیم کا ایک نیا سلسلہ قائم ہوگا۔

..... پروفیسر شہزاد انجم

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
फूलों के खिलने का मौसम
آوازوں کا شور
پل صراط کے بعد
ILM-O-IRFAN PUBLISHERS
Silence
اجازت
تلک الایام